سول سوسائٹی

ڈاکٹر حمید مولانا

بسم الله الرحمن الرحيم

سول سوسائٹی

ڈاکٹر حمید مولانا

نام کتاب:.....سول سوسائٹی
مصنف:.....ڈاکٹر حمید مولانا
مترجم:.....ادریس احمد علوی
تصحیح.....سید عقیل افضل رضوی
نظر ثانی:.....عون علی جاڑوی
ناشر:.....اسلامی فکر و ثقافت ریسرچ یونیورسٹی پبلیکیشنز
مطبع:.....علوی پبلیکیشنز
ایڈیشن:.....پہلا
سال اشاعت:.....۲۰۱۰ء
تعداد:.....۱۰۰۰
ISBN:.....

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

اسلامی فکر و ثقافت ریسرچ یونیورسٹی
بین الاقوامی اداراہ برائے ترجمہ و طباعت۔
پتہ: مکان نمبر ۲، گلی نمبر ۲، ریسرچ یونیورسٹی، احمد قصیر روڈ، تہران، ایران
ٹیلی فون: 00982188531249-88734823
فیکس: 00982188764792
سائٹ: Www.Islamic.Iict.Org
Mail: Iict.Publication@Gmail.Com

فہرست

سخن 7

تعارف 8

پیش لفظ 12

دیباچہ 14

پہلا باب: سول سوسائٹی 22

دوسرا باب: مغرب مطلوبہ سوسائٹی کی تلاش میں 42

تیسرا باب: سول سوسائٹی کا مفہوم 68

چوتھا باب: سول سوسائٹی اور ڈیموکریسی 100

پانچواں باب: سول سوسائٹی اور عالمگیریت 124

چھٹا باب: سول سوسائٹی تجربہ و عمل کے میدان میں 160

کتابیات 210

سخن

جدید فکری بنیادوں پر استوار "اسلامی فکر و ثقافت ریسرچ یونیورسٹی" کا سنگ بنیاد اور کام کا آغاز ۱۴۲۳ھ۔ ش بمطابق ۱۹۹۴ء میں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ "ریسرچ یونیورسٹی کی ضرورت کیونکر محسوس کی گئی؟" اس سلسلے میں ہم قارئین کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ اسلامی دانشوروں کو تین اہم گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: روایتی یا قدامت پرست، جدت پسند اور روشن خیال۔

قدامت پرست دانشور، ماڈرن طرز فکر اور جدید مفاہیم و نظریات کے مقابلے میں روایتی طرز فکر کو اہمیت دیتے ہیں اور روایتی اصول میں ہر طرح کی دخل اندازی سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس طرز فکر میں روایتی اصول کے تحفظ کی خاطر ماڈرن طرز فکر اور جدیدیت کو یکسر مسترد کر دیا جاتا ہے اور عصری تقاضوں کی روشنی میں دینی متون کی نئی تفسیر، غور و خوض اور تجزیہ کرنے پر سخت پابندی ہے۔

جدت پسند اسلامی دانشور، روایتی و قدامت پرست دانشوروں کے بالکل برعکس ہیں؛ ماڈرن طرز فکر اور جدید نظریات کو اہمیت دیتے ہیں اور روایتی اور قدامت پسندانہ افکار کو ماڈرن طرز فکر اور جدیدیت کے ڈھانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جس طرح روایتی طرز فکر کا نتیجہ قدامت پسندی، بنیاد پرستی، علیحدگی اور رجعت پسندی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے، اسی طرح جدت پسندی کے نتیجہ میں تمام معاشرتی میدانوں میں روایتی افکار و اقدار نابود اور ہیومنزم (مکتب محوریت انسان) اور سیکولرزم (دین کی سیاست سے لاتعلّقی) کا بول بالا ہوتا ہے۔

جدید دینی روشن خیالی کے حامل دانشور روایتی اور ماڈرن طرز فکر کے باہمی ٹکراؤ کی صورت میں روایتی اصول کو اہمیت دیتے ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ہی ماڈرن طرز فکر کے حامل مفاہیم کو روایتی طرز فکر کی کسوٹی پہ پرکھ کر نئے انداز اور جدید تفکر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس تیسری طرز فکر کے نتیجہ میں آزادی، ڈیموکریسی اور معاشرتی عدالت جیسے جدید نظریات کے مقابلے میں حریت، مساوات اور اسلامی جمہوریت جیسی اصطلاحات کو جنم ملتا ہے۔

اس تفکر کے حامل افراد نے عقل کی روشنی میں حقیقت کی شناخت، حقائق تک پہنچنے اور اقدار (یعنی کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے) کو بیان کرنے کے لئے اسلامی طرز فکر کو منتخب کیا ہے اور اسی کی روشنی

میں حکومتی، ثقافتی، معیشتی، سیاسی اور معاشرتی شعبوں میں نئے نظریات پیش کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں "اسلامی فکر وثقافت ریسرچ یونیورسٹی" کی جانب سے بین الاقوامی سطح پر اب تک آٹھ سو سے زیادہ کتب و تحقیقی مضامین شائع کئے جا چکے ہیں۔ ان کتب اور مضامین میں مغربی طرز فکر پر مشتمل ہیومنزم (مکتب محوریت انسان) اور سیکولرزم (دین کی سیاست سے لاتعلّقی) کے ساتھ ساتھ، روایتی اور قدامت پسندانہ طرز فکر پر بھی کڑی نکتہ چینی کی گئی ہے اور اسلامی عقلانیت اور متفقہ منطقی دلائل کے دائرے میں رہتے ہوئے روایتی افکار وآداب کی روشنی میں جدید دینی تفکر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

والسلام

علی اکبر رشاد

اسلامی فکر و ثقافت ریسرچ یونیورسٹی

تعارف

اسلامی دنیا میں انمول علمی خدمات انجام دینے والی اسلامی فکر و ثقافت ریسرچ یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنے والی عظیم شخصیت حجۃ الاسلام والمسلمین علی اکبر رشاد نے ۱۳۴۶ھ ۔ ش بمطابق 1967ء میں تہران کے دینی مدرسہ میں دینی تعلیم کا آغاز کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۳۴۹ھ ۔ ش بمطابق 1970ء قم تشریف لائے اور آیت اللہ حسن تہرانی، آیت اللہ صلواتی اراکی، آیت اللہ اشتہاردی، آیت اللہ حرم پناہی قمی، آیت اللہ اعتمادی تبریزی، آیت اللہ بنی فضل تبریزی، آیت اللہ یوسف صانعی، آیت اللہ سید علی محقق داماد اور آیت اللہ سبحانی تبریزی جیسے فاضل اساتذہ سے فقہ و اصول کے مختلف درجات میں کسب فیض کیا۔ اسلامی فلسفہ کی تعلیم کے لئے قم اور تہران میں استاد احمد بہشتی، محمدی گیلانی اور شہید مطہری جیسے اساتید کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ تہران اور قم ہی میں بیس سال سے زائد عرصہ تک آیت اللہ حسین وحید خراسانی، آیت اللہ علی مشکینی، آیت اللہ حسین علی منتظری، آیت اللہ سید علی خامنہ ای اور آیت اللہ مجتبی تہرانی کے فقہ واصول کے اعلی دروس میں حاضر ہوتے رہے۔

استاد رشاد گذشتہ تین عشروں سے حوزہ علمیہ تہران میں فقہ واصول اور فلسفہ و عرفان کی تدریس کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں میں فلسفہ دین، علوم قرآن اور روش فہم دین پڑھا رہے ہیں۔ آپ گذشتہ دس سال سے فقہ واصول کے درس خارج کی تعلیم دینے کا فریضہ بھی ادا کر رہے ہیں۔

حجۃ الاسلام علی اکبر رشاد ثقافتی انقلاب کی سپریم کونسل، مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی اور "مکالمہ ادیان کی پالیسی ساز کمیٹی کے رکن ہونے کے علاوہ "اسلامی فکر و ثقافت ریسرچ یونیورسٹی" کے بانی اور سرپرست بھی ہیں۔

"اسلامی فکر و ثقافت ریسرچ یونیورسٹی" کا شمار ایران کے غیر سرکاری اور عظیم تحقیقاتی و علمی مراکز میں ہوتا ہے۔ فلسفہ، معرفت شناسی (اپیسٹمولوجی) 1، عرفان، قرآن کریم، کلام و دین، منطق فہم دین، اخلاق، فقہ، قانون، سیاست، اقتصاد، اسلامی منیجمنٹ، مغربی مطالعات، تاریخ و تمدن، ثقافتی مطالعات، اسلامی انقلاب اور ادبیات جیسے موضوعات پر تحقیقات میں مصروف عمل یہ ریسرچ یونیورسٹی چار ذیلی "ریسرچ کالجز" (فیکلٹیز) اور بیس "بورڈ آف ایکسپرٹس" پر مشتمل ہے۔

ہم عصر فکری مباحث اور مذکورہ بالا موضوعات کا تنقیدی جائزہ لینے اور نئے افق روشن کرنے کے لئے ۱۳۷۳ھ ۔ ش بمطابق ۱۹۹۴ء میں اس تحقیقاتی یونیورسٹی کا افتتاح کیا گیا۔ یونیورسٹی کی جانب سے محققین کے آٹھ سو سے زیادہ علمی شاہکار شائع کئے جا چکے ہیں اور اس وقت یونیورسٹی کی جانب سے فلسفہ دین کے بارے میں (علمی اور تحقیقاتی میدان میں انعام یافتہ) اسپیشلائزڈ جریدہ "قبسات"، معرفت شناسی (اپیسٹمولوجی) کے میدان میں اسپیشلائزڈ جریدہ "ذہن"، اسلامی اقتصادیات کے موضوع پر (علمی اور تحقیقاتی میدان میں انعام یافتہ) سہ ماہی "اقتصاد اسلامی"، اسلامی قوانین کے سلسلے میں (علمی اور تحقیقاتی میدان میں انعام یافتہ) جریدہ "حقوق اسلامی"، فکری اور تنقیدی میدان میں جریدہ "کتاب نقد"، معاصر ایران کی تاریخ اور سیاسی سوشیالوجی کی شناخت کے لئے "ماہنامہ زمانہ"، فلسفہ اور الہیات کی گتھیاں سلجھانے کے لئے انگریزی زبان میں سہ ماہی بین الاقوامی رسالہ "حکمت" اور اسلام کے معاشرتی نظام پر روشنی ڈالنے کے لئے عربی زبان میں سہ ماہی جریدہ "الحکمۃ" شائع کیے جا رہے ہیں۔

گذشتہ دس سال میں ریسرچ یونیورسٹی کی طرف سے حجت الاسلام والمسلمین علی اکبر رشاد کی زیر سرپرستی مندرجہ ذیل چار انسائیکلوپیڈیا تحریر کئے جا چکے ہیں:

۱۔ دانشنامہ امام علی علیہ السلام (۱۳ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے)

۲۔ دانشنامہ قرآن شناسی (۳۵ جلدوں میں مکمل ہو چکا ہے)

Epistemology 1

۳۔ سیرت نبوی (۱۵ جلدوں پر مشتمل یہ انسائیکلوپیڈیا تدوین کے مراحل میں ہے۔)
۴۔ فرہنگ فاطمی (۶ جلدوں میں مکمل ہو چکا ہے)

جناب علی اکبر رشاد حوزہ علمیہ امام رضا کے بانی اور سرپرست بھی ہیں جہاں تمام حوزوی دروس کی تعلیم دی جاتی ہے۔

مذکورہ یونیورسٹی میں اسلامی نظام، ثقافتی و معاشرتی مطالعات، انسائیکلوپیڈیا اور فلسفہ و دین فیکلٹیز کے علاوہ علمی روابط کو وسعت دینے کے لئے ایک بین الاقوامی تحقیقاتی ادارہ تشکیل دیا جارہا ہے۔

یاد رہے کہ اس وقت تک دو سو سے زائد علمی شاہکار، دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ و طباعت کے لئے منظور کئے جاچکے ہیں۔ اس کے علاوہ عالمی مسائل کے بارے میں بین الاقوامی شخصیات کے نظریات کا تنقیدی جائزہ لینے اور جدید نظریات کو منظرعام پر لانے کے لئے مزید کام انجام پا رہے ہیں۔ تحقیقاتی ادارے کے زیر نظر متعدد مراکز اور سنٹرز، نوجوانوں اور اسٹوڈنٹس کے لئے خصوصی علمی شاہکار تخلیق کرنے میں مصروف عمل ہیں۔

پیش لفظ

سول سوسائٹی کی پیدائش اور اس اصطلاح کو سیاسی موضوعات میں شامل ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔۔۔ لیکن ایران میں سول سوسائٹی کی ماہیت اور کارکردگی ۱۳۷۶ شمسی بمطابق ۱۹۹۷ء سے ایران کے سیاسی مسائل سے متاثر ہو کر میڈیا اور فکری محافل میں، ایک انتہائی اہم اور گرما گرم بحث کی شکل اختیار کر چکی ہے۔۔۔ اور حالیہ کچھ سالوں میں اخبارات و جرائد کا اچھے خاصے صفحات اسی موضوع سے مختص رہا ہے۔ لیکن گروہی رقابتیں، سول سوسائٹی کے مفہوم اور اس کی کارکردگی کے بارے میں ایک متفقہ نقطہ نظر کے حصول میں مانع بنی رہی ہیں۔ اس لیے دعوے کیساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مغرب کے علاوہ ایران میں بھی سول سوسائٹی کے بارے میں ایک مشترکہ سوچ موجود نہیں ہے۔

اس موضوع کے بارے میں ایران میں دو بنیادی نظریات پائے جاتے ہیں:

۱۔ مدینۃ النبی ﷺ کے سماج کی طرح کا معاشرہ یا دوسرے لفظوں میں دینی سول سوسائٹی۔۔۔

۲۔ سول سوسائٹی مکمل طور پر مغربی موضوع ہے جس کے کچھ خاص معانی ہیں یعنی مغربی سیاست اور افکار کی پذیرائی۔ سول سوسائٹی اور دین کے درمیاں پائی جانے والی نسبت کے بارے میں مختلف نظریات کے بارے میں فیصلہ کرنے سے قطع نظر، ضرورت اس امر کی ہے کہ مغرب میں سول سوسائٹی کے تجربات اور اس کی نظریاتی اور عملی خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک نئے زاویے سے اس کے بارے میں تجزیہ کیا جائے اور سول سوسائٹی سے وابستہ امیدوں کے لحاظ سے اس کی کامیابی اور ناکامی کا جائزہ لیا جائے۔۔۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے مغربی سیاست، ثقافت اور افکار کی شناخت، تجزیے اور تعارف کے لیے ڈاکٹر حمید مولانا (جو اس موضوع میں کافی مہارت رکھتے ہیں) سے درخواست کی، جسے انھوں نے قبولیت کا شرف عطا فرمایا۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب مغربی سول سوسائٹی بالخصوص امریکی معاشرے کی حقیقی شناخت میں ایک اہم قدم ہوگا۔۔۔ ہم ڈاکٹر مولانا کے انتہائی شکر گزار ہیں اور معزز قارئین کی آراء کے بھی شدت سے منتظر رہیں گے۔[1]

1۔ معاشرتی مطالعات و ثقافت فیکلٹی، مطالعات مغرب گروپ، اسلامی فکر و ثقافت ریسرچ یونیورسٹی۔

ہم مرکز تحقیقات برائے اسلامی افکار و ثقافت تہران کے مشکور ہیں کہ جن کے تعاون سے ہم اسلامی اور مغربی سیاست کے معرکۃ الآراء موضوع سے متعلق ایک جامع کتاب اردو زبان کے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

مسئول
شعبہ ترجمہ و تحقیق
نور الہدیٰ ٹرسٹ، اسلام آباد

دیباچہ

سول سوسائٹی کی تعریف بیان کرنے اوراس کی اصلی تصویر پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مندرجہ ذیل سوالات کے مناسب جواب حاصل کریں:

۱۔ سول سوسائٹی کی بحث آجکل کیوں عام ہو چکی ہے؟

۲۔ سول سوسائٹی کی ترویج کی خاطر اس ساری بھاگ دوڑ کا کیا مقصد ہے؟

مغرب میں سول سوسائٹی کے موضوع کی ایک لمبی تاریخ ہے اور اس کے بارے میں لاک، ڈوٹوکویل، ہیگل، مارکس اور گرامشی کی تالیفات و تصنیفات میں بحث ہو چکی ہے لیکن سول سوسائٹی چونکہ ایک سیاسی نظریہ ہے، اس کے باوجود ۱۹۸۰ کی دہائی کے آواخر تک امریکہ اور یورپ کی سیاسی پارٹیوں، میڈیا اور علمی محافل میں توجہ کا مرکز نہیں بنا۔۔ ان دو بر اعظموں میں اس سے پہلے سول سوسائٹی کے بارے میں شائع ہونے والے مقالات اور کتب کی تعداد کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ مغربی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں "سول سوسائٹی" سے متعلق کوئی بھی مضمون موجود نہیں تھا۔۔۔البتہ حکومت، ڈیموکریسی اور ترقی سے مربوط دروس اور نشستوں میں اس موضوع کے بارے میں بحث کی جاتی رہی ہے۔۔ مغربی یورپ میں "ماڈرن سوسائٹی"، "ایڈوانس سوسائٹی"، "انڈسٹریل ڈیموکریٹک سوسائٹی"، "سوشل ڈیموکریٹک سوسائٹی" اور "سوسائٹی اینڈ سوشل گورنمنٹ" کے موضوعات پر خاصی تاکید کی جاتی رہی ہے اور امریکہ میں "ڈیموکریسی"، "لیبرل ورلڈ"، "اوپن سوسائٹی"، پولیٹکل ڈویلپمنٹ"اور "ماڈرن سوسائٹی" کے عناوین کی ترویج کی جاتی رہی ہے۔

آج ہم کچھ اس طرح کے سوالات سے دوچار ہیں کہ سول سوسائٹی کے بنیادی تاریخی، معاشرتی اور سیاسی اسباب کون سے ہیں؟ سول سوسائٹی کے بارے میں مغربی مفکرین کے نظریات کیا ہیں اور اس کے ادارے کون کون سے ہیں؟ سول سوسائٹی کس طرح سے ڈیموکریسی کی پالیسیوں اور منصوبوں کے ساتھ

آمیختہ ہے؟ کیا عالمی سطح پر سول سوسائٹی کا امکان ہے؟ کیا مطلوبہ سول سوسائٹی انسان کی وہی آئیڈیل سوسائٹی ہی ہے؟

۱۹۵۰ء سے لیکر آج تک میں نے پچھلے چالیس سال سے مغرب، یورپ اور امریکہ میں سول سوسائٹی کی گمنامی سے لے کر اس حالیہ ظہور تک کے سفر کا مطالعہ کیا ہے۔۔۔پہلے ایک طالب علم کی حیثیت سے، پھر ایک استاد کی حیثیت سے اوراب ایک طویل عرصے سے معاشرتی علوم کے ایک شعبہ کی ورلڈ اکیڈمی اور انجمن کے صدر ہونے کی حیثیت سے اس کا مطالعہ کیا ہے۔اس کتاب میں قارئین مغربی سول سوسائٹی کی نظریاتی اور عملی خصوصیات کو مد نظر میں رکھتے ہوئے اس کے تنقیدی جائزے اور عہد قدیم اور عہد حاضر میں اسکے ادارتی پہلوؤں میں تال میل کے فقدان کاملاحظہ کر سکیں گے۔

اسلامی ممالک کے اندر سول سوسائٹی اور سول سوسائٹی کا اسلامی سوسائٹی کے ساتھ تقابلی جائزہ ایک ایسا موضوع ہے جسے جداگانہ طور پر مطالعہ کیا جانا چاہیے۔۔اس لیے اس کتاب میں بھی اس کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے۔۔

میر اطالب علمی کا دور تھا جب میں نے ۱۹۵۸۔۱۹۵۹ء میں شکاگو کی نورلیس ویسٹرن یونیورسٹی کے منعقدہ "عمومی عقائد" کے سیمینار میں فرانس کے ماہر عمرانیات اور مولّف ایلیکس ڈوٹوکویل کی کتاب "امریکہ میں جمہوریت "(۱) کا مطالعہ کیا۔۔اس سیمینار میں شرکت کرنے والے افراد کے لیے ضروری تھا کہ وہ تاریخ، سیاست یا عمرانیات کی کسی ایک کتاب کا انتخاب کریں اور اس کتاب کا مطالعہ اور تحقیق کرنے کے بعد اسے کلاس میں پیش کریں۔۔ میں نے کتاب "امریکہ میں جمہوریت " کا انتخاب کیا۔۔اس سیمینار کے استاد اس موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف اور ایک برجستہ ماہر عمرانیات تھے۔۔ان کی خواہش تھی کہ وہ ڈوٹوکویل کی کتاب "امریکہ اور اس کی جمہوریت " کے بارے میں غیر ملکی افراد کی فکر و نظر کی جہت سے تنقیدی جائزہ لیں۔۔ایک ٹرم تک جاری اس سیمینار میں جمہوریت، حکومت، رائے عامہ، شہری و غیر سرکاری ادارے، ریاستی حکومت، (سیاسی) پارٹیاں، انتخابات، اخبارات اور عوام کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں شرکت جیسے موضوعات زیر بحث رہے۔۔ لیکن کبھی "سول سوسائٹی " کے عنوان سے گفتگو کو اھمیت نہ دی گئی۔ امریکہ کی جمہوریت کے بارے میں ڈوٹوکویل کی گفتگو اور نظریات نے، ۲۸ مرداد ۱۳۳۲ شمسی، کو امریکہ کی ایران کے اندر مداخلت اور عسکری حکومت "MILITIRY COUP" کی یاد دلادی، جسکا میں نے پانچ

سال قبل بہت نزدیک سے مشاہدہ کیا تھا۔۔ سوسائٹی اور بالخصوص مقامی سطح پر عوام کی غیر سرکاری سرگرمیوں کے بارے میں اس فرانسیسی مصنف کی تفصیلی گفتگو سے میں ایرانی عوام کی زندگی اور ان کی سرگرمیوں کی یاد میں چلا گیا، جو مساجد، بازار، گلی محلے، انجمن، امام بارگاہ، اور عمومی تحریک میں "MOBILIZATION" (جس میں خود میں بھی شریک رہا تھا) دنیا نے دیکھی۔۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اس سمینار میں ڈوٹو کویل کی کتاب کے تجزیہ کا اختتام اس جملے کا ساتھ کیا تھا: "ایران میں ہماری سوسائٹی جمہوری نہیں بلکہ اسلامی سوسائٹی ہے"۔

۱۹۶۳ء میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد مجھے مطالعہ اور سروے کے لیے جرمنی، فرانس، اور انگلینڈ اور یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں اور ثقافتی اداروں کی طرف سے دعوت ملی۔۔ ان ممالک میں اساتذہ، دانشور حضرات، حکومتی افراد غرض کہ کسی کے ساتھ گفتگو میں کہیں بھی سول سوسائٹی کا موضوع سامنے نہیں آیا۔ ان دہائیوں میں ہارورڈ یونیورسٹی سے لیکر شکاگو اور کیلیفورنیا تک امریکی یونیورسٹیوں، کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے ہائیڈلبرگ و پیرس یونیورسٹی تک کی یورپی یونیورسٹیوں میں کہیں "سول سوسائٹی" نامی کسی مضمون کی تدریس نہیں ہوئی تھی۔۔ "سرد جنگ" کے نام سے معروف عشروں میں (جب مغرب و مشرق (امریکہ و سوویت یونین) کی دو طاقتوں کی حکمفرمائی تھی، اور (کمیونزم اور کیپٹلزم) کے دو کیمپوں میں دنیا کی آیڈیالوجیکل اور غیر متناسب تقسیم ہو چکی تھی۔ اس دوران بھی کبھی جان لاک، تھامس ہابز، جارج، ھیگل، کارل مارکس، ایلیکس ڈوٹو کویل اور انٹینیو گرامشی کے آثار سے مربوط، سول سوسائٹی کے مطالعہ اور گفتگو کو آج جیسی توجہ اور اہمیت نہیں ملی۔۔ اس وقت مغربی سیاسی اور سماجی افکار کو حکومت، ڈیموکریسی واستبداد اور افراد کے کردار جیسی تھیوریوں میں اولویت حاصل تھی۔۔ افراد کے حقوق، مالکیت، اور حکومت کے بارے میں لاک کا رسالہ پڑھا گیا۔۔ ھابز کی کتب نے صاحبان قدرت۔۔۔۔ کو نمایاں کیا۔ ڈوٹو کویل کی کتاب "امریکہ میں جمہوریت" امریکیوں کے لیے جمہوریت کی نصابی کتاب بن چکی تھی۔

کارل مارکس کی دولت اور مینفسٹ، کمیونسٹ سوسائٹی کے لیے نمونہ تھا۔۔ مارکس کی جدیدیت کے مقابلے میں اور اسٹالن کے خلاف گرامشی اور دوسرے افراد کے آثار استعمال ہو چکے تھے۔۔ یورپ اور امریکہ کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں "سول سوسائٹی" کا لفظ رائج نہیں تھا، اور اس وقت کے برجستہ

افراد اس قسم کے موضوع کو مفکرین کی فلسفی اور تاریخی تحقیقات سے جوڑتے تھے۔۔ یورپ اور امریکہ کی عوام بھی "سول سوسائٹی" سے ناآشنا تھی۔۔

۱۹۶۴۔۱۹۶۵ء کے تعلیمی سال میں جس وقت میں نے بطور استاد، امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھانا شروع کیا اس وقت ملک کے سیاہ فام باشندوں کی "شہری حقوق" کی تحریک پنپ رہی تھی اور "یونیورسٹی انقلاب" کے نام سے معروف، اساتذہ اور طلباء کے درمیان اعتراضات شروع ہو چکے تھے۔ در حقیقت ۱۹۶۰ء کا عشرہ مغرب میں ایک تلاطم خیز دور تھا اس دہائی کے آغاز میں دیوار برلن باقاعدہ طور پر تعمیر ہو چکی تھی اور اسکے کچھ عرصے بعد امریکی صدر جان۔۔ ایف کینڈی کا قتل ہوا۔۔۱۹۶۸ء میں مغربی حکام (چاہے کمیونسٹ ہوں یا ایمپیریلسٹ) کے خلاف اعتراضات نے شدت پکڑی۔۔ مجھے یاد ہے کہ میں اسی سال چیکوسلواکیہ کی "بہار پراگ"، "تحریک اصلاحات" کے نام سے موسوم تحریک کے مطالعہ کے لیے وہاں کے دارالحکومت پراگ گیا، لیکن وہاں کی سڑکوں پر سوویت یونین فوج اور اس کے ٹینکوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ کچھ سال پہلے ہنگری میں بوڈاپسٹ کی طرح مشرقی یورپیوں کی بغاوت کو کچلا جا چکا تھا۔۔ جب پراگ سے پیرس گیا تو حکومت فرانس کے خلاف "طلباء اور مزدوروں کا انقلاب" کے نام سے معروف انقلاب شورش اپنے عروج پر تھا۔۱۹۶۸ء کے موسم گرما میں ویتنام جنگ کے مسئلہ پر امریکی عوام کی ناراضگی اور سیاہ فام باشندوں کی "شہری حقوق" کی تحریک نے مزید زور پکڑا تھا۔ امریکی صدر کے انتخابات کے سلسلے میں بہت سارے افراد مارے گئے اور شاید ہی کوئی دن ہو جب پولیس فورسز اور مظاہرین کے درمیان جھڑپیں نہ ہوئی ہوں، اور اسی میں سیاہ فام باشندوں کی تحریک کے سربراہ مارٹن لوٹر کنگ اور سابق امریکی صدر کے بھائی اور نامزد صدر رابرٹ کینیڈی قتل ہوئے۔

اسی عشرے میں امریکہ میں "شہری حقوق" کی تحریک اور سرگرمیوں اور یورپ کے مظاہروں کی وجہ سے سول سوسائٹی کا موضوع سامنے نہ آ سکا۔۔ امریکی عہدیداروں، آزاد خیال اور حاکم طبقے کا اصلی نعرہ "جدید سرحدیں" اور "عظیم معاشرہ" تھا۔۔ یورپی لبرل طبقہ یورپی سوسائٹی (جو آج کی "یورپی یونین" کی بنیاد بنی ہے) کی باتیں کرتا تھا اور مغرب کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ افراد "پرولٹاریا ڈیموکریٹک سوسائٹی" کی بحثیں کر رہے تھے۔۔

گزشتہ چالیس سال سے میں مغرب کی مختلف انجمنوں اور اکیڈمیوں حن میں "انجمن سیاسی علوم امریکہ"، "انجمن بین الاقوامی روابط امریکہ"، "صحافت و ذرائع ابلاغ کی تعلیمی کمیٹی"، "انٹر نیشنل سوسائٹی آف پولیٹکل اسٹڈیز"، "انٹر نیشنل سوسائٹی آف سوشیالوجی" اور "انٹر نیشنل ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف میڈیا اینڈ کیمونیکیشن" سرفہرست ہیں، کا فعال کارکن رہا ہوں، اور متعدد کانفرنسوں میں شرکت کر چکا ہوں۔۔ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۴ء تک قائم مقام اور ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۸ء تک انٹر نیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف۔۔۔۔ کے صدر کی حیثیت سے منتخب ہو چکا ہوں۔۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواخر تک ان انجمنوں اور کانفرنسوں میں سے کسی ایک میں بھی "سول سوسائٹی" کا موضوع کسی پروگرام، نشست یا گول میز کانفرنس کا جزء نہیں رہا، "سوسائٹی"، "تمدن" اور "ثقافت" جیسے کلی اور عمومی موضوعات پر کمتر توجہ دی جاتی تھی۔۔ مغربی مکتب اثباتیت کے پیرو افراد ان موضوعات کو تجرباتی، آزمائشی اور حسی تحقیقات کے لیے کافی نہیں سمجھتے تھے۔۔

مارکسٹ اور عمرانیات کے تابع افراد، ان موضوعات کے بارے میں کسی بھی قسم کے مطالعے اور تجزیہ کو اقتصادی، مادی اور "طبقاتی تنازعات" کے پیرائے میں دیکھتے تھے۔۔ درحقیقت، سوویت یونین کے سقوط تک مغرب، انجمنوں اور ان سے وابستہ اکیڈمیوں میں معاشرتی علوم دو مکاتب "لبرلسٹ اور کیپٹلسٹ" اور "مارکسسٹ و سوشلسٹ" کے فکری تسلط میں تھے اور کسی بھی قسم کی فکری آزادی (جو ان دو مکاتب کے دائرہ سے باہر ہوتی تھی) اسے سخت مزاحمت، تنقید حتی کہ حملے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان دو مکاتب نے "تیسرے طبقہ" کے روشن خیال افراد اور دانشوروں میں رسوخ کرکے ہر قسم کی فکری اصالت کا گلا گھونٹ دیا۔۔ "سرد جنگ" افکار پر حکومت کرنے والا نمونہ بن چکا تھا۔۔

۱۹۷۸ء میں، مجھے پولینڈ میں منعقدہ عالمی کانگریس اور "انٹر نیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیا اینڈ کیمونیکیشن" کی جنرل اسمبلی کی افتتاحی تقریب میں تقریر کے لیے مدعو کیا گیا تو میں نے اپنی تقریر اور رپورٹ کا عنوان "ثقافت، سوسائٹی اور روابط" منتخب کیا تھا۔۔ یہ اجلاس ٹھیک اس وقت منعقد ہو رہا تھا جب ایران میں اسلامی انقلاب کے لیے مظاہروں کا آغاز ہو رہا تھا۔۔ میں نے مغربی ثقافت، سوسائٹی اور روابط "کا سرمایہ دارانہ کیمیونسٹ نظام کے پیرائے میں تنقیدی جائزہ لیا اور اسلامی سوسائٹی اور امت کے پیرائے میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے حوالے سے میری پیشگوئی اور اشارے کو ان دو مکاتب کے شدت پسند اور

سرد مہر صاحبان نظر افراد کے عکس العمل کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کانفرنس کے کچھ ہی مہینوں بعد میری تقریر کو (جو ابھی پولش زبان میں ترجمہ نہیں ہوئی تھی) پولینڈ کے اساتذہ کے ایک گروہ نے "کاراکو" نامی سہ ماہی جریدے میں شائع کیا۔۔ کچھ سال بعد پولینڈ کا یہ روشن خیال اور دانشور گروہ" Solidarity movement" کے ساتھ ملحق ہو گیا اور اپنے ساتھیوں سمیت "سول سوسائٹی" کے احیاء کے لیے مرکزی اور مشرقی یورپ میں مرکزی حیثیت کا حامل مانا جانے لگا ہے۔۔

۱۹۸۰ء کی پوری دہائی بالخصوص روس میں ہونے والی "پروسٹریکا" اور "گلاس لوسٹ" سے موسوم تبدیلیوں کا دور اور مرکزی و مشرقی یورپ میں "سول سوسائٹی کے احیاء" کے زمانے میں مجھے کئی دفعہ ان ممالک میں تدریس و تقریر کے لیے مدعو کیا گیا اور میں نے مغربی قائدین اور حکام اور مختلف پارٹیوں کے روشن خیال طبقے سے بحث و گفتگو کی۔ حتی کہ چیکوسلواکیہ، یوگسلاویہ اور مشرقی جرمنی میں، (جس وقت وہاں کی حکومتیں یکے بعد دیگرے تبدیل ہو رہی تھیں) میں بذات خود موجود تھا۔۔ یورپ اور بالخصوص مرکزی اور مشرقی یورپ میں نظریہ سول سوسائٹی کے حامی بہت سارے افراد میرے علمی اور ثقافتی کولیگ تھے وہ افراد جن سے میں مختلف علمی اجلاسوں اور کانفرنسوں میں آشنا ہوا تھا۔۔

ان میں سے بہت سے افراد سابقہ حکومتوں کے زوال کے بعد نئی حکومتوں کے اصلاحی اداروں میں شریک ہوئے، لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد انتہائی سرد مہری کے ساتھ ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جبکہ بعض ابھی تک ان امیدوں اور کامیابیوں کے حصول کے لیے کوشاں تھے جو انہیں ہرگز حاصل نہیں ہوئیں تھی اور بہت سے گروہ راتوں رات اپنا عقیدہ تبدیل کر کے کسی اور عقیدے سے منسلک ہو گئے اور سرمایہ داری اور بازاری ڈیموکریسی کے حامی بن گئے۔۔ یہ لوگ ابھی تک سرکاری، غیر سرکاری اور پرائیویٹ بیوروکریسی کے لیے سرگرم ہیں۔۔ اس کی بہترین مثال ماسکو کی عظیم سرکاری یونیورسٹی میں سوشل اسٹڈیز فیکلٹی کے صدر ہیں، جو اسٹالن کے دور سے لے کر آج تک (ولادیمیر پوٹین کی صدارت کے دور تک) اس حکومتی عہدے پر باقی ہیں۔۔ گزشتہ کچھ دہائیوں کے واقعات پر مختصر نگاہ کا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب کا قاری مغرب میں سول سوسائٹی کے موضوع کی اصطلاحات اور زبان سے نہ فقط آشنا ہو بلکہ اس عرصے میں اس موضوع کے بارے میں حقیر کے ذاتی تجربات کو بھی نظر میں رکھے۔۔

ایک دہائی قبل، جس وقت میں الجزیرہ، قاہرہ، الازہر اور استنبول کی یونیورسٹیوں میں خطاب کر رہا تھا، ملک کے علم عمرانیات، سیاست اور روابط کے اساتذہ اور طلبا کے سروے کے مطابق ان سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ (سوائے ان افراد کے جو اسلامی جماعتوں اور گروپوں کے رکن تھے) اگرچہ یہ لوگ مغربی سوسائٹی کے لفظ اور مفاہیم کے بارے میں قابل قبول معلومات اور سمجھ بوجھ تو رکھتے تھے، لیکن اسلامی سوسائٹی (امت مسلمہ کن کن پہلوؤں کو شامل ہے؟ نظریاتی اور عملی نقطہء نظر سے تاریخ میں اس کا کیا کردار رہا ہے؟ ان سوالوں کے جواب سے بے خبر تھے۔۔ ۱۹۹۰ء کو جب سوویت یونین اور یوگسلاویہ کا شیرازہ بکھرنے کو تھا، میں نے جمہوریہ اسلوانیا کے شہر لوبلیانا میں "سول سوسائٹی اور انفارمیشنل سوسائٹی" کے موضوع پر ۲۳ ممالک کے ماہرین کی موجودگی میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کی۔۔ امریکہ اور یورپی ممالک سے شریک افراد "سول سوسائٹی، انفارمیشنل سوسائٹی اور اسلامی سوسائٹی ؛ ایک تقابلی مطالعہ" (۲) کے موضوع پر میری رپورٹ سن کر نہ صرف حیران ہوئے، بلکہ عمرانیات اور مغربی روابط کے اساتذہ کی ایک کثیر تعداد نے اس بات سے (کہ اسلام نے شروع سے ہی حکومت اور خاص سول سوسائٹی کو تشکیل دیا اور اسے سیاست اور سیاست کو اخلاق سے جدا نہیں جانا) لاعلمی کا اظہار بھی کیا۔۔ تعجب اس بات پر ہے کہ سول سوسائٹی کے بارے میں یہ اجلاس سوویت یونین کے زوال اور اسلامی انقلاب کی کامیابی کے دس سال بعد منعقد ہو رہا تھا۔۔ اس اجلاس میں مغربی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی اتنی بڑی تعداد کا اسلام کے بارے میں ناآشنا اور لاعلم ہونا، اس قدر باعث ندامت تھا کہ لندن میں انگریزی زبان میں شائع ہونے والے "چینل، ثقافت اور سوسائٹی" سہ ماہی علمی جریدے کے ایڈیٹر (جو اس نشست میں خود موجود تھے) نے ارادہ کیا کہ اس جریدے کے (پہلے شمارے، جلد ۱۵ جنوری ۱۹۹۳) کو پہلی بار اسلام میں سوسائٹی اور روابط کی شناسائی کے لیے مختص کریں گے۔ (۳)

مذکورہ بالا دو مثالوں کا مقصد اس موضوع کی نشاندہی ہے کہ اسلامی ممالک کے روشن خیال افراد کی خاصی تعداد کی معاصر ثقافتی زبان، سالہا سال سے مغرب کی ثقافتی زبان بن چکی ہے اور ان کے معارف اور تقاریر کا منبع مغربی لغت نامہ بن چکا ہے۔۔ مغربی الفاظ اور مفاہیم کے ورود و استخراج کی ایک لمبی تاریخ، اسٹریٹجی اور خاص منصوبہ بندی رہی ہے، جس کے سرے انیسویں صدی کے اواخر سے ملتے ہیں۔ لیکن آج کا

جدید قانون اور زیر بحث گفتگو کے اتار چڑھاؤ کے عنوان سے مغربی مفاھیم کی تبلیغ و ترویج کا بین الاقوامی اور ملکوں کی داخلی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے حالات کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔۔

امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب تمام نواقص اور اعتراضات کے باوجود ہمارے دور میں ہونے والی تبدیلیوں اور واقعات کو واضح و روشن کرنے کے سلسلے میں ایک چھوٹا لیکن موثر قدم ہو گا اور قارئین کے لیے پسندیدہ اور دلچسپ قرار پائے گی۔

حمید مولانا

واشنگٹن۔ ۱۴۸۰ھ۔ بمطابق ۲۰۰۱ء

پہلا باب

سول سوسائٹی

کچھ عرصہ قبل جب سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان جاری سرد جنگ کا اختتام ہوا اور بین الاقوامی سطح پر "امن" کی امید نظر آنے لگی تو مغربی دنیا نے "سول سوسائٹی" اور "ایک نئی دنیا" کے ظہور و پیدائش کی امید باندھی۔ آج اس مدت میں بین الاقوامی نظام نے جتنے بھی بحران دیکھے ہیں (جن میں خلیج فارس کی جنگ اور اس خطہ میں امریکیوں کی زیادہ سے زیادہ مداخلت، بوسنیا ہرزگوینا اور کوسووو میں نسل کشی، سارے افریقہ اور بالخصوص روانڈا میں ہونے والے نسلی اور فرقہ وارانہ فسادات اور اس کے نتیجہ میں قتل عام، فلسطین، چیچنیا، کشمیر، صومالیہ اور دوسرے خطوں میں مسلمانوں اور اُمت مسلمہ کے ساتھ بہیمانہ اور بے رحمانہ سلوک، شمالی ائرلینڈ کے "وطن پرست پروٹسٹنٹ اور کیتھولک گروہوں کے مابین سالہا سال جاری رہنے والے اختلافات اور دہشت گردی و۔۔۔ شامل ہیں) ان کی وجہ سے مغرب میں خوش بینی کی وہ ہلکی سی اُمید بھی بدبینی اور مایوسی میں تبدیل ہو گئی۔ قومی اور بین الاقوامی نعرے جیسا کہ "تاریخ کا خاتمہ"، "امن اور جمہوریت"، "جدید بین الاقوامی نظام"، "تہذیبوں کا تصادم" اور اسی طرح "تہذیبوں کی گفتگو" یہ سب ایک جامع تعلقات کی فضا کی تشکیل میں موجودہ عالمی حالات پر ذرہ برابر اثر چھوڑنے سے قاصر رہے ہیں۔ یہ گفتگو اس دنیا کی از سر نو تشکیل کے متعلق ہونے لگی ہے جس میں "طاقتور حکومتیں"، "مقتدر حکمران" اور "بین الاقوامی طور پر بالا دست تنظیموں" جیسے موضوعات کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ بیسویں صدی اور اس کے قدیم ادارے جو کہ خود اٹھارویں صدی کے قومی اور علاقائی نظام کی میراث تھے، ان کے ذریعے اکیسویں صدی کو آباد کرنے کی کوشش فی الواقع خود بے نظمی اور تنزلی کی طرف سفر ہے۔

ان دس سالوں میں مشرقی اور وسطی یورپ، جنوبی افریقہ اور وسطی ایشیائی ممالک نے اپنے استقلال کا جشن منایا۔ (البتہ یہ استحصال Explitation سے نجات پانے کا جشن تھا) یہ سوچے بغیر کہ اس مخالف تحریک اور انقلاب کو کس طرح ایک مستقل "جمہوری" نظام میں تبدیل کرنا چاہئے۔ مشرقی یورپ میں واکلاو ھاول اور جنوبی افریقہ میں مینڈیلا جیسے مصلحین "Reformists" کی آواز مدتوں تک عالمی اخبارات

اور میڈیا میں گونجتی رہی لیکن ان کی کامیابی کا تناسب بھی نصف صدی قبل تیسری دنیا کے قائدین جیسے گاندھی، نہرو، مصدّق، ناصر، سوکارنو۔۔۔ سے زیادہ نہ تھا جو سامراج کے مخالف لیکن ایک طرح سے مغرب کے عالمی نظام کے موافق تھے۔ وسطی اور مشرقی یورپ، وسطی ایشیا، جنوبی افریقہ اور حتی کہ روس ایسے وقت میں نئی دنیا میں قدم رکھ رہے تھے جب اقتصادی، سیاسی اداروں سے لیکر آئیڈیالوجی اور سول سوسائٹی تک ہر شئکو امریکہ اور اس کے ہم فکر یورپین حلیف پہلے سے ہی فراہم کر چکے تھے۔

ان ممالک کی وہی حالت تھی جو دوسری عالمی جنگ اور سامراج مخالف لڑائی کے بعد تیسری دنیا کی تھی۔

تو موجودہ حالات میں کیا کرنا چاہئے؟ مغرب میں بالخصوص اعتدال پسندوں اور قدامت پسندوں کے درمیان حکومتی طاقت و قدرت اور اس کے حجم، ظرفیت اور وسعت پر ذوقی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہت سے لبرل افراد کا یہ نظریہ ہے کہ محدود اختیارات کی حامل حکومت بہترین حکومت ہوتی ہے اور اگر معاشرے اور نظام کو ایسے مقام پر اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو نہ صرفصرف رفاہ عامّہ کا راستہ ہموار ہوگا بلکہ معاشرہ میں امن و مساوات کا دور دورہ بھی ہوگا، لیکن اسی لبرل طبقے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح سے بوسنیا۔ ہرزگوینا، روینڈا، لبنان، افغانستان و۔۔۔ میں مضبوط اور مقتدر حکومتوں کی عدم موجودگی کے سبب ان ممالک میں کتنے وسیع پیمانے پر قتل عام ہوئے اور کسی نے بھی ان ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے آواز تک بلند نہ کی۔ دوسری طرف ان کے مقابلے میں ایک ایسا لبرل طبقہ بھی ہے جو مغربی مفکر تھامس ھابز کے پیش کردہ مضبوط نظام حکومت کی حمایت کرتا ہے اور اس نظام کو "ابتدائی اور طبیعی حالت" سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بہترین نظام سمجھتے ہیں۔ جس میں مختلف گروہ اور معاشرے ایک دوسرے کی اکھاڑ پچھاڑ میں مصروف ہوا کرتے تھے۔ ، جبکہ اس کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ اگر حکومتی رکاوٹیں ختم ہو جائیں اور "کم سے کم طاقت رکھنے والی" حکومتیں معرض وجود میں آئیں تو آج کا "ماڈرن" سرمایہ دارانہ نظام، معاشروں میں موجود اختلافات اور بغاوتوں کو روک سکے گا۔

اصل میں ہماری بحث "بڑی اور طاقتور" یا "محدود اور چھوٹی حکومت" اور ان دو قسم کے نظاموں میں سے کسی ایک کے انتخاب کے بارے میں نہیں، بلکہ حکومت کی نوعیت اور کیفیت کے بارے میں بھی ہے۔ فی الواقع ہم مغرب میں "حکومت" کی کیفیت پر بحث کر رہے ہیں نہ کہ اس کی ظرفیت، حجم اور اس کے دائرہ کار کے بارے میں،۔ دوسرے لفظوں میں آج اگر ہم مروجہ طریقہ کار جیسے "قوم۔ حکومت" اور

"سوسائٹی" جیسے نمونوں سے آگے نہیں سوچیں گے تو مفروضہ سول سوسائٹی کی کیفیت کو تبدیل یا اس کی اصلاح نہیں کر پائیں گے۔

۱۹۸۰ء کے دہائی میں یورپ اور دوسرے علاقوں میں "سول سوسائٹی" کی فکر کے احیاء کی اصلی بنیاد یہ تھی کہ سول سوسائٹی، تاجروں اور بیوپاریوں کے تجارتی منافعوں اور حکام کے دباؤ اور اثر و رسوخ سے عاری ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی مثالی سول سوسائٹی ایک خیالی چھوٹے سے معاشرے میں تو ممکن ہو سکتی ہے، لیکن ایک ایسی دنیا جہاں رسد و تقسیم (Production and distribution) کام، پیشہ اور حکومتوں کے مابین رقابتیں اور حسد پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئے ہوں، وہاں مفروضہ سول سوسائٹی کا وجود ناممکن نظر آتا ہے۔

آج کے دور میں "سول سوسائٹی" کی اصطلاح کا اپنے معنی میں استعمال اور یورپ اور امریکہ میں تین صدیاں پہلے کے استعمال میں بہت زیادہ فرق ہے۔ جب سکاٹ لینڈ کے مفکر، فلسفی اور ماہر اقتصادیات، ایڈم سمتھ جسے آج مغرب میں کلاسیکل اقتصادیات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ نے مارکیٹ اور ایکسچینج کی بات کی تھی تو "اٹھارویں صدی عیسوی" کی مارکیٹ، اقتصاد اور تجارت کی کیفیت میں اور موجودہ صورت حال میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے دور میں آج کی مصنوعات، معلومات اور کرنسی ایکسچینج کے پیچیدہ نظام کا وجود ہی نہیں تھا۔ ایڈم سمتھ کی معروف کتاب قوموں کا سرمایہ" Wealth of Nations" (۴) کا گہرا اور دقیق مطالعہ کیا جائے تو، مضبوط اقتصادی نظریات کی بجائے اخلاقی اور نیک تعلقات کی تجاویز ہی نظر آتی ہیں۔

فرانسیسی مصنف الیکس ڈوٹو کویل، جس نے ۱۸۳۰ء کی دہائی میں امریکہ کا دورہ کیا اور اس کی کتاب امریکہ میں جمہوریت "Democracy in America" کو امریکی ناظرین نے بہت سراہا، اُس نے امریکہ کو اپنے وطن یعنی فرانس کے مقابلہ میں بہت منفرد ٹھہرایا۔ (۵) انفرادی آزادی، چھوٹی چھوٹی سی دیہی اور شہری سوسائیٹیاں جن میں غیر سرکاری اداروں میں امریکیوں کا بغیر کسی دباؤ کے شریک ہو کر اس وقت کے سیاسی نظام میں حصہ دار بننا، ڈوٹو کویل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور فی الواقع وہ سب سے پہلا ایسا یورپی تھا جس نے امریکی جمہوریت کو منفرد اور ایک نادر نظام کے طور پر ذکر کیا۔ لیکن یاد رہے کہ ڈوٹو کویل اپنے اس دورہ تک فرانس اور برطانیہ کے علاوہ کسی دوسری تہذیب اور نظام سے آشنا نہ تھا۔

آج تک مسلسل تکرار ہونے والا اس کا نظریہ دو ستونوں پر استوار ہے، ایک، وہ ایسے وقت پر امریکہ گیا جب خود اس کے ملک یعنی فرانس کی جمہوریت انقلاب کے بعد آمریت اور انارکی کا شکار تھی اور انقلاب فرانس کا معروف نعرہ "آزادی، مساوات اور اخوت" اپنے معانی کھو چکا تھا۔ فرانس بلکہ براعظم یورپ، انقلاب فرانس کے چند سال بعد تک نپولین اور اس کی فوج کے تحت تسلط ایک تلاطم خیز دور گزار رہا تھا۔ دوسری چیز جس نے ڈوٹوکویل کو امریکی جمہوریت کی تعریف و تحسین پر وادار کیا وہ امریکی حکومتی اور جمہوری نظام کا فرانس اور برطانیہ کے ساتھ موازنہ تھا۔ ٹوکویل امریکہ اور اس کے سیاسی و سماجی نظام کا ایک ایسے وقت میں مشاہدہ کررہا تھا جب امریکہ کی کل آبادی صرف ایک کروڑ تیس لاکھ تھی اور لوگوں کی اکثریت دیہاتی اور زراعت سے منسلک تھی اور امریکہ ابھی تک صنعتی انقلاب کے دور میں داخل نہیں ہوا تھا۔

آزاد خیال مارکسسٹ اور وسطی اور مشرقی یورپ کے بائیں بازو سے منسلک طبقہ کی سول سوسائٹی سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں جو ان کے اپنے نظام کی ناکامی سے انکی مایوسی کی عکاسی کر رہی تھیں۔ اس طرح مغربی صاحبان اقتدار اور (امریکہ کے فرانسس فکویاما) جیسے روشن خیال لبرل افراد جو "تاریخ کا اختتام" اسی میں دیکھتے تھے کہ سویت یونین اور وسطی اور مغربی یورپ کیمونزم سے رہائی پا کر لبرل ازم کا سہارا لیں گے، ان کا جشن منانا بھی بھولے پن اور خوش فہمی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ یہ نظریہ کہ کیمونسٹوں نے اپنے "مقیّد معاشرہ" کو ترک کرکے مغرب کے "آزاد معاشرے" کو اپنا لیا ہے، ایک علمی و فنّی غفلت اور غلطی تھی، کیونکہ "آزد معاشرے" کو کبھی بھی ایک نظام کے طور پر شمار نہیں کیا گیا۔ وسطی اور مشرقی یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ آزاد معاشرہ کو برقرار رکھتے ہوئے سول سوسائٹی کی تخلیق چاہتے تھے اور یہ کام مقالہ نویسی، تقریر یا پریکٹیکل فورم وغیرہ سے ممکن نہیں تھا۔ وسطی اور مشرقی یورپ کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا اور ایک نئے نظام کے بغیر جو اب تک معلوم بھی نہیں تھا کہ کون سا نظام ہو گا، آزاد ماحول کے بغیر سول سوسائٹی کی تشکیل ایک ناممکن امر تھا۔ ان ممالک میں صرف ایک نیا آئین مرتب کرنا بھی ان کے لیے بے سود تھا اور جیسا کہ ایک مغربی آزاد خیال، جیمز ماریسن "Notes of Debates in the Federal Connection" میں لکھتا ہے۔

"آئین کو زندہ اور عملی رکھنے کے لئے پہلے سوسائٹی میں سماجی حقایق کی تخلیق بے حد ضروری ہے"۔(٦)

بنیادی آئین کو لکھنے میں شاید چھ ماہ بھی درکار نہ ہوں لیکن ایک جدید اقتصادی نظام کی تنصیب و توثیق کے لیے کم از کم چھ سال کا عرصہ لازمی ہے۔ مغرب میں تہذیب اور سول سوسائٹی دونوں پر بیسویں صدی میں دو قسم کی فکر اور سیاست نے یلغار کی، ان معاشروں پر پہلی یلغار سوشلسٹ و کمیونسٹ انیائی "Despotic" حکام اور پارٹیوں کی جانب سے ہوا جبکہ دوسری یلغار انتہا پسند اور قدامت پسند "Conservatie" حکومتوں جیسے انگلینڈ برطانیہ میں مارگریٹ تھیچر اور امریکہ میں رچرڈ نکسن اور رونلڈ ریگن کی طرف سے عمل میں آئی۔ سوشلسٹ اور کیمونسٹ پارٹیاں مغرب میں موجود سول تنظیموں کو سماجی طاقت کے حصول میں مانع تصور کرتی تھیں جبکہ دوسری قسم سوائے فرد اور حکومت کے کسی چیز پر اعتماد نہیں رکھتی تھی۔ دونوں نظاموں میں حکومتی منصوبہ بندی کرتے وقت، "سوسائٹی" کے مفہوم کو حکومت، فرد اور پارٹی کے بعد رکھا گیا۔

انیسویں صدی ہجری کے اوائل سے لے کر دو صدیوں تک مغرب کے سماجی اور سیاسی تفکر نے سوسائٹی کے معنی و مفہوم یا اس کی ترجیح پر توجہ نہ کی۔ اس وقت حکومت، بیوروکریسی، احزاب، سلطنت اور اقتصاد جیسے امور مفکرین کے لئے موضوع سخن ہوا کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے اواسط سے سماج کے زوال کو دیکھتے ہوئے مغرب کے مفکرین اور نظریاتی افراد "سوسائٹی" کے مفہوم کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن حکام، سیاستدانوں، پالیسیاں مرتب کرنے والے اور پارٹی رھنماؤں کی زبان پر یہ لفظ مجبوراًاور وقتی طور پر رائج ہوا مثال کے طور پر سپر پاور سویت یونین اور اس کے حواری "قوم و حکومت □ جو سب ہی پاش پاش ہو رہے تھے، ایسے وقت میں مغربی حکام اور پالیسی مرتب کرنے والے اور روشن خیال افراد کو چاہئے تھا کہ مغربی افکار کی راکھ سے سول سوسائٹی کے نعرہ کو باہر نکال کر اسے دوبارہ سے زندہ کریں۔

سیاسیات، عمرانیات، معاشیات، مواصلات اور فلسفہ کے کتب خانوں، محفظ خانوں اور علمی جرائد پر ایک طائرانہ نگاہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح سے مغرب کے علمی اور ثقافتی مراکز اور یونیورسٹیز میں سول سوسائٹی کے لفظ کو فروغ اور ترقی ملی اور کس طرح یہ مسئلہ بہت جلد (زیادہ تر تقلید کرتے ہوئے) مشرقی ممالک کے آزاد خیال افراد، صحافتی شعبہ سے منسلک افراد اور اساتذہ حتی مسلمانوں کے درمیان

بھی عام ہوا۔ مقدار کے اعتبار سے یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں مغربی عمرانیات کی تصنیفات اور مطالعاتی شعبہ کا بہت بڑا حصہ سول سوسائٹی سے متعلق تھا۔

یہاں سول سوسائٹی سے متعلق مغرب کے نظریات کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے ہم امریکہ اور یورپ میں اس تفکر کے پنپنے پر مختصر سا اشارہ کرتے ہیں۔

سول سوسائٹی مغرب میں ایک تصور، ایک فکر، ایک عقیدہ اور ایک آزاد خیال نظریہ ہے جس کی جڑیں یورپی نشاۃ ثانیہ اور اس براعظم کی نئی بیداری سے ملتی ہیں۔

سول سوسائٹی ماڈرن یورپ کو قرون وسطیٰ کے یورپ سے جدا کرتی ہے، مغرب کی جہالت کو اس کی عالمیت سے، مغربی تہذیب و تمدن کو اس کی ظلم و بربریت اور مغربی قانون کو اس کی لاقانونیت سے جدا کرتی ہے۔ سول سوسائٹی ایک مغربی معاشرے کا موضوع ہے اور یہ مغرب کے لیے مطلوب معاشرے کے حصول کی کوشش اور امید کی ایک کرن ہے۔ سول سوسائٹی، مغرب میں ترقی و کمال کے لئے الٰہی حکمت ہے۔ سول سوسائٹی اور دوسرے مغربی تصور کے مابین حکومت کی مرکزیت، نظریہ عقلانیت "Rationalism" اور انسانی ترقی میں طاقت کے مفہوم کے بارے میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ مغربی اہل قلم کے نزدیک پہلی مغربی سول سوسائٹی کی، نشاۃ ثانیہ سے متاثر افکار کے باہمی امتزاج سے اس وقت داغ بیل ڈالی گی جب مکیاولی(۷) اور دیگر یورپی مفکرین کی طرف سے شہریت، طاقت کی تابعداری اور اسی طرح اس کے مفہوم کے علمی اور عملی لحاظ سے اصول پیش کئے گئے۔ حکومت اور بالخصوص سماجی مسائل کے بارے سترہویں صدی میں یورپ میں شروع ہونے والے تبصروں کی وجہ سے تھامس ھابز " Tomas Hobbes"(۸) اور جان لاک "John Locke"(۹) جیسے مفکرین کی تالیفات میں سول سوسائٹی کے بارے میں بہت زیادہ بحث کی گئی۔ اس دور کے یورپی مفکرین کے نزدیک سول سوسائٹی ایک ایسا نظام تھا جسے نا صرف "عادی نظام" بلکہ "بربریت" "استبداد" اور جاگیر دارانہ نظام کا بھی سامنا تھا۔ صنعتی انقلاب اور سرمایہ دارانہ نظام میں توسیع کی وجہ سے سول سوسائٹی ایک تجارتی اور کاروباری سوسائٹی میں تبدیل ہو گئی۔ سوسائٹی کی تشکیل میں اقتصادی اور مالی بحثوں کو سکاٹ لینڈ کے آزاد خیال دانشوروں نے اٹھایا اور یوں سول سوسائٹی آزادی، منافع اور منفعت پسندی کے معانی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ چیز جسے ان مفکرین

نے نظر انداز کر دیا وہ سول سوسائٹی اور حکومت کے مابین موجود فرق تھا اور یہ کام ہیگل کی تصانیف میں ہونا چاہئے تھا۔ اسی وجہ سے سول سوسائٹی حکومت سے خارج ہی نہیں بلکہ اس کے بالمقابل قرار پائی۔

ہیگل نے سول سوسائٹی کے اخلاقی پہلوؤں پر غور و فکر کیا۔ (۱۰) اس کی نظر میں سول سوسائٹی مکمل طور پر خود غرضانہ، اور خالصتا مسابقتی، اسی طرح انفرادی اور سماجی مشکلات پر مشتمل تھی اس کی نظر میں حکومت، سول سوسائٹی کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک اعلیٰ اخلاقی سماج کی تخلیق کر سکتی ہے جو مکمل طور پر قانون کے دائرے میں ہو۔

مارکس نے ہیگل کی باتوں کو گھما پھرا کر دعویٰ کیا کہ سول سوسائٹی ایک متوسط (سوداگر) طبقے "Bourgeois" کے علاوہ کچھ بھی نہیں (۱۱) جبکہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے مغربی مفکرین جیسے ایڈم فرگوسن، تھامس پین اور ایلکس ڈوٹوکویل نے سول سوسائٹی کو جمہوریت، ڈیموکریسی اور پلورل ازم کے لیے بنیاد قرار دیا جو استبداد اور یکطرفہ سوچ کے ساتھ برسرپیکار ہے۔ مگر دوسرے یورپی مصنفین نے طاقتور قومی حکومتوں کی تعریف جاری رکھی۔ (۱۲) مغرب میں سول سوسائٹی کا دوبارہ احیاء بیسویں صدی کے اطالوی انٹینیو گرامشی جیسے مصنفین کی تصانیف سے عمل میں آیا۔ گرامشی، جو خود ایک مارکسسٹ تھا اور وہ کسی حد تک ڈیموکریسی اور پلورلزم کے بارے میں مبہم قسم کے خیالات رکھتا تھا۔ اُس نے دعویٰ کیا سول سوسائٹی اور حکومت کے مابین جاری جنگ و رقابت بالآخر دونوں کے زوال پر ہی ختم ہوگی۔ (۱۳) چند عشروں تک بالخصوص کمیونزم اور کیپٹلزم کے درمیان سرد جنگ کے دور میں سول سوسائٹی کا موضوع و مفہوم طاقِ نسیان کے سپرد کر دیا گیا اور زیادہ تر کیپٹلزم ڈیموکریٹک سوسائٹی اور سوشلزم ڈیموکریٹک سوسائٹی پر زور دیا گیا۔ سوویت یونین اور اس کے حواریوں کے زوال کے بعد، مغربی یورپین سوسائٹی، یورپی یونین اور امریکہ کے سیاسی اور معاشی بحران کے ساتھ ایک مرتبہ پھر سول سوسائٹی موضوع بحث بن گئی۔ آج مارکسسٹ اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والا طبقہ اپنی دانائی اور نادانیوں کو سول سوسائٹی کی طرف رجحان کا نام دے کر، انھیں چھپا رہا ہے؛ جبکہ لبرل کہلانے والے اعتدال پسند اور دائیں بازو والے بھی مغرب میں اپنی معذوریوں اور غیر ضروری دخل اندازیوں اور مداخلتوں کے لیے سول سوسائٹی کا سہارا لیتے ہیں سوویت یونین اور وسطی و مشرقی کیمونسٹ یورپی ممالک کے زوال اور اس خطہ کے اہل قلم اور دانشوروں کے درمیان سول سوسائٹی کے بارے میں ہونے والی بحث جو پچھلی دہائیوں کی تسلط پسندیوں

سے رہائی پانے کے لیے ایک نئے ڈھانچے اور فریم میں شروع ہو چکی تھی۔ اس بحث نے امریکہ اور اس کے پالیسی ساز افراد کو بہترین موقع فراہم کیا تا کہ وہ سول سوسائٹی کے مفہوم کو بہانہ بنا کر سوویت یونین کے تحت تسلط سابق ریاستوں اور بالخصوص یورپ میں اپنے پاؤں مضبوط کرے۔ یہیں سے ان علاقوں میں امریکہ کی کاروائیوں کا آغاز ہوتا ہے۔

مغرب، اور خاص طور پر امریکہ نے ایشائی، افریقی اور لاطینی امریکہ کے ممالک اور اسی طرح روس، مشرقی و وسطی یورپ اور وسط ایشیائی ریاستوں کے سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور فوجی امور میں مداخلت کرنے کے لیے ہمیشہ سول سوسائٹی، جمہوریت اور سیاسی ترقی جیسے نعروں کو گلوبلائزیشن، جدید لبرلزم یا نئی جدت پسندی اور نئی حریت پسندی جیسے انتہائی مبہم ہتھیاروں کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان خطوں میں مغرب کا تسلط و غلبہ اور آخری دہائیوں میں امریکہ کی فلپائن، چلی، نکاراگوا، ہیٹی، جنوبی افریقہ، بالکان، مشرق وسطی، خلیج فارس اور ایشیا پسیفک میں مداخلت اس (سول سوسائٹی اور جمہوریت کے قیام) کی چالوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسی طرح ان ممالک میں جاری آزادی اور سامراج کے خلاف تحریکوں میں مداخلت اور ان خطوں کے خوشحال، متوسط اور برگزیدہ طبقوں میں مغربی طرز کی آزادی کی خواہش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جس کا مقصد ان ممالک کو عالمی اقتصاد اور سیاست کے دائرے میں لانے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ امریکہ اور یورپی یونین نے لاطینی امریکہ اور مشرقی یورپ میں انفرادی اور خاندانی اقتدار اور استبداد، افریقہ اور وسطی یورپ میں نسل پرستی اور نسل کشی کی حمایت سے اس وقت ہاتھ اٹھایا جب ان ممالک کی آزادی کی تحریکیں اپنے لیے جمہوریت اور ڈیموکریسی کی تکمیل اور حصول کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور مغرب میں مرکوز سرمایہ دارانہ نظام اور لبرلزم طرز کی جمہوریت کے لیے خطرے کی گھنٹی ثابت ہوئیں۔

مغرب کو ان ممالک میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں، حکومتوں اور کابینہ کی تبدیلی اور منتخب حکام کی تبدیلی سے کوئی پریشانی نہیں بلکہ ان کے خوف کی اصل وجہ یہ ہے کہ کہیں ان ممالک کا سماجی نظام تبدیل نہ ہو جائے جس کی وجہ سے ان کا معاشرتی ثبات متزلزل ہو جائے گا۔ سول سوسائٹی کی طبیعت اور مزاج ڈیموکریسی اور جمہوریت کی طرح قومی اور عالمی معاشرتی نظام کے ساتھ مربوط ہے۔

سماجی نظام اور معاشرہ، خود اپنے اور دوسروں کے متعلق ہمارا نظریہ یا مختصر لفظوں میں کہیں تو یہ سماجی نظام ہی ہے جو دنیا اور آخرت کے متعلق اقتصادی اور سیاسی نظام تشکیل دیتا ہے نہ کہ رسد و تقسیم اور اسی

طرح صرف صرف حکومتیں اور سیاسی نظام بھی انسانی معاشروں کے وجود کی دلیل نہیں بن سکتے۔ علاقائی، قومی اور عالمی اقتصاد میں موجود خلا اور شگاف مغرب کے سوسائٹی کے متعلق نظریات، ترقی، بہبود و سعادت، شہریت اور آزادی کے ساتھ براہ راست اور گہرا تعلق رکھتے ہیں؛ کچھ سال پہلے اقوام متحدہ کی طرف سے چھپنے والی رپورٹ جسے "انسانی ترقیاتی رپورٹ" کا عنوان دیا گیا دولت کے سمندر میں فقر کی منظر کشی کرنے کے لیے بہت معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق پوری دنیا کی ۸۳ فیصد دولت، شمالی ممالک "یعنی یورپ اور امریکہ" میں مرکوز ہو کر رہ گئی ہے؛ جبکہ یہ ممالک پوری دنیا کی آبادی کا صرف ۲۰ فیصد حصہ ہیں۔ یہ چھوٹی سی مغربی اقلیت دنیا کی ۸۳ فیصد پیداوار، ۸۱ فیصد تجارت، ۹۵ فیصد بینک اور عالمی مالیاتی اور تجارتی اداروں، ۸۰ فیصد بچت، ۸۱ فیصد داخلی سرمایہ کاری اور ۹۴ فیصد عالمی ترقی اور تحقیق کی مالک بنی بیٹھی ہیں۔ یہ مغربی اقلیت دنیا کی ۷۰ فیصد توانائی، ۷۵ فیصد معدنیات اور دھاتیں، ۸۵ فیصد جنگلات اور ۶۰ فیصد خوراک کا استعمال کرتی ہے جبکہ دنیا کا ۲۰ فیصد طبقہ جو انتہائی نچلی سطح کی زندگی بسر کر رہا ہے عالمی دولت کے صرف ۱/۴ فیصد کا مالک ہے۔

موجودہ بین الاقوامی نظریات (جو سب مغربی طاقتوں ہی کی پیداوار ہیں) نے کبھی قوم پرستی، آزادی و استقلال اور کبھی قومی حاکمیت اور بین الاقوامی حقوق کے نام پر ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ اور بالخصوص عالم اسلام کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا جبکہ وہ خود اپنے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور یورپی یونین یا وسیع و جامع تر سوسائٹیز کی باتیں کرتے ہیں۔ مغرب، سول سوسائٹی کی بحث کی ایک ایسے ماحول میں تشویق و ترویج کر رہا ہے جہاں عالمی نظام میں اقتصادی، سیاسی اور سماجی خلاء موجود ہے اور جہاں، شدت پسندی اور قانون شکنی نے اجتماعی انصاف کی جگہ لے لی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے بہت سے مغربی مفکرین سوسائٹی کے برگزیدہ افراد کے متعلق مختلف آراء و نظریات پیش کرتے رہے لیکن جس امر پر وہ سب ہی متفق پائے جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک اقلیت اپنی خواہشیں اور مرضیاں ہر جائز اور ناجائز طریقے سے سوسائٹی کی اکثریت پر تھوپنے میں کامیاب رہی ہے۔ آج سول سوسائٹی ایک ایسا آلہ بن چکی ہے جس کے ذریعے دنیا کی یہ اقلیت "جس میں مغرب کے اقتصادی اور حکومتی افراد سر فہرست ہیں" اپنے تربیت شدہ یا مغرب کے دلدادہ افراد کے ذریعہ اپنی پالیسیوں اور اہداف کو لوگوں کی اکثریت اور نچلے طبقے پر زبردستی مسلط کر رہی ہے۔ عصر حاضر کی واحد بڑی طاقت ، یعنی امریکہ جیسے ممالک کا قومی حکومتی نظام ممکن ہے

بعض سیاسی، سماجی، اخلاقی، داخلی اور خارجی تبدیلیوں کی وجہ سے روبہ زوال ہو، اور اس میں گذشتہ دو عشروں میں ہونے والی تبدیلیوں نے دراڑیں پیدا کردی ہوں لیکن دنیا کی واحد سپر پاور ہونے کی حیثیت سے دوسروں پر تسلط اور برتری کی خواہش نہ صرف کم نہیں ہوئی بلکہ نام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس میں شدت بھی آ گئی ہے۔ امریکہ اس وقت اس کوشش میں ہے کہ دنیا میں اپنے کردار کو دوبارہ منوائے لیکن ہمیں امریکہ کی عالمی قیادت جو دوسرے ممالک پر تسلط اور برتری چاہتی ہے۔ اس چاہت میں اور قومیت اور قوم سے آگے کے نظام میں جو ابھی اپنی تشکیل کے مراحل سے گزر رہا ہے، میں فرق رکھنا ہوگا؛ بین الاقوامی سطح پر تیار ہونے والے جدید اقتصادی اور سماجی نظام، چیدہ افراد، اور مخصوص آئیڈیالوجی کی مالک مخصوص انتظامیہ کے ساتھ قومی نظام کے بنیادی ڈھانچے کی جگہ لے لیگا۔

مغرب میں "لیبرل ڈیموکریسی" کا نظریہ سترہویں صدی عیسوی سے لیکر بیسویں صدی عیسوی تک ایک ایسا اوزار تھا جو نئے سرمایہ دار طبقے کی نے پہلے سے موجود دو گروہوں کے خلاف استعمال کیا۔ ایک فیوڈل (جاگیردار) اور حکومت کا حامی طبقہ اور ان کے نظریات اور دوسرا طبقہ معاشرے کے اکثری حصہ جو ابھی تک جدید صنعتی سرمایہ کی طرف مائل نہیں ہوئے تھے۔ لیبرل ڈیموکریسی نے کلیسا سے گٹھ جوڑ رکھنے والے اشرافی (Aristocrat) قانون یعنی "خدادادی حقوق" کی جگہ "قانون فطرت" کو متعارف کرایا۔ اور پھر ان فطری حقوق کو سماج میں معاشرتی مفاھمتوں کا نام دے دیا۔ یہ سب نظریاتی، فلسفی اور مکتبی تبدیلیاں ایسے وقت میں انجام پائیں جب قرون وسطی کا اقتصاد بہت بڑے بڑے مبادلاتی بازاروں اور صنعتی تجارت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ان تبدیلیوں نے سوسائٹی میں مساوات اور قانونی برابری کو جنم دیا، فیوڈلزم کے خاتمے اور صنعتی دور کے آغاز کے ساتھ ہی مالکانہ حقوق دوسرے طبقوں تک پہنچے اور یوں خاندانی اور خدادادی طاقات رکھنے والی حکومت کی جگہ ایک ایسی حکومت نے لے لی جو سول قوانین اور فردی آزادیوں پر مبنی تھی۔

یہاں پر ایک بات کی طرف اشارہ کرتے جائیں کہ قرون وسطی سے لیکر سترہویں صدی تک یورپ اور عالم اسلام کے درمیان بہت واضح فرق پایا جاتا تھا۔ ایسے وقت میں جب اس دور کے اسلامی معاشروں کی بنیادیں فقہ اور شریعت کے جامع اور مضبوط ستونوں پر استوار تھیں اور کافی حد تک مشرق، جزیرہ نما اسپین اور میڈیٹرین جزائر کے اقتصادی اور سیاسی نظم اور انصرام کو بھی فقہ اور شریعت نے ہی سنبھالا ہوا تھا وہاں

یورپ میں ایسے کسی عدالتی نظام کہ جس میں افراد اور گروہوں کے معاشرہ میں حقوق کا تعین کیا جاسکتا ہو اس کی ابھی تک نشو و نما نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف سے عیسائی کلیسا کا حکومت اور فیوڈلزم سے اتحاد اور دوسری طرف سے شرعی و عرفی یا حتی کہ سول جامع قوانین کی عدم موجودگی یہ سب یورپ کی اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی ترقی میں بڑی رکاوٹ تھے۔ یورپی فیوڈلز اور اشرافی طبقہ جنہوں نے ایک مخصوص نظام قائم کر رکھا تھا، در حقیقت اس خطے میں سرمایہ داری اور آزاد خیالی کے سامنے دیوار بنے کھڑے تھے۔ اسی لیے تاریخ میں کبھی بھی یورپ جیسا فیوڈل اور اشرافیت کا نظام اسلام میں نہیں پایا گیا اور صنعتی سرمایہ داری سے پہلے یعنی تیرہویں صدی کے وسط تک عالمگیر اقتصادی نظام ایک عالمی سسٹم کے طور پر مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا جو اٹلی میں مڈیٹرین سواحل سے مشرق میں چین کی بندرگاہوں تک پھیلا ہوا تھا۔ کارل مارکس اور اس کے ہم فکر افراد نے جس طرح فیوڈلزم کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ ایک اقتصادی اور پیداواری نادر نظام ہے"، ایسا ہر گز نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس وقت کے مسیحی مذاہب، افکار اور فلسفہ سے مرکب یورپ کا ایک خاص اقتصادی اور سیاسی نظام شمار ہوتا تھا۔ سترہویں صدی میں یورپ میں فرد کی آزادی اور آزاد خیالی کے فروغ پر مبنی فلسفہ کے جدید مکاتب کا ظہور در حقیقت فیوڈلزم اور اس کی فرسودہ آئیڈیولوجی (جو یورپی ترقی میں رکاوٹ تھی) کا نظریاتی اور عملی رد عمل تھا۔ یورپ میں سول سوسائٹی کی اصل بنیادیں انہی فلسفی مکاتب سے حاصل شدہ قوانین تھے اور اسی آزاد خیالی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا عدالتی، سیاسی اور اقتصادی نظام تھا۔

سترہویں صدی میں یورپ کے ایک مفکر اور فلسفی، تھامس ھابز کی نظر میں دنیا اور سوسائٹی کی تشکیل، ایٹموں کے ایک مجموعہ کی مانند ہیں جن کا باہمی ارتباط صرفصرف بیرونی حد تک ہے اور سماجی نظریوں اور معاشرتی نظریات کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے سے علیحدہ رہنے والے افراد اقتصادی و تجارتی قانون مبادلات کے ذریعے ایک دوسرے سے مل جائیں اور ان کے آپس میں روابط کو ایک متولی کی نظارت کے تحت منظّم کیا گیا ہے جس کو حکومت کا نام دیا جاتا ہے؛ تا کہ ایک دوسرے کو تباہ کرنے اور نوچنے نہ لگیں اور یوں خصوصی مالکیت کا فطری حق بھی محفوظ ہو جائے گا۔ ہابز نے اپنی کتابوں میں آزادی کو ایک مکینکل جسمانی حرکت کے طور پر یاد کیا ہے۔ ہابز کی نظر میں افراد عام حالت سے سول سوسائٹی کی طرف منتقل ہونے سے پہلے مکمل طور پر آزاد ہیں۔ لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسی حالت میں کہ

جب نہ کوئی سوسائٹی ہو، نہ قانون اور نہ ہی کسی سیاسی اور معاشرتی ادارے کا وجود ہو؛ ایسی صورت میں یہ آزادی تباہی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ہابز کا نظریۂ اخلاق طاقت پر استوار ہے اور طاقت کو ایک ہتھیار کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے اور اس کی نظر میں، اقدار ایک قسم کی لین دین ہیں۔ اس کی کتاب "Leviathan" کے بنیادی موضوعات طاقت اور مادیات ہیں۔ (۱۴)

اٹھارویں صدی کی آزاد خیالی جو انقلاب فرانس کے ساتھ سامنے آئی نہ صرف سرمایہ داروں کے جدید طبقے کے لیے بلکہ سوسائٹی کی اکثریت اور نچلے طبقے کے افراد کے لیے بھی نئی آرزوئیں اور امیدیں لے کر آئی۔ لاک، بورک، میل، ڈوٹوکویل، وولٹر، روسو اور تمام مغربی جمہوری مفکرین کے آثار اور کتب کے گہرے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان سب کا نا صرف لوگوں کے حقوق، ان کی انفرادی اور اجتماعی آزادی اور سوسائٹی کی سطح پر آزادانہ رائے "General Opinion" سے سروکار نہیں تھا بلکہ یہ سب اس بات پر زیادہ زور دیتے تھے کہ ایک ایسا سیاسی نظام تشکیل دیا جائے جو لوگوں کی موافقت کے ساتھ بنیادی ترین آزادی (یعنی حق مالکیت اور آزاد بازاری) کو محفوظ بنا سکے۔ خیال رہے جب بھی لاک (اکثریت کی حکومت) کا نام لیتا تھا تو اس کی مراد صرف اور صرف مخصوص مالکان کا طبقہ تھا۔ لاک بھی ہابز کی طرح ایسے افراد کے لئے جو کسی پراپرٹی کے مالک نہیں ان کے سیاسی حقوق کا حامی اور طرفدار نہیں تھا۔

امریکہ کی آزادی کی جنگوں کے ایک عشرہ کے بعد جان ایڈمز کچھ یوں گویا ہوتا ہے:

"اِمراء اور دولتمند افراد کے حقوق کی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے جس کا آزادی کے ساتھ گہرا تعلق ہے، کیونکہ اگر ان افراد کے حقوق کی حفاظت نہ کی گئی تو یہ طبقہ فقیر ہو جائے گا اور ان کی جگہ پر چور اور لٹیرے دوسروں کا مال ہڑپنا شروع کر دیں گے جس سے نہ آزادی اور نہ ہی مالکانہ حقوق کی ضمانت دی جا سکتی ہے"۔ (۱۵)

ایڈمز کی نظر میں اِمراء اور وہ طبقہ جو آسودہ گھرانوں میں پرورش پا کر آگے آیا ہے، کسی نہ کسی صورت میں حکومت میں موجود رہنا چاہئے۔ امریکی مفکر اور سیاستدان جیمز ماڈیسن نے بہت عمدہ پیشگوئی کی کہ دولت مند اور برگزیدہ سیاستدانوں کی حکومت، عمومی حاکمیت کے ساتھ تضاد رکھتی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام انیسویں اور بیسویں صدی کے درمیان بحران کا شکار ہوگا۔

انیسویں صدی میں سرمایہ دار اور متوسط طبقہ کی ترقی و کامیابی، یورپ میں طوائف الملوکی اور جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ اور صنعتی شہروں کی طرف دیہاتیوں کی ایک بہت بڑی ہجرت اور اس کے نتیجہ میں ان کی آبادی میں اضافہ یہ سب مل کر ایک بہت بڑا خطرہ بن چکے تھے۔ سول سوسائٹی اپنی کارکردگی اور اقتصادی و سیاسی ماحول میں ہابز اور لاک کے افکار سے مغلوب تھی لیکن یورپ اور امریکہ کے آئندہ نسل کے مفکرین جیسے جرمی بنتھم، جیمز میل اور جان اسٹیورٹ میل کے لیے مغربی سول سوسائٹی کی مشکل سرمایہ دارانہ نظریات اور لوگوں کی عدل و مساوات پر مبنی خواہشوں کے درمیان پایا جانے والا اختلاف تھا جبکہ مغربی سول سوسائٹی کی کوشش تھی کہ مالکانہ حقوق اور انفرادی آزادی کو محفوظ رکھے۔(۱۶)

سول سوسائٹی کے بارے میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے مفکرین کی مشکلات کافی حد تک بیسویں صدی کے دانشور حضرات کی پریشانیوں سے مشابہ تھیں جیسے سیموئیل ہنٹنگٹن نے سہ طرفہ کمیشن کے لیے تیار کردہ اپنی رپورٹ میں "ڈیموکریسی کا بحران" کے عنوان سے واضح طور پر بیان کیا ہے، کہ اگرچہ سرمایہ داری کو لبرل ڈیموکریسی کے اصولوں سے ہی آئینی حیثیت حاصل ہوئی ہے لیکن "حد سے زیادہ ڈیموکریسی" کیپٹلزم کے لیے سنگین خطرہ بن چکی ہے۔

سول سوسائٹی کے مفہوم کے اندر اقتصاد، اقتصادی سرگرمیوں اور اس سے مربوط اداروں کے بہت سے وسیع پہلو موجود ہیں اور حسب ضابطہ اقتصاد اور اس سے مربوط ادارے سیاست اور حکومت سے بالکل الگ اور جدا ہیں اور مکمل طور پر ایک مغربی اور سرمایہ دارانہ ایجاد ہے۔ لیبرل ڈیموکریسی میں اقتصاد، سیاست سے الگ ہوتا ہے۔ یورپ میں سرمایہ داری سے پہلے کی سوسائٹیز میں اقتصادی تعلقات سماجی ڈھانچے کی بناپر ہوتے تھے اس لیے اقتصاد اپنا قدرتی سفر طے کرتے ہوئے سیاسی اور معاشرتی امور کے ساتھ مل گیا۔ سرمایہ داری کا ایک نظام کی شکل میں ظہور اور اس کی ترقی سے اس سماجی نظام میں تعادل برقرار نہیں رہ سکتا اور یوں اقتصاد، ایک سماجی نظام کے معیاروں سے باہر ہوجاتا ہے اور جیسا کہ مغربی مفکر کارل پولیانی (۱۷) اپنی ایک اہم کتاب "عظیم تحول و تبدل" میں لکھتا ہے کہ یہ بازار ہے جو کہ سیاسی و سماجی زندگی، منجملہ حکومت کی سرگرمیوں کو معین کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ کہنا کہ اقتصاد سیاست سے جدا ہے، یا یہ نظریہ کہ سیاسی سرگرمیاں، سیاسی سماج و حکومت میں اور اقتصادی سرگرمیاں سول سوسائٹی میں ہی انجام پاسکتی ہیں، ایک غلط اور نادرست دعویٰ ہے۔

گرامشی کا سول سوسائٹی اور ایک حاکم طبقہ کی صورت میں تسلط پسندی کے ظہور اور اسکی تائید (جو خود سول سوسائٹی سے ہی حاصل کی گئی ہے) کے بارے میں نظریہ، سرمایہ دارانہ نظام میں سیاست سے اقتصاد کی جدائی پر ہی مبنی ہے۔ گرامشی کی نظر میں یہ تسلط پسندی سول سوسائٹی میں ہی پوشیدہ ہے۔ جہاں اقتصاد ایک مخصوص شعبہ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ایسے نظام میں حکام کا طبقہ بالکل اس بات سے مستغنی ہو جاتا ہے کہ سیاسی امور اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالے اور سرمایہ دار حضرات جو اقتصادی شعبہ میں کام کر رہے ہیں یقینی طور پر سیاسی سوسائٹی اور حکومت (جن کا سول سوسائٹی سے کوئی تعلق نہیں) اس کی ذمہ داری سے بری ہیں، کیونکہ گرامشی کی نظر میں حکومت کے مفہوم کو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت، زیادہ وسعت ملتی ہے جو باضابطہ حکومتی نظام "سیاسی سوسائٹی" اور غیر حکومتی و مخصوص اقتصادی نظام "سول سوسائٹی" دونوں کو شامل ہے۔ اور چونکہ تسلط پسندی و برتری کو سرمایہ دارانہ نظام میں خاص مقام حاصل ہے اقتصادی ماہرین نہ خود حکومت کرتے ہیں اور نہ ہی یہ ذمہ داری سیاست باز افراد کو سونپتے ہیں۔ (۱۸) نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مغرب میں سرمایہ داری اور ڈیموکریسی کے درمیان واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ڈیموکریسی چاہتی ہے کہ سیاسی ماحول میں پیش ہونے والی خواہشوں کا عکس اقتصادی ماحول میں نظر آنا چاہئیے اور انتظامیہ ہمیشہ سرمایہ دارانہ نظام کے منافع کو مد نظر رکھے۔ سول سوسائٹی کا تناقض و تضاد اس میں ہے کہ اگرچہ مغرب میں ڈیموکریسی اور سرمایہ دارانہ نظام کا سورج ایک ہی وقت میں طلوع ہوا، لیکن اس وقت خود سرمایہ دارانہ نظام ڈیموکریسی کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا بیٹھا ہے۔ عوامی نمائندگی کی جگہ گنے چُنے افراد کی جمہوریت نے لے لی ہے، اور یہ محدود و منحصر ڈیموکریسی اب سول سوسائٹی کے عنوان کے تحت عالمگیریت کی جانب راغب ہو چکی ہے۔

عالمگیریت دو طریقوں سے بین الاقوامی سطح پر رائج ہوئی اور اس کا بنیادی مقصد مغربی دنیا کے اندر سول سوسائٹی اور جمہوریت کی ترویج تھا۔ (۱۹) پہلے مرحلے میں امریکہ سمیت مغربی ممالک نے اعطائے جمہوریت جیسے قومی اداروں کی بنیاد رکھی۔ مثال کے طور پر انگلینڈ میں ویسٹ منسٹر فاؤنڈیشن جیسے نیم سرکاری ادارے، حکومت کینیڈا میں "بین الاقوامی مرکز برائے انسانی حقوق و جمہوری ترقی" کا مرکز اور اس کے علاوہ جرمنی، جاپان اور سویڈن نے بھی اسی سے ملتی جلتی فاونڈیشنز بنائیں جن کے اصلی مقاصد دوسرے ممالک میں موجود سیاسی ماحول میں تبدیلی لانا، ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ میں مداخلت اور انسانی

حقوق اور جمہوریت کی ترویج ہے۔ دوسرے مرحلہ میں بین الاقوامی سرکاری و غیر سرکاری اداروں جیسے اقوام متحدہ، ورلڈ بینک، یونیسکو و غیرہ۔۔۔ کی کارکردگی تھی۔ اس کارکردگی کی وجہ سے گذشتہ دو عشروں میں ڈیموکریسی، سول سوسائٹی اور انسانی حقوق میں خصوصی طور پر کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں اور ان اداروں کی اس میدان میں ہونے والی سرگرمیوں میں بھی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ امید کی جارہی ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز میں ان بین الاقوامی اداروں کی کارکردگی کا مغرب میں وسعت پانے والے نظریات اور منصوبوں کی پشت پناہی کرتے ہوئے امریکہ اور یورپ کی سیاسی ترقی میں خاطر خواہ عمل دخل نظر آئے گا۔

امریکہ کی جانب سے بین الاقوامی سرکردہ افراد کی سربراہی میں ڈیموکریسی کی ترویج کی گئی۔ اس ترقی یافتہ ڈیموکریسی کا نئے عالمی نظام اور اس پھیلاؤ کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ امریکہ کا نظام ایک قومی حکومت سے وجود میں آنے والا آخری سلطنتی نظام ہے جو اس وقت چل رہا ہے۔ اقتصاد، رسد اور کام کے عالمگیر ہونے کی وجہ سے خاص حکومت، خاص قوم یا ایک خاص قومی حکومت کے مفہوم کے سامنے سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عالمی نظام سے وابستہ ہوئے بغیر ان کی کارکردگی کو محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ جس طرح آج گلوبلائزیشن کے دباؤ کی وجہ اقتصاد میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، اسی طرح عالمی سرمایہ دارانہ نظام بھی اس کوشش میں ہے کہ گذشتہ چند عشروں میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات کے ساتھ منطبق بنیادی اور سیاسی تبدیلیاں لائے۔ قومی نظام اور حکومتیں تو باقی ہیں لیکن ان کی طاقت میں کمی آچکی ہے وہ جغرافیائی اکائیاں جن کے پاس قومی حاکمیت ہوا کرتی تھی اب آج کی گلوبل اقتصادی اکائیوں میں تبدیل ہوچکی ہیں۔ سیاسی اقتدار طلبی اب سماجی اقتدار طلبی میں تبدیل ہورہی ہے اور مغرب میں زیر بحث ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی اس کوشش میں ہے کہ وہ اس میں اپنا کلیدی کردار ادا کرے۔ گذشتہ دو صدیوں میں عالمی نظام کا بنیادی ڈھانچہ فوجی، اقتصادی سیاسی اور کسی حد تک تہذیبی تعلقات پر استوار رہا ہے۔ قومی حکومتوں نے اپنی ملکی اور غیر ملکی منصوبہ بندیوں کی بنیاد انہیں روابط اور تعلقات پر رکھتے ہوئے، اپنے قومی، علاقائی اور بین الاقوامی مفادات کی تعیین کی ہے۔ ان بین الاقوامی اور عالمی تعلقات میں متعدد تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جو کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے کافی واضح ہیں۔ جن میں اقتصادی عالمگیریت اور کام اور سرمایہ کی سرحدوں سے پار منتقلی ایک اہم تبدیلی ہے۔ لیکن

میری نظر میں عالمی نظام کے بنیادی ڈھانچے میں جو بنیادی تبدیلی ہونے جارہی ہے اور جس پر نسبتاً کمتر بحث ہوئی ہے وہ معاشرتی و سماجی تعلقات ہیں۔آج کی اصلی عالمگیر طاقتیں اور عالمی کھلاڑی جو ایک نظام کے مکمل طور پر نئے ڈھانچے کے درپے ہیں، انہوں نے سابق عالمی نظام کی پَرتوں پر اس جدید پَرت کا اضافہ کر دیا ہے۔اس طبقے کے منصوبوں کے عین مطابق سماجی تعلقات کے جدید ڈھانچہ میں نئی تسلط پسندی اور برتری کی خواہش کو پروان چڑھایا جارہا ہے۔ جدید سوشلسٹ ماڈرنائزیشن درحقیقت جدید لبرلزم ہی ہے جو ایک عشرہ سے سول سوسائٹی اور جدید سیاسی ترقی کو لبرل ڈیموکریسی کی شکل میں چلا رہا ہے۔

ایک صدی تک سیاسی اور جغرافیائی سرحدیں پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے بعد بڑی طاقتوں کے بنائے ہوئے بین الاقوامی قوانین اور قومی حاکمیت کے منشور کے ماتحت تھیں جو دنیا پر حاکم نظام کے پسندیدہ اور مطلوبہ امن و امان کی حفاظت میں ناکام رہا ہے۔ان بڑی طاقتوں نے نہ صرف قومی حاکمیت اور جغرافیائی سرحدوں کی حرمت کی پامالی کی ہے بلکہ بہت سے مواقع پر ان کو بالکل ختم کر دیا ہے بلکہ جدید ٹیکنالوجی، نئے نئے آلات کی ایجاد نے دوسروں کے سیاسی اور فوجی معاملات میں مداخلت کو بہت آسان کر دیا ہے۔ انڈسٹریل اور میٹا انڈسٹریل ماڈرنائزیشن، آزاد تجارت، امن عامہ، آزادی و خود مختاری اور رفاہ عامہ جیسے سیاسی اور اقتصادی تعلقات بھی بین الاقوامی نظام کے مطلوبہ امن کو حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ روس کی تقسیم اور نظریہ لبرلزم (اپنے کلاسیکل اور قدیمی معنی میں) میں تنزلزل کے ساتھ ساتھ اقتصاد اور سیاست کے مختلف مرکزی شعبوں کو زبردست نقصان پہنچا۔انقلاب، اعتراضات، تحریکیں حتی گذشتہ دو عشروں میں رونما ہونے والے تسلط پسند نظاموں کے خلاف انقلابات میں معاشرتی و سماجی پہلو سے کہیں زیادہ نظر آتا ہے۔ درحقیقت سیاسی، اقتصادی، تہذیبی اور ماحولیاتی حقوق کے سلسلے میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والی سب عوامی تحریکوں میں سماجی پہلو پائے جاتے ہیں۔ موجودہ عالمی نظام ان تحریکوں سے مقابلہ کی سکت نہیں رکھتا۔ مغرب کی زیر سرپرستی اقتصادی گلوبلائزیشن کی اندر بہت سے اختلاف پیدا ہوئے ہیں۔ایک طرف بین الاقوامی اقتصادی اور سیاسی کھلاڑیوں کے ایک ایسے نظام کی تشکیل کے لیے گٹھ جوڑ جس میں ان سب کے مفادات شامل ہوں اس میں اضافہ ہوا ہے اس سے خود یورپ اور امریکہ میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی ہے کہ آیندہ عالمی سطح کے اختلافات اور لڑائیوں میں کمی پیدا ہو گی دوسری طرف سماجی حوالے سے اس گلوبلائزیشن نے انفرادی، اجتماعی اور قومی سطح پر انتشار پیدا کیا ہے۔اس

طرح یہ مغرب میں حاکم سرمایہ دارانہ نظام کے لیے خطرے کی گھنٹی بھی ہے۔ یہ وہ عظیم مشکل اور معمہ ہے جس سے مغربی "ماہرین" تازہ تازہ مطلع ہوئے ہیں۔ جدید لبرلزم اس کوشش میں ہے کہ گروہوں اور اقوام میں نفوذ پیدا کرکے اس شگاف میں ترامیم کرے، جدید سماجی نظریات کے تحت اس پر تجدید نظر کرے اور عوام اور برگزیدہ افراد کے درمیان اور خاص طور پر خود برگزیدہ افراد کے درمیان موافقت پیدا کرے۔

آج کی تسلط پسندی اور برتری میں انسانی اور سماجی پہلو کافی وسیع ہے اور بہت حد تک سوچوں کے برتری مد نظر ہے جبکہ اس میں سیاسی، اقتصادی اور عسکری پہلو نہیں ہیں۔ اس قسم کی برتری کا اقتصادی، سیاسی اور ٹیکنالوجی کی بنیادوں پر استوار تسلط پسندی اور برتری سے مقابلہ ہر گز نتیجہ خیز نہیں ہوگا بلکہ اس سے سوسائٹی میں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ تسلط پسندی اور برتری کے خلاف جنگ میں سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری مطلوبہ سوسائٹی کس قسم کی ہونی چاہئے؟

سوسائٹی کا حقیقی معنی نہ آزادی اور خود مختاری میں پایا جاتا ہے اور نہ ہی امن و امان میں اور نہ ہی ان امیدوں اور آرزؤں میں پایا جاتا ہے جن کا جدید لبرلزم، اپنے مفاہیم، پروگرامز، نظریات اور طریقۂ کار سے تقاضا کرتی ہے۔ ہمیں آزادی، خود مختاری اور حقیقی نجات کی تعریف، جدید لبرلزم کی بیان کردہ تعریف سے ہٹ کر کرنا ہوگی اور اس پر عمل کرنا ہوگا۔ تسلط پسندی کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک قومیت سے بالاتر اور رنگ و نسل، نیشلزم اور قومی مفادات سے باہر ہونی چاہئے۔ تسلط پسندی اور عالمی برتری کو صرف سماجی مفاہیم، نظریات اور پروگراموں کے ذریعے جو کہ خود عالمی نگاہ رکھتے ہیں اُن کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور اس سے مقابلے کا واحد راستہ مکمل مادی و معنوی عالمی ترجیحات ہے جس سے مغربی دنیا فی الحال خالی ہے۔ اس قسم کی گلوبلائزیشن کے لیے جو تسلط پسندی سے برسر پیکار ہوگی اور اس پر غلبہ حاصل کرے گی ضروری ہے کہ "نچلی سطح" سے شروع ہو نہ کہ "اوپر والی سطح" سے۔ اس قسم کی تسلط پسند مخالف گلوبلائزیشن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ عوامی قیادت کے اصلی نظام کے معنی کو معین اور بخوبی تشریح کرے۔ اس قسم کی تحریکوں میں ضروری ہے کہ یہ اپنی انفرادی اور گروہی اتحاد کو محفوظ رکھیں اور آج کے سیاسی، اقتصادی اور ٹیکنالوجی والے نظام کے نتیجہ میں سماجی انتشار سے دور رہیں۔ اُلجھاؤ، گھبراہٹ اور انتشار مغربی سول سوسائٹی کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ظلم، نا امنی، شدت پسندی، خاندانی انتشار،

آیسولیشزم "Isolationism" انزوا پسندی اور نشہ، اب قومی اور عالمی سطح پر عام ہو چکے ہیں جو آج کے سرمایہ دارانہ نظام کو متزلزل کر رہے ہیں۔ عالمی اقتصادی، سیاسی اور ٹیکنالوجیک نظام کے سر کردہ افراد کے پروگراموں اور چالوں نے بے جا استعمال کے کلچر کے فروغ اور صنعتی مصنوعات کی چکاچوند سے دنیا کو مادی اور معنوی افلاس سے دوچار کر دیا ہے۔ اس انحطاطی کلچر کی وجہ سے خود مغربی امیر ممالک کے باشندے بھی ناامن زندگی گزارنے اور اپنے بنائے ہوئے موجودہ نظام کے اندر رہ کر نظام کی حفاظت پر مجبور ہیں۔ (۲۰) مثال کے طور پر امریکہ جو دنیا میں جمہوریت کے فروغ پر زور دے رہا ہے ایمنسٹی انٹر نیشنل کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں انسانی حقوق کی پامالی کے تناسب میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔ گذشتہ عشرے میں امریکہ کی جیلوں میں موجود قیدیوں کی تعداد دُگنی ہو چکی ہے۔ امریکی سابق صدر بل کلنٹن کی کابینہ کے رکن اور سابق وزیر محنت رابرٹ ریش نے ایک رپورٹ پیش کی جس میں کہا گیا۔

"ملک میں پرائیویٹ محافظین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اس وقت (۱۹۹۰ عیسوی) میں امریکہ میں موجود افرادی قوت کا ۳ فیصد اعلیٰ شخصیات کے پرسنل سیکیورٹی گارڈز پر مشتمل ہے"

امریکہ میں گذشتہ دو عشروں میں سیکیورٹی گارڈز رکھنے والوں کی تعداد دوگنی ہو چکی ہے۔ حتی کہ ان کی تعداد ریاستی، قومی اور ضلعی پولیس سے بھی زیادہ ہے۔ لاطینی امریکہ میں گذشتہ عشرے میں "خطِ غربت" سے بھی نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد میں ۴۴ فیصد اضافہ ہوا ہے جو پورے لاطینی امریکہ کی نصف آبادی پر مشتمل ہے۔ ۱۹۹۰ کی دہائی میں پوری دنیا میں "اغوا" جیسا جرم بڑھا جو سب سے زیادہ جنوبی امریکہ میں دیکھنے میں آیا۔ ۱۹۹۰ کے عشرے کے اوائل میں امریکی سیاست میں جب " Conservative Extremist" افراد اس وقت کے صدر بل کلنٹن پر اعتراضات کر رہے تھے تو اس وقت کے معروف اور آج کے گمنام رہنما "نوٹ گینگر یچ؛ نے امریکہ میں سول سوسائٹی اور جمہوریت کے احیا کے لیے اپنے افکار کو اپنی کتاب "Agreement with America" میں تشریح کی۔ گینگر یچ جو امریکی کانگریس کے نمائندوں کے حوالے سے جمہوریت پسند افراد کی قیادت بھی کر چکا تھا کچھ ہی سالوں بعد اپنے ہی پارلمانی اور سیاسی ساتھیوں کی طرف سے بعض غیر اخلاقی اور غیر قانونی اقدامات کے الزام میں احتساب کا نشانہ بنا اور کنارہ کشی پر مجبور ہو گیا۔ اس وقت سے لیکر آج تک امریکہ کی فیڈرل گورنمنٹ نے پرائیوٹ شعبہ کے بجٹ میں کمی کر دی ہے حتی کہ بعض متعلقہ افراد اور صاحب نظر افراد کا ماننا ہے کہ امریکہ کی سول سوسائٹی میں اہم

کردار ادا کرنے والے پرائیوٹ اداروں نیشنل آرگنائزیشنز میں کمی کسی بحران سے کم نہیں۔ایک مطالعاتی و تحقیقاتی منصوبے کے مطابق "سوشل انشورنس اور رفاہ کی کثرت پسندی کے بحران" نے امریکی سماج میں موجود (Voluntarion) رضاکارانہ خیراتی اداروں کے تنوع کے سامنے سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔(۲۱) جبکہ اسی وقت مرکزی اور مشرقی یورپ اور تیسری دنیا کے ممالک کے لئے سماجی شعبوں میں فعال امریکہ کے پرائیوٹ اداروں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ان میں سے بعض ادارے اور ایسوسیشنز کو "ترقی"، "سول سوسائٹی" اور "پارٹنرشپ" جیسے منصوبوں میں امریکی حکومت کی بیرونی امداد بھی حاصل ہے۔(۲۲)

سول سوسائٹی کے بارے میں سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر سول سوسائٹی استبدادی و غیر عوامی حکومتوں کو کمزور اور ختم کرنے میں موثر رہی ہے تو کیا اس سلسلے میں اس سے مدد لی جا سکتی ہے؟ کیوں نہ سول سوسائٹی کو کسی کمزور حکومت کو گرانے کے لئے استعمال کیا جائے؟اسی چیز نے سول سوسائٹی کے آثار کو پسند کرنے والے افراد کے لیے ایک معمہ اور تضاد کھڑا کر دیا ہے۔ بالکل یہی وہ جگہ ہے جہاں سول سوسائٹی کو پرکھنے میں تہذیبی عوامل بہت ضروری ہیں اور جہاں ہمارے نظریات میں سیاست کو بطور طاقت دیکھنے کے بجائے سیاست کو بطور تہذیبی سرگرمیوں کے لیے پیش خیمہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا باب

مغرب مطلوبہ سوسائٹی کی تلاش میں

سول سوسائٹی اور اس کے اثرات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے سوسائٹی کے مفہوم اور مغربی تمدن کی مطلوبہ سوسائٹی کی تلاش کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ درحقیقت مغرب کے سوسائٹی کے سلسلے میں افکار کی تاریخ وہی ان کی تاریخ فلسفہ اور سیاسی و سماجی افکار ہی ہیں۔ صدیوں سے مغرب کے سیاسی و سماجی فلسفے دو موضوعات پر مشتمل ہیں؛ سوسائٹی اور لیڈرشپ۔ ایک سوسائٹی معدوم ہوئی تو دوسری اپیدا ہو گئی، ایک قیادت گئی تو دوسری قیادت میدان میں کود پڑی۔ جیسا کہ ہم بارہا ذکر کر چکے ہیں کہ اگر سوسائٹی یا سوسائٹی کے متعلق تحقیق مغرب کے سماجی فلسفہ کا جوہر ہے تو اس کے دوسری طرف سوسائٹیز کے درمیان تصادم اور سماجی اختلافات بھی موجود ہیں۔ سول سوسائٹی کا مفہوم جس کے بارے میں ہم آنے والے باب میں بات کریں گے، مغرب میں مناسب اور مطلوبہ سوسائٹی کے حصول کے لیے ایک دوسری کوشش تھی، تاکہ حکومت اور افراد کے حقوق کو بڑی وضاحت کے ساتھ جدا کیا جائے۔

قرون وسطیٰ بالخصوص سینٹ بینڈیکٹ (۲۳) اور سر تھامس مور (۲۴) کی تحریروں سے لے کر اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مفکرین جیسے پروڈون (۲۵)، کارل مارکس (۲۶)، ایلکس ڈوٹوکویل (۲۷) اور دوسرے مفکرین کے سیاسی و سماجی کارناموں تک، ان میں سوسائٹی کے موضوع کو موجود ہونا، انسان اور طبیعی دنیا کے اور اسی طرح مختلف گروہوں کا آپس میں اور قدرتی واقعات کے درمیان تعلقات کی موجودگی کی تائید حاصل رہی ہے۔ یہ موضوع سوسائٹی کے سیاسی، ٹیکنالوجی، بیوروکریٹک حتی کہ اکولوژی اور حیاتیاتی پہلوؤں سے بحث کرتا ہے اور چند پارٹیوں پر مشتمل نظام پر ہی مرکوز تھا لیکن ہمیشہ انسانی سرگرمیوں کی مختلف شکلوں میں ایک یونٹ ہونے کے ناطے، موجود رابطے کو سمجھنے میں ناکام رہا ہے۔ فوجی، سیاسی، اقتصادی، بیوروکریٹک اور فکری امور سب کے سب ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں اور کسی ایک پر کاربند ہونا دوسرے امور میں سماجی اور معاشرتی اختلاف اور تنازع کا موجب ہے۔ سوسائٹیز کو دین یا سیاست جیسے امور سے یاد کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر مغرب میں سول سوسائٹی کا موضوع ایک حد تک سیاسی سوسائٹی

کے کافی نہ ہونے کا رد عمل تھا جو ہم آگوسٹائن (۲۸)، آکویناس (۲۹)، لوٹر (۳۰)، جان کیلون (۳۱) اور سورن کگارڈ (۳۲) جیسے مفکرین کے آثار میں دیکھ سکتے ہیں۔

اگر طاقت کی مرکزی حیثیت سیاست میں ہی منحر ہو جائے تو جدید علمی ایجادات بھی اکنامکس اور رسدِ مال کے محتاج ہو جائیں گے۔ مغرب میں بھی انہی دو کے مرکب جسے سیاسی اقتصاد کہا جاتا ہے، نے انقلاب کا بیج بویا اور یہ ایسا موضوع ہے جس پر مغربی تمدن کے انقلابی سماجوں میں بحث ہو سکتی ہے۔ سول سوسائٹی کا مفہوم مغرب میں صنعتی دور سے مربوط سوسائٹیز کے مجموعے کا آخری تحریری حصہ ہے اور جو سول سوسائٹی کا مفہوم ہیگل کے سیاسی فلسفہ کی تکمیل کرتا ہے۔ پچھلے کچھ عشروں سے انفارمیشنل سوسائٹی کا موضوع، برتر صنعتی سوسائٹی "Super Industrial Society" کے لیے تمہید بن چکا ہے اور آج کل مغربی سول سوسائٹی اپنے آپ کو اس جدید انفارمیشنل سوسائٹی میں ڈھونڈ رہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ افلاطون کی سیاسی سوسائٹی سے لے کر ہابز، لاک اور روسو کی سیاسی سوسائٹی تک، مغربی تمدن ایک مطلوبہ اور بعض اوقات آئیڈیل سوسائٹی کی پیہم تلاش میں ہے، لیکن ایک مدت سے مغربی سوسائٹیوں میں سے اس آئیڈیل پہلو کو نکال دیا گیا ہے اور آج دنیا کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات کے تحت علاقائی سوسائٹی (یورپین سوسائٹی)، جنسیتی سوسائٹی (فیمنسٹس)"، جوانوں کی سوسائٹی حتی کمپیوٹر نیٹ ورک سے تشکیل پانے والی سائبر سوسائٹیز کے بارے میں بات کی جارہی ہے۔ گذشتہ صدی میں سوسائٹی کے مفہوم نے مغربی ممالک میں اور اپنے روزمرہ کے ٹیکنکل استعمال میں ایک خاص جغرافیائی جہت بنالی ہے، مثال کے طور پر امریکہ میں سوسائٹی کا لفظ زیادہ تر چھوٹے علاقائی اجتماعات کے لیے استعمال ہوتا ہے، نہ کہ پوری امریکن سوسائٹی کے نظام کے لئے، کیونکہ امریکی اپنے نظام کو زیادہ تر "یونائیٹڈ اسٹیٹس" یا "امریکن قوم" سے جانتے ہیں۔ یورپی ممالک میں ملت اور قوم کا مفہوم سوسائٹی میں مکمل طور پر پایا جاتا ہے اور صرف گذشتہ کچھ عشروں سے "یورپی سوسائٹی" اور "سول سوسائٹی" کے الفاظ آزاد خیال طبقے اور کچھ حد تک عوام میں رائج ہوئے ہیں۔

اگر یونان اور بحیرۂ روم کو یورپ کا حصہ مانا جائے تو عظیم معاشروں کی تشکیل کے لیے سب سے پہلے یہیں سے کوشش ہوئی۔ موروثی رشتہ داری کی بنیاد پر بننے والے معاشروں کے خاتمہ کے ساتھ ہی بحیرۂ روم اور قدیمی یونان میں پہلی بار تین قسم کے معاشرتی نظام وجود میں آئے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی

مخصوص طرز فکر کا حامل تھا۔ فوجی معاشرہ، سیاسی معاشرہ اور پھر دینی معاشرہ؛ جو کہ مسیحی معاشرہ کے نام سے معروف تھا۔ مغرب میں خاندانی سوسائٹی کے سقوط کی بنیادی وجہ جنگ تھی۔ تمام تہذیبوں میں سے مغربی تہذیب و تمدن سب سے زیادہ جنگ جو، فوج پر منحصر اور البتہ ثقافت ساز تمدن رہا ہے۔ لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ ہم مغربی تمدن کے تہذیبی، ہنری، علمی یا دینی پہلوؤں کا انکار کر رہے ہیں، بلکہ ہم اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ جس کا اکثر مغربی مورخین اور مفکرین نے بھی اقرار کیا ہے کہ مغربی تمدن کے عوامل میں سے موثرترین عامل جنگ، فوجی اقدار اور جنگی اختلافات رہے ہیں۔ گذشتہ تین ہزار سال کے عرصہ میں ہونے والی جنگوں، جانی نقصانات، جنگ کے نتیجہ میں ہونے والے نقصانات، ان جنگوں میں شریک ملکوں اور اس کے نتیجہ میں نئی بننے اور ٹوٹنے والی حکومتوں کی تعداد سے پتہ چلتا ہے کہ اس چیز میں دوسری تہذیبوں کی نسبت مغربی تمدن کئی ہاتھ آگے رہا ہے، اور خود مغرب کا سیاسی و سماجی فلسفہ بھی اسی جنگ اور فوجی اقدامات کی پیدائش ہے۔ پانچ سو سال قبل از مسیح میں جب ایک طرف یونان اور قدیمی ایران میں جنگ چل رہی تھی، تو دوسری طرف یونان کے معاشرہ میں طبقات اور رشتہ داری پر مبنی سوسائٹی کا خاتمہ اور سیاسی شہریتی سوسائٹی کا آغاز ہو رہا تھا۔ عین اس موقع پر کلیسٹن جیسے مفکرین معاشرے میں انقلابی اصطلاحات کو پیش کر رہے تھے۔ تقریباً قبل از مسیح پانچویں صدی کے آخر میں یونانیوں کی اسپارٹا کے ساتھ جنگ اور پھر شکست کے موقع پر ہی مغرب کے عظیم مفکر افلاطون نے سیاسی اور فوجی اقدار سے بھری شہرہ آفاق کتاب "جمہوریت" لکھی۔ رومیوں کا مشہور "قانون"، ان کا سب سے عظیم سیاسی اور حقوقی ورثہ ہے جو انھوں نے مغرب کے سیاسی فلسفہ کی تاریخ میں چھوڑا ہے۔ اس قانون نے ایسے وقت میں اپنے تکامل کی منزلیں طے کیں جب رومی اپنے آپریشنز اور جنگی اُمور کو منظّم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

مغرب میں قرون وسطی سے لیکر آج تک کی تاریخ کے عظیم مفکرین کی عمرانیات اور سوسائٹیز کے بارے میں نظریات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہو جو جنگی پہلوؤں، جنگ کے آثار اور اس سے متعلق اقدار سے خالی ہو۔ یورپی معاشرے میں جنگوں اور لڑائیوں کے نتیجے میں ان مفکرین کی سیاسی اور سماجی سوچ میں بھی تبدیلی آتی رہی۔ مغربی مفکرین میں میکیاولی، ہابز، روسو، مارکس، انگلس اور لینن کی تحریریں جنگ کے حوادث اور اقدار سے مربوط رہی ہیں۔ مغرب میں آنے والے انقلاب

ہی نہیں بلکہ مغربی تمدن میں مختلف معاشروں کی تشکیل بھی مقامی، علاقائی اور براعظمی جنگوں کے بعد ہی ہوئی ہے۔ براعظم یورپ اور امریکہ میں نئے معاشرے ہمیشہ جنگ کے بعد اور جنگ کے نتیجے میں ایجاد ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان کا سقوط بھی جنگوں کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ امریکہ گذشتہ تین صدیوں سے، باقی ملکوں سے نسبتاً زیادہ جنگوں میں شریک رہا ہے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ ہو یا امریکہ کی میکسیکو سے لڑائی، امریکہ کی اندرونی لڑائیاں ہوں یا کوریا اور ویتنام کی جنگ حتی کہ خلیج فارس کی جنگ، ان سب میں امریکہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ ملوث رہا ہے اور مسلسل کوشش میں رہا ہے کہ اپنی سیاسی اور اقتصادی سوسائٹی کے مفہوم اور اقدار کی تشریح کرسکے۔ مغربی تمدن کی پوری تاریخ میں جس طرح سے جنگ، خاندانی معاشروں کے خاتمہ کا سبب بنی ہے بالکل اسی طرح امریکہ اور یورپ کی بیوروکریسی و تہذیب کے تحت جنگ اور عسکری ادارے بھی مغربی سوسائٹیز کے ارتباط کا اہم ترین عامل ثابت ہوئے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ اور روس کے ساتھ سرد جنگ نے ایک تو امریکہ کو اقتصادی بحران سے نکالا اور دوسرا مغربی سوسائٹیز کو سیاسی دھڑے بندیوں سے محفوظ رکھا۔ امریکہ کی پوری تاریخ میں جنگ اور حقیقی یا فرضی دشمن کے مقابلے میں دفاع سیاسی اور اقتصادی حکمت عملی کا سب سے بڑا عامل رہا ہے۔ اور امریکی سیاسی سماج میں وحدت واتحاد کے تحفظ میں بنیادی مقام رکھتا ہے۔

مغربی تمدن کے پہلے نمونوں اور تاریخ یورپ میں سب سے پہلے ظہور کرنے والے معاشروں کو دیکھنے کے لئے عسکری سوسائٹی کی اپنی ہی خصوصیات ہیں جن کا کلازویتز (۳۳)، مکیاولی (۳۴)، مارکس (۳۵) اور لینن (۳۶) کی تالیفات میں بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کی خصوصیات یہ ہیں۔ ۱۔ تشدد، ۲۔ جوانی ۳۔ انفرادیت یا انفرادیت پسندی ۴۔ مرکزیت ۵۔ رقابت ۶۔ پیمان اور قراردادیں ۷۔ دنیاوی یا سیکولر ہونا ۸۔ نظم اور ۱۰ سماجی رجحان۔

مغرب میں خاندانی سوسائٹی سے عسکری سوسائٹی یا سماج کی طرف ارتقائی سفر درحقیقت فرد کی محدود خاندانی فضا سے وفاداری عسکری سرگرمیوں اور باہمی رابطہ جماعت کی طرف تبدیلی سے شروع ہوا۔ جنگ، تصادم اور اختلافات سے پیدا ہونے والے روابط اور آثار، صدیوں سے مغربی مفکرین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں اور بیسویں صدی کے ایک ماہر عمرانیات جارج سمل (۳۷) نے اپنی کتاب میں اس موضوع پر بہت تاکید کی ہے۔ ایک عسکری سوسائٹی میں تشدد و خشونت اپنی مختلف صورتوں میں قانونی حیثیت اختیار کر

لیتی ہے۔ مغربی سوسائٹیز میں تشدد ایک ایسا انقلابی آلہ اور مختلف سیاسی و اقتصادی اہداف تک رسائی کا وسیلہ ہے جو کہ ان سوسائٹیز میں زیادہ وسعت کے ساتھ واضح ہوتا ہے۔ شباب و جوانی عسکری سوسائٹی کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک ہے۔ افلاطون سے لیکر آج تک کے تمام مغربی صاحب نظر افراد کی کتابوں میں جوانی کو ترجیح اور اس پر تاکید بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔

جوانی اور ورزش، جوانی اور جنگ، جوانی اور تجارتی سوجھ بوجھ اور جوانی اور تشدد ایسے موضوعات ہیں جو مغربی عمرانیات اور سوشیالوجی کے اہم ترین موضوعات ہیں۔(۳۸) ایک عسکری سوسائٹی میں چونکہ فردیت ایک انسان کی ذاتی شجاعت یا افراد کی خودی کے دائرے میں پائی جاتی ہے اور انسان کو خاندانی سوسائٹی سے کسی حد تک الگ کردیتی ہے، معاشرہ میں مرکزیت، رقابت اور عسکری قوانین اس شخص کو عسکری بیوروکریسی میں شامل کرکے اس کی زندگی کو نئے طریقے سے ترتیب دیتے ہیں۔ اور عسکری ادارے ایک نئے سوشلزم کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ ایک ایسا سماج جس کا خاندانی سوسائٹی میں کوئی وجود نہیں اور یوں مغربی سوسائٹی میں فرد کی اصلی سوچ، عسکری نظر بن جاتی ہے۔ عسکری سوسائٹی ایک سیکولر سوسائٹی ہوتی ہے۔ صرف ایک مسیحیت کا دور تھا جہاں مغرب میں دین اور جنگی یا عسکری کاروائی آپس میں متحد تھے، ورنہ یورپ کی ابتدائی عسکری سوسائٹیز اور موجودہ نظام جن میں فوج ایک اہم کردار ادا کرتی ہے ان میں سیاست اور دین میں جدائی کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عسکری سوسائٹی ایک ایسی سوسائٹی ہو جس میں سیاست، رشتہ داری، اقتصاد اور مذہب موجود نہ ہوں بلکہ یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس میں عسکری خصوصیات معاشرہ پر مسلط رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر عسکری سوسائٹی کے اصلی اہداف میں سے ایک ہدف، نئی سرزمینوں اور جدید سیاسی و جغرافیائی سرحدوں پر قبضہ کرنا ہے۔ اسی لیے قدیم مغربی تاریخ میں عسکری تہذیب اور معاشروں کے درمیان اختلافات کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب، موروثی اور خاندانی اصول تھے۔ سیاسی سماج یا سوسائٹی میں افراد شہریت اور سیاسی نظام کی پاسداری پر زور دیتے ہیں اور موروثی سوسائٹی میں یہی افراد خونی و نسلی پہچان پر زور دیتے اور فخر کرتے ہیں جبکہ ایک عسکری سماج میں مذکورہ بالا خصوصیات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ گذشتہ دو صدیوں میں مغرب بالخصوص یورپ کی سامراجی طاقتوں جن میں فرانس اور بیلجیئم نے جدید سرزمینوں جیسے افریقہ میں کانگو، ایشیاء میں ہندوستان اور چین پر قبضہ کرنے کیلئے ان کے موروثی اور قبائلی معاشروں کے ساتھ مقابلے میں عسکری

سرگرمیوں سے بہت استفادہ کیا ہے۔ یورپیوں (فرانسیسی اور بیلجینز) نے عسکری سوسائٹی کے قیام کے ساتھ افریقی اور ایشیائی سرزمینوں پر قبضہ کیا تا کہ زیادہ سے زیادہ ان بیرونی ممالک میں اپنے تسلط کو برقرار رکھ سکیں۔ سب سے بنیادی اور پہلا اختلاف جو یورپیوں اور مقامی افراد کے درمیان رہا ہے وہ ان براعظموں کے مخصوص خاندانی اور قبائلی معاشروں کے عسکری نظام اور فوجی اداروں کا ٹکراؤ ہے۔ جبکہ اہل ہند و چین نے اپنے قدیمی نظام پر باقی رہتے ہوئے فرانسیسوں کے جدید عسکری اداروں کی آگاہی حاصل کی اور اپنی آزادی کے حصول کے لیے اس کو یورپی طاقت کے خلاف استعمال کیا۔ کانگو میں قبائلی و موروثی سوسائٹی نے بیلجین عسکری اداروں سے کہیں بھی فائدہ نہیں اٹھایا اور اہل افریقہ دوسری عالمی جنگ کے کافی عرصہ بعد تک سامراج کے خلاف بیلجین عسکری اداروں سے صحیح استفادہ کرنے میں ناکام رہے۔ ویتنام، چین اور کیوبا کی فوجی اور گوریلا جنگیں خود مغرب کے عسکری اور سوشل اداروں کا نمونہ تھیں جو اس مرتبہ مغرب کی تسلط پسندی کے خلاف استعمال ہوئیں۔

موروثی سماج میں سلطنت روم کی بنیادی جڑیں "پاٹریا پاٹسٹس" کے نام سے مشہور تھیں۔ رومی زبان میں "پاٹر" کے معنی صرف "والد" ہی نہیں بلکہ خاندان کے سربراہ اور سوسائٹی میں طاقت کا مظہر کے بھی ہیں۔ سلطنت روم کے عسکری اداروں نے وہاں کی موروثی اور رشتہ داری پر مبنی سوسائٹی کو ایک عسکری سوسائٹی میں تبدیل کر دیا اور عسکری سوسائٹی نے روم میں دو نئی چیزوں کی داغ بیل ڈالی؛ ایک رومی قانون جو وہاں کی بیوروکریسی اور آزاد خیالی کی کشش کا مرکز بنا اور دوسرا رشتہ داری کے دائرے سے باہر لوگوں کی کثیر تعداد کا ظہور جو بالآخر نظام کے خلاف لوگوں کے انقلاب پر منتہی ہوا۔ سیاسی و جغرافیائی بنیاد پر پیدا ہونے والی مرکزی حکومت کہ جس نے اپنے آپ کو حاکمیت دی عسکری سوسائٹی کے ظہور کا ہی نتیجہ تھی۔

مغربی جاگیرداری یا طوائف الملوکی کا ظہور درحقیقت سلطنت روم کے قانونی اور دفتری نظام پر مشتمل ایک عسکری سوسائٹی کے طور پر اس کے سقوط کا نتیجہ تھی۔ سلطنت روم کے سقوط کے بعد سب سے پہلے جرمن افراد نے اس کی اکثر زمینوں پر قبضہ کر لیا اور یورپ میں جاگیرداری نظام کو منظم کیا۔ عسکری اصولوں اور جنگ کے ساتھ تعلق فیوڈلزم کا اصلی طریقہ کار تھا۔ "قرون وسطی اور رومانٹسزم (Romanticism) کے دور میں عورت کے جسم کی پرستش پر توجہ دی جاتی تھی اور جو اس دور کے ادب و

ہنر آرٹ میں نمایاں رہا ہے اس کی پیدائش بھی یورپی فیوڈل اور عسکری سماجوں کے آثار میں سے ایک ہے۔ مغرب میں (خرد پسندی اسی طرح معاشروں اور عوام کی منطقی اور روایتی اجتماعوں پر مبنی دو گروہ "Traditional gathering" اور قراردادیں عسکری سوسائٹی اور بیوروکریسی کے ارتقاء و تکامل کا نتیجہ ہیں۔ مشہور جرمن ماہر عمرانیات فردینان وٹوینس سوسائٹی کی ان دو اقسام کو روایتی سماج " گمین شافت " اور خرد پسند سماج کو " گزل شانت " کے نام سے متعارف کرواتا ہے۔(۳۹) اسی کا ہم وطن جارج سیمل، دیہاتی و شہری معاشرے، فوجیوں کے کردار اور جنگی اختلافات کو سامنے لے کر آتا ہے جبکہ فرانسیسی مفکر آگسٹ کانٹ نے ثابت "Static" اور متحرک "Dinamic" معاشروں پر زیادہ زور دیا ہے حتی کہ مارکس، عسکری اداروں کے ایسے معاشروں کے ساتھ رابطہ کی بات کرتا ہے جنہوں نے اقتصاد میں تنخواہ لینا رائج کیا۔

سلطنت روم کے سقوط کے چند سو سال تک یورپ میں پیدا ہونے والی فیوڈل سوسائٹیز در حقیقت عسکری اور سیاسی سوسائٹی کا ملاپ تھیں، جن میں جنگ و فتوحات اور قوم و قبیلہ کی بنیاد پر دوسروں پر حکومت کرنے والے اشرافیہ "Aristorcrat" کے ذریعے نظام کی حفاظت، اس سسٹم کے اصلی ستون شمار ہوتے تھے۔ نشاۃ ثانیہ کے دور کا اطالوی مفکر مکیاولی اپنے آثار میں سیاست اور جنگ کے مابین رابطے خاص طور پر فیوڈل جنگوں کے خاتمے اور جدید سیاسی شعبہ جات کی تشکیل کا مشاہدہ کرتا ہے اور انہیں ذکر کرتا ہے۔ تمام نشاۃ ثانیہ کے تمدن میں، اٹلی اور تمام یورپ میں، جنگ ایک ہنر بن کر سامنے آتی ہے۔ مکیاولی اپنی معروف کتاب "شاہزادہ" میں یوں رقم طراز ہے کہ "جہاں اچھی فوج نہیں ہوتی وہاں اچھا قانون بھی نہیں ہوتا اور جہاں اچھا اسلحہ موجود ہو وہاں ضروری ہے اچھا قانون بھی ہو"۔ سولہویں صدی ہجری میں مسیحیت کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں تقسیم اور سلطنت روم کے سقوط اور فیوڈل سسٹم کے خاتمہ سے نہ صرف یورپی معاشروں میں امن و سکون حاصل نہ ہوا، بلکہ جنگ، سیاست و حکومت کی ایک مسلّمہ شق بن گئی۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں مغربی معاشروں میں لاتعداد جنگوں نے وہاں کے مفکرین کی نیندیں حرام کر کے رکھ دیں اور عین یہی وہ وقت تھا جب یورپی دنیا نے پہلی بار جنگ کے بارے میں بین الاقوامی قانون کے وجود پر زور دیا۔ ہالینڈ کے معروف مفکر ہوگو گروٹیوس (۱۵۸۳ء) مغرب کے بین الاقوامی حقوق

کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب "امن وجنگ کے حقوق" ۱۶۲۵ء میں لکھی۔(۴۰) توجہ طلب بات یہ ہے کہ یورپ میں بین الاقوامی حقوق کی کتاب کے لکھے جانے سے نو سو سال پہلے، اسلام اپنے بین الاقوامی حقوق میں جنگ اور امن کے قوانین بیان کر چکا تھا۔ گروٹیوس کی بین الاقوامی حقوق کی کتاب فنر کس، سیاست، عمرانیات اور جنگ کے قوانین کا مرقع ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس کے ساتھ ہی یورپی معاشروں میں مسئلہ جنگ اپنے تازہ مرحلے میں داخل ہو گیا۔ انقلاب فرانس نے نہ صرف عوام کو حکومتی اور سیاسی امور میں مداخلت کا حق دیا، بلکہ سماج کے سیاسی نظام میں ساکن اور شہری ہونے کے مسئلہ کو بھی پیش کیا۔ اس انقلاب نے شہریت اور سیاسی تابعیت کے حوالے سے مکیاولی طرز فکر کو وسعت بخشی اور چھوٹی چھوٹی فوجی چھاؤنیوں اور اٹلی اور بحیرۂ روم کے علاقوں میں پھیلے ہوئے شہری طرز کے ریاستی نظاموں کی بجائے قومی فوج اور عسکری تربیت کو لازم قرار دیا اور اسے ایک قومی حکومتی سماج کی صورت میں پیش کیا۔

انقلاب فرانس نے مغرب میں پہلی بار "مکمل جنگ" کے مفہوم جس میں تمام شہری شریک ہوں، کو قانونی حیثیت دی یعنی دشمن کے خلاف سب ہی برسر پیکار ہوں اور یوں یورپ انقلاب فرانس کے ساتھ ماڈرن اور جدید جنگی دور میں داخل ہو گیا۔ اور ۲۳ اگست ۱۷۹۳ء کو پیرس میں ہونے والے عظیم قومی کنونشن میں پہلی بار اس بات پر زور دیا گیا اور اس فکر کو باقاعدہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس منشور کے مطابق تمام حامل شرائط فرانسیسی جوان اور عوام، جنگ اور انقلاب کے دفاع کے لیے تیار رہیں گے۔

صرف ایک سال میں آزادی، برابری اور مساوات کا دم بھرنے والا انقلاب فرانس، نپولین کی عسکری قیادت میں یورپی ممالک پر لشکر کشی کر رہا تھا۔ اس فرانسیسی جبزل کی وسعت پسندی اور تسلط پسندانہ افکار نے روس سے لیکر مصر تک، مغربی معاشروں کے عسکری امور میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اسی صدی میں فرانس اپنے جنگی وسائل اور برطانیہ نے اپنے صنعتی انقلاب کے ذریعے اس براعظم بلکہ پوری دنیا میں اقتصادی آلات کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا۔

یہی وہ دور تھا جب جرمن نژاد یورپی مفکر کارل وان کلاز ویٹز نے اپنی معروف کتاب "جنگ کے بارے میں"، سوسائٹی میں ہونے والے ان عظیم عسکری واقعات کو ایک مخصوص علم اور فلسفہ کی صورت میں پیش کیا۔ کلاز ویٹز نے یورپ میں جنگ، سیاست اور انقلاب کے اس دور کا نہ صرف مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ

روس کی فوج میں بطور افسر بھی شرکت کی اور اس علاقے میں نپولین کی فوج کی شکست کا باعث بھی بنا۔ بلاشک و تردید اس کی کتاب جنگ اور خارجہ سیاست کے حوالے سے مغرب میں لکھی جانے والی اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اور وہ پہلا مفکر تھا جس نے سوسائٹی اور جنگ کے مابین رابطے کو ایک نظریہ کی صورت میں پیش کیا(۴۱)۔ کلازویٹز کی نظر میں جنگ اور سوسائٹی کے موضوع کا باہم مطالعہ کیا جانا چاہئے، اور اس طرح سے اُس نے اپنے بعد آنے والے مارکس، انگلس، اور ٹروٹسکی جیسی مغربی انقلابی اور فکری شخصیتوں کے لیے راہ ہموار کی۔ یورپ کے فیوڈل دور میں جنگیں محدود ہوا کرتی تھیں اور ان کا زمان و مکان بھی مشخص ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ چھوٹے چھوٹے فوجی گروپ طولانی جنگوں کے متحمل نہیں تھے۔ فیوڈل سسٹم کے زوال اور صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں یورپی معاشرہ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے گہرے مطالعہ کے بعد کلازویٹز اس نتیجہ پر پہنچا کہ آئندہ ہونے والی علاقائی اور عالمی جنگوں کا مستقبل سوسائٹی کی خصوصیات اور فطرت سے مربوط ہوگا اسی طرح لوگوں کی عمومی سوچ اور شرکت ان بین الاقوامی اختلافات اور لڑائیوں میں اہم کردار ادا کرے گی۔ کلازویٹر اور اس کے بعد کے شاگردوں کے نزدیک جنگ شطرنج کی ایک بازی ہے۔ مذہبی اور فیوڈل عقائد پر ہونے والی یورپی جنگیں قومی اور حکومتی جنگوں میں تبدیل ہوگئیں اور عسکری فرائض سیاسی حقوق کے مترادف پہچانے جانے لگے۔

انقلاب فرانس کے ساتھ ہی مغربی عسکری سوسائٹی کی جگہ سیاسی سوسائٹی نے لے لی۔ لیکن سیاسی سوسائٹی جو کہ مغرب میں ایک جدید سسٹم تھا کبھی بھی اپنے آپ کو عسکری سوسائٹی کے جنگی اصولوں سے جدا نہیں کر پائی بلکہ قدیم معاشروں، قرون وسطی اور ماڈرن یورپ کی سوسائٹیز کے عسکری اثرات آج بھی موجود سماجوں میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ انقلاب فرانس اور اس کے مختلف منشوروں کے دنیا کے گوشے گوشے میں صادر ہوتے ہی یورپ کی جنگی اور عسکری اقدار بھی تمام براعظموں میں ظاہر ہوگئیں۔ گذشتہ دو صدیوں میں مغرب میں ہونے والی سیاسی و اقتصادی ترقی اور جدیدیت کی عسکری سوسائٹیز کی تاریخ اور ارتقا کو مد نظر رکھے بغیر سول، سیاسی اور انقلابی معاشروں کا ایک روزہ مطالعہ اور تجزیہ یقیناً نامکمل ہوگا۔ آج "جنرل وار"، "جنرل گورنمنٹ" اور "جنرل پراپیگنڈہ" سوسائٹی کو مہار کرنے والے ایک مین گروپ کو تشکیل دیتے ہیں۔ کیمونزم اور سوشلزم کی آئیڈیالوجی اور اخلاق انقلاب فرانس کے بعد آنے والے سالوں میں ان جنگی اور عسکری افکار کے بہت قریب ہوئے بلکہ مل گئے۔ اور مارکس اور انگلس انیسویں صدی کے

اس انقلابی، سیاسی اور جنگی دور کا ہر روز مشاہدہ ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے آثار میں عسکری سوسائٹیز کے نتیجہ میں تشکیل پانے والے اداروں سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ (۴۲)

امریکہ اور اسپین کی اندرونی جنگیں، نپولین کی جنگیں، پہلی اور دوسری عالمی جنگیں اور کچھ سال بعد ویتنام، کوریا اور خلیج فارس کی جنگ سب "قومی مفادات" قومی عزت و وقار اور عوام الناس کی حمایت کے بہانہ کے طور پر لڑی گئیں۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگ تک براعظم یورپ اور امریکہ کے سامراجی افراد اپنے تحت تسلط معاشروں سے بہت کم تعلق رکھتے تھے۔ اور چونکہ ان ممالک میں حکومت اور سماج ہمیشہ الگ الگ رہے ہیں اس لیے سامراجی قوتیں زیادہ تر جدیدیت، سرکردہ اور حکومتی اہل کاروں کے ساتھ پینگیں بڑھاتی رہیں۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد جب اکثر ممالک نے اپنی سیاسی آزادی حاصل کی اور حکومت و معاشرہ کے درمیان تعلق کا معاملہ اُبھرا، کیونکہ اس وقت یہ ممالک ایک حقیقی اور اصلی معاشرے کے مفہوم سے بے خبر تھے اس لیے امریکی اور یورپی حکومتوں نے "تیسری دنیا" میں عسکری اور فوجی حکومتوں اور نظام کی حمایت اور تعاون پر زور دیا۔ چاہے یہ تعاون سوشلسٹ کے پیرائے میں ہو یا کیپٹلسٹ یا کیمونسٹ کے تحت ہو۔ درحقیقت مغربی عسکری سوسائٹی کو بعض اصلاحات اور تزئینات کے ساتھ، بطور آئیڈیل سوسائٹی، ان ممالک کے سر تھوپ دیا گیا۔ اور بہت سے مواقع پر ان ممالک کے تعلیم یافتہ، آزاد خیال افراد، ایجنٹ اور ان ممالک سے مرعوب افراد نے ان افکار اور پالیسیز پر لبیک بھی کہا۔

ہمارے خیال میں ترکی میں کمال اتاترک، ایران میں رضا خان پہلوی، مصر میں جمال عبد الناصر، انڈونیشیا میں سوکارنو اور بیسویں صدی کے آخری عشروں میں دوسرے ایشیائی، افریقی اور لاطینی امریکہ کے فوجی جرنیلوں کا حکومت میں ظہور و زوال کچھ صدیاں پہلے یورپ میں ہونے والے واقعات کی ترویج کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ آج کے معاشرے کا عسکری رنگ میں رنگ جانا ایک عالمی معاملہ ہے جس کا سب سے پہلا شکار خود مغرب ہے۔

جس طرح عسکری معاشرہ یا سماج خاندانی سماج کی پیدائش ہے، سیاسی معاشرے کی ابتدا بھی عسکری اور جنگی سماج سے ہوئی۔ (۴۳) تاریخی اعتبار سے بھی مغرب میں کوئی بھی ایسا سیاسی سماج یا معاشرہ نہیں ملتا جو بغیر کسی جنگ کے تشکیل پایا ہو۔ نظریاتی حوالے سے مغرب میں سیاسی سوسائٹی کا نظریہ سب سے

پہلے عظیم فلسفی افلاطون کے آثار میں ملتا ہے۔ کیونکہ اس کی تالیفات میں جنگ و جدل کے علاوہ حکومتوں کی تشکیل کے لیے عدالت و انصاف، عقلانیت اور معاشرے جیسے مصادیق نظر آتے ہیں۔ مغرب میں سیاسی افکار کا مسئلہ ہمیشہ، جنگوں، سیاسی و اقتصادی اختلافات اور سوسائٹی کے تنزلزل و قوموں کی جا بجائی سے شروع ہوا ہے۔ ہم اس طریقہ کار کو افلاطون (۴۴) اور ارسطو (۴۵) کے دور میں رومیوں کے لیے لکھے اور مرتب کئے جانے والے قانون، قرون وسطیٰ کی مذہبی جنگوں، اگلی صدیوں میں برطانیہ کے اندرونی معرکوں اور روسو (۴۶) اور دوسرے افراد کے نظریات میں دیکھ سکتے ہیں۔

مغربی سیاسی سماج کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں ۱۔ طاقت کا انحصار ۲۔ حاکمیت ۳۔ حب الوطنی ۴۔ ضروری قوانین ۵۔ بیوروکریسی ۶۔ شہریت ۷۔ مثبت حقوق۔ جیسا کہ ٹروٹسکی نے کہا ہے کہ "ہر حکومت طاقت کے بل بوتے پر وجود میں آتی ہے" مغرب میں حکومتیں نہ صرف مضبوط عسکری کامیابی سے بلکہ طاقت پر انحصار کے دعویٰ کے ساتھ وجود میں آئیں۔ افلاطون سے لے کر آج تک حکومت میں عدل و انصاف آزادی اور مساوات کے بارے میں ہی گفتگو کے باوجود مغربی مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ سیاسی معاشرے کی بنیاد طاقت پر رکھی جاتی ہے۔ قیادت یا حکومت کا دعوی یہ ہے کہ وہ فیصلہ کرنے اور سماج یا معاشرہ کی قیادت کے لیے سماج پر حاکمیت رکھتی ہے اور سیاسی اعتبار سے یہ حاکمیت دین، صنف اور رشتہ داری سے بالاتر ہے۔ لہٰذا سیاسی سماج میں حب الوطنی کا مقام جغرافیائی اور زمینی حاکمیت میں بہت واضح ہے۔ مغرب میں سیاسی سماج کا جغرافیائی یا زمین کی مالکیت یا اس سے وفاداری کے بغیر تصور بھی محال ہے۔ افراد، گروہ اور حکومتی فرائض اور قوانین اس قسم کی سیاسی سوسائٹی کی بنیاد شمار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ کی تاریخ میں (جو یورپ میں سب سے پہلے پہلا سیاسی و حکومتی نظاموں میں سے ہے۔) شروع میں پارلیمنٹ کی ذمہ داری، قانون سازی عدلیہ کے امور سے مربوط تھی۔ پھر بتدریج پارلیمنٹ، حکومت اور سلطنت کا ضروری کردار واضح ہوتا گیا۔ سیاسی سوسائٹی میں بیوروکریسی امور مملکت کو افراد سے لے کر حکومتی انتظام اور اداروں کے حوالے کرتی ہے۔ شہریت، سیاسی سوسائٹی کے بنیادی اصولوں میں شمار ہوتی ہیں۔ یعنی حکومتوں میں افراد اور گروہوں کے حقوق روایتی "Traditional" اور قانونی قراردادوں کی بنیاد پر معین و مشخص کئے جائیں گے۔

ویسے مغرب میں سیاسی سوسائٹی کے بہت سے ماہرین، فلسفی اور مفکر پائے جاتے ہیں۔ اس کے تاریخی پس منظر اور موجودہ ارتقاء کو سمجھنے کے لئے افلاطون کی تالیفات اور خاص طور پر "جمہوری" بوڈن اور اس کے مفہوم حاکمیت، مکیاولی اور اس کے سیاست اور طاقت کے معنی اور روسو اور ھابز کے افکار سے آشنائی ضروری ہے۔ آج کے دور میں چاہے طاقت پسند نظام ہوں یا مغرب کے ڈیموکریٹک سسٹم، ان سب میں افلاطون کے افکار کی جھلک ضرور دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ سیاسی روابط کو دوسرے تمام تعلقات اور وفاداریوں پر ترجیح ہے۔

افلاطون تاریخ مغرب کا سب سے پہلا آزاد خیال فرد ہے۔ وجودی تسلسل "Chain of existance" کا مفہوم جس میں وہ تمام موجودات کو اجتماع کے اندر ایک عمودی زنجیر میں پروتا ہے اور جس نے مسیحیت اور سیکولر افکار پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں، سب افلاطون کی سوچ کا نتیجہ ہیں، خاص طور پر اس کی کتاب "قوانین" کی تیسری جلد میں اس کا اجتماعی ترقی کے بارے میں نظریہ ہے۔ ایتھنز یونان میں اپنی پیدائش ۴۲۷ قبل مسیح سے لیکر عنوان شباب تک اسے سیاست سے گہری دلچسپی تھی اپنی موت ۳۴۷ قبل مسیح سے کچھ پہلے اپنے ایک خط میں اس نے اپنی ایک آرزو اور تمنا کا اظہار کیا کہ اسپارٹنز کی فوج کی شکست کے بعد ایتھنز میں سول حکومت کی ترقی و بہبود کے لیے کام کرنا اس کا خواب تھا۔ وہ چیز جو سیاسی سوسائٹی کے متعلق مغربی مؤلفین کی کتابوں میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ افلاطون سے لے ی کر ہابز اور روسو تک سبھی نے کوشش کی ہے کہ وہ اپنا نظریہ پیش کرنے سے اس آشفتہ حال اور نا منظّم دنیا کو ایک منظّم دنیا اور بہتر سوسائٹی میں تبدیل کر سکیں۔ افلاطون کا نظریہ "سیاسی استحکام" اور سماجی فقدان ہی ہے جس نے مغرب کو فرد محوری سے آشنا کرایا۔ لیکن اس کی نظر میں سیاسی نظام میں ایک شہری، کی حیثیت ایسی ہے جیسے بدن میں خلیوں "Cells" کی ۔ وہ حکومت میں سیاسی محافظوں کے بارے میں بات کرتا ہے جن کا کام افراد اور سوسائٹی کا تحفظ ہے۔ افلاطون اور قدیم یونان کے بعد سلطنت روم کے سر کردہ قانوندان طبقے میں ایک سیاسی سماج یا سوسائٹی ظاہر ہوئی۔ یورپ میں سیاسی سوسائٹی کی ترقی میں آنے والی صدیوں میں رومیوں کے قوانین کے اثرات بہت واضح ہیں۔ یہاں تک کہ فرانسیسی حاکم نپولین بونا پارٹ یورپ کے اکثر حصہ کو فتح کرنے کے بعد کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی رومیوں کی طرح یکساں "نپولین" قانون کو اپنے تحت تسلط ممالک میں لاگو کر سکے۔

قرون وسطی میں سیاسی سوسائٹی کا مفہوم کلیسائی نظریات اور اصولوں کے تحت ایک فکری مشکل کا شکار ہوگیا لیکن نشاۃ ثانیہ کے بعد جس شخص نے اس کو دوبارہ حیات بخشی، وہ جان بوڈن اور اس کا رسالہ "جمہوریت" تھا جو ۱۵۷۶ء کو پیرس میں چھپا۔ مغربی افکار میں حاکمیت کے بارے میں پہلا سیاسی نظریہ بوڈن نے پیش کیا۔ اس کی نظر میں حاکمیت عظیم ترین اور بالاترین ادارکی طاقت ہے جو معاشرے اور شہریوں پر مسلط ہوئی ہے۔ اس نظریہ پر ہابز اور روسو جیسے دانشوروں نے بھی کہیں تنقید یا اعتراض نہیں کیا۔ بوڈن کے زمانے تک موجودہ یورپی دانشوروں کے نزدیک "قوم" کا رائج معنی موجود نہیں تھا، بلکہ قوم کا اطلاق جائے ولادت، گھر، خاندان کے افراد اور گروہ ہوا کرتے تھے۔ پندرہویں صدی سے قبل یورپی افراد کا زیادہ سروکار فرینکس، اسلاو، نارمن اور سرکین اقوام یا نژادوں سے رہا ہے۔ جرمنی، فرانس، برطانیہ اور اٹلی میں ہونے والی جغرافیائی تقسیمیں جن میں قومی حاکمیت پائی جاتی تھی۔ اہل یورپ کے دماغ میں کم ہی بیٹھتی تھی۔ لیکن حاکمیت کی جو تعریف بوڈن نے بیان کی اور مغرب میں سولہویں صدی سے لیکر آج تک ہونے والی سیاسی تبدیلیوں سے مفہوم کی سیاسی قدر و قیمت میں حد درجہ اضافہ ہوا، جیسے قومی سلطنت، قومی جمہوریت، قومی سوشیالزم اور قومی دین ومذہب۔

سترہویں صدی کے اواسط میں جب تھامس ہابز جیسے برطانوی دانشوروں نے نظریات دینے اور تالیفات کا سلسلہ شروع کیا تو سیاسی سوسائٹی کے حوالے سے یورپ کے قرون وسطی کے دور کی تمام محدودیتیں اور مشکلات ختم ہوگئیں۔ بوڈن کے نظریات اور ہابز کے سیاسی آثار کے درمیان صرف ۷۵ سال کا فرق تھا، لیکن سیاسی و فلسفی اعتبار سے ان دونوں شخصیتوں میں صدیوں کا فاصلہ پایا جاتا ہے۔ بوڈن کے سیاسی افکار میں پایا جانا والا دین اور معاشرتی گروہ کا مقام، ہابز کے نظریات میں نظر نہیں آتا اور اب افراد، خاندان کی بجائے سیاسی سوسائٹی کے چھوٹے چھوٹے گروہ تشکیل دیتے ہیں۔ ہابز نے اپنے اخلاقی نظریہ کی بنیاد انسان کی طاقت پر رکھی۔ اہمیت صرف اس شخص کی ہے جس کے پاس طاقت ہو اور طاقتور ہی سیاسی اقدار کا حامل ہے۔ ہابز کی نظر میں ذاتی اقدار کی کوئی حیثیت نہیں اور اس کی نظر میں تمام اقدار نسبی ہیں، ناکہ مطلق۔ وہ عوامی طاقت کی بات کرتا ہے جس سے مطلوبہ سیاسی سوسائٹی وجود میں آسکتی ہے۔ عوامی طاقت حاصل کرنے کیلئے لوگوں کو اپنی انفرادی طاقت، ایک فرد یا مجلس کو پیش کرنا پڑے گی۔ آج بہت سے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ ماڈرن سیاسی قومی نظام کو بہت زیادہ مرکزیت حاصل

ہے۔ ہابز کے انہی افکار کا نتیجہ ہے جو اس کی ۱۶۵۱ میں چھپنے والی معروف کتاب "لویاتان" میں بیان ہوئے ہیں۔ اس کی نظر میں تمام افراد فطرتاً آزاد ہیں لیکن ان آزادی کی حدود کو مقتدرہ حکومت نے مجبور کر دیا ہے۔

مغرب میں سیاسی سوسائٹی کے حوالے سے اگلا اور آخری قدم فرانس میں اٹھارہویں صدی کے جان جاک روسو کے نظریات تھے۔ بغیر کسی شک وشبہہ کے ماڈرن مغربی سیاسی آثار میں سب سے اہم اور سب سے زیادہ نافذ روسو کا سیاسی سوسائٹی کے بارے لکھا جانے والا رسالہ ہے۔ اگر افلاطون کو سیاسی سوسائٹی کا حقیقی نقاش مانا جائے تو روسو اس کا معمار مانا جائے گا۔ یورپ اور بالخصوص فرانس میں اٹھارہویں صدی عیسوی، روشن خیالی اور آزاد خیالی کا دور تھا۔ اس دور کے مصنفین پوری آزادی کے ساتھ دین و مذہب، انفرادی اور استبدادی حکومتوں، فیوڈلزم دور کی باقی ماندہ قوتوں کے خلاف لکھتے رہے اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا سیکولر اور لادین دنیا اپنانے میں جُٹے رہے۔ افلاطون کی طرح روسو بھی اپنے معاشرے کی بے نظمی، انتشار اور عوام اور حکومت میں پائے جانے والے بحرانوں سے ناراض تھا اور ان تمام مسائل کا حل ایک سیاسی سوسائٹی کی تلاش میں سمجھتا تھا۔ روسو کی پیش کی جانے والی عمومی سیاسی طاقت پر اس لیے بھی تنقید کی جاتی ہے کہ، اس کے نظریات میں حاکمیت کا مفہوم اقلیتی استبداد کو اکثریتی استبداد میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی نظر میں حکومت عوام سے تشکیل شدہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں صرف ان کے معاشرتی منافع کو حاصل کیا جاتا ہے۔ روسو کی نظر میں یہ منافع زندگی، بہبود، ملکیت اشیاء کے علاوہ مادی امور جیسے روپیہ، سرزمین، گھر اور روزمرہ زندگی کی سہولیات ہیں۔ وہ تجربات جو اہل یورپ، عیسائیت اور کلیسا کی جہالت واضطراب سے حاصل کر چکے تھے روسو بھی اس دور کے دوسرے دانشوروں کی طرح اس بات پر زور دیتا ہے کہ کلیسا اور حکومت کو الگ الگ رہنا چاہئے۔ یا دوسرے لفظوں میں ایک سیاسی سوسائٹی میں حکومت اور دین کے الگ رہنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

یہاں ایک نکتے کی یاد دہانی ضروری ہے کہ مغربی سیاسی معاشرے کی خصوصیات میں سیاست، قدرت، حاکمیت، آزادی، حب الوطنی اور اخلاق اور شہریت جیسے معانی اپنے غیر مغربی افکار و اصول مثلاً اسلامی حکومت ومعاشرہ جیسے مفہوم کے ساتھ مکمل طور پر اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ماڈرن زمانے میں سیاسی سوسائٹی کا ظہور اور اس کی ترقی ایک مطلوب مغربی معاشرے کے طور پر اس وقت شروع ہوتا ہے،۔ جب

یورپی حکومتوں اور سلطنتوں نے تمام براعظموں پر اپنے تسلط کا آغاز کیا اور روسو کے افکار سے متاثر انقلاب فرانس کے بہت سارے اہداف و مقاصد پر انیسویں اور بیسویں صدی کے دوسرے مغربی دانشوروں کی طرف سے بہت زیادہ تنقید کی جاتی ہے۔

دینی و مذہبی تفکر، تاریخ بشر کا سب سے قدیم تفکر ہے۔ مغربی تاریخ کی اہم ترین چیزوں میں سے بنیادی چیز، دینی اور مذہبی معاشرہ کی جستجو رہی ہے۔ یورپ میں قرون وسطی میں شہری تعمیرات، نقشہ سازی و نقش و نگاری سے اس براعظم میں دین و مذہب کے اثر و رسوخ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یورپ میں شاہی قلعوں اور محلوں اور آج کی آسمان سے باتیں کرنے والی عمارتوں سے پہلے اس سرزمین میں کلیسا اور عبادت گاہیں موجود تھیں۔ سلطنت روم کے عیسائی مذہب کو قبول کرنے سے پہلے ہی اس براعظم کے عوام، اس مذہب کی طرف مائل ہوچکے تھے۔ یورپ میں اصلاحی بحثیں، دینی و مذہبی اختلافات سے شروع ہوئی۔ یورپ کے ماڈرن دور کا جرمن نژاد ماہر عمرانیات میکس وبر، سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں یورپی معاشرہ میں دین کے حیاتی ہونے، سرمایہ دارانہ نظام (کیپٹلزم) کی پیدائش و ترقی کو کام اور کوشش کے "مقدس" ہونے کے بارے میں پروٹسٹنٹ اعتقادات کے ساتھ ربط دیتا ہے۔ سیاسی سوسائٹی کی ترقی کے ساتھ سیاسی قومی وابستگی، دین و مذہب کی جگہ لے لیتی ہے۔ اگرچہ یورپین قوم پرستی اس کے سیاسی نظام میں ایک سیاسی دین کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، لیکن لوگوں کی زندگی میں مذہب کی اہمیت کو کم نہ کرسکا۔ سلطنت روم کے قیام سے لے ی کر آج تک آگوسٹین، اکویناس، لوٹر، کیلون، نیومن کیکر کگارڈ، الول اور دوسرے افراد کے افکار اور نظریات میں ایک دینی اور مذہبی معاشرے کے قیام کے لیے سعی و کوشش جاری رہی ہے۔

مغرب میں دینی اور مذہبی سوسائٹی کی خصوصیات " Specifications " درج ذیل ہیں۔

۱۔ وقار، شخصیت اور جاذبیت، جسے میکس وبر نے "کریزما" کا نام دیا اور اسے دین و معاشرہ کی معرفت اور مرکزیت میں قرار دیا۔

۲۔ کفرآمیزی کے مقابلے میں تقدس، یہ کفرآمیزی تقریباً تمام ادیان میں موجود رہی ہے لیکن فرانسیسی ماہر عمرانیات امیل دوریکم نے اس پر حد درجہ تاکید ہے۔

۳۔ نظریاتی لاہوت، یا بغیر کسی دلیل کے قبول کئے جانے والے مسلّمہ، یقینی اور آمرانہ عقائد۔

۴۔مذہبی آداب ورسوم۔

۵۔پرستش اور طریقت جو مشترکہ طور پر افراد میں ارتباط قائم کرتی ہے اور بعض مقامات پر ایک فرقہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

مغرب کے معاشرتی افکار کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ سیاسی سوسائٹی، مذہبی سوسائٹی کی ان خصوصیات سے جدا ہو گئی لیکن جیسا کہ حالیہ تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ سیاسی سوسائٹی مذہبی سوسائٹی میں انسانیت کی پہچان "Anthropology" اور اس کے ذاتی، نفسیاتی اور سیاسی پہلوؤں کو مکمل طور پر سمجھا نہ سکی اور آج بھی لادین اور سیکولر نظام میں مسلمہ عقائد، تقدس اور رسومات کی طرح قومیت، وطن پرستی، ڈیموکریسی، ترقی، آزادی اور شہادت موجود ہیں۔ ظہور اسلام کے برخلاف مغرب میں عیسائیت کا آغاز جدید معاشرتی سسٹم، جدید حکومت، جدید قوانین اور جدید سیاست، اقتصاد اور تہذیب کے ساتھ نہیں ہوا۔ جبکہ اسلام میں پہلے دن سے ہی حکومت، حاکمیت، قانون، تہذیب اور اقتصاد، اسلامی معاشرے اور نظام کا لازمی جزء شمار ہوتا تھا۔ رومی اور ایرانی سلطنتوں کی شکست کے ساتھ ہی، اسلام نے اپنی دنیا کی تعمیر کی داغ بیل ڈال دی۔ اس کے برعکس مغرب میں عیسائیت ایک سو سال تک انفرادی عقائد کی صورت میں گوشہ نشین رہی اور پھر سلطنت روم کے ساتھ مدغم ہو گئی۔ یہیں سے عیسائیت کی "Globalization" کا آغاز اور ایک مذہبی سوسائٹی اور دینی و سیاسی نظام کی کوشش شروع ہوئی ہے۔ کلیسا اوائل عیسائیت میں ایک عبادت گاہ کی بجائے مذہبی "Religious" اور "administration" انتظامی ادارے کے طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ کلیسا حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے ایک سو سال بعد آنے والی سلطنت روم کی تخلیق تھا۔ خود انجیل حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کی ایک صدی بعد عیسائی راہنماؤں اور بہی خواہوں کے توسط سے لکھی گئی۔ سلطنت روم میں خاندانی سوسائٹی اور عیسائی مذہب کے مابین اختلاف بہت واضح تھا اس لیے عیسائی راہنماؤں اور حکام سلطنت نے کوشش کی کہ ایک ایسی مذہبی سوسائٹی کو تشکیل دیا جائے جس میں خاندانی اصولوں کو عیسائی تعلیمات میں جگہ دی جاسکے۔ دینی اور مذہبی معاشرہ عیسائی معاشرہ میں تبدیل ہوتا ہے۔ عیسائیت، اجتماعات کے مخالف نہیں بلکہ حکومت کے خلاف ہے۔ جیسا کہ چند صدیوں بعد اجتماع سے وابستہ افراد کا مجموعہ عیسائی تہذیب کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد کی صورت ظہور کرتا ہے۔

مغرب میں ایک دینی سوسائٹی کے قیام کے لیے کوششیں سنٹ اگوسٹین (430- ۳۵۴) عیسوی کی تحریروں میں زور پکڑتی ہیں۔ اگوسٹین نے دوسرے تمام مغربی مفکروں کی نسبت دینی سوسائٹی اور دوسری سوسائٹیز کے مابین تضاد کی تشخیص دی۔ پانچویں صدی عیسوی کے اوائل میں اگوسٹین کی کتاب خدا کا شہر، پوری زمین پر مذہبی معاشرے کے قیام پر خطاب اور گفتگو ہے نہ کہ صرف ان ممالک میں جہاں لوگوں نے عیسائیت کو اپنے دین کے طور پر قبول کیا ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ پر معاشرتی بحران دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اگوسٹین علم تاریخ، فلسفہ اور ہنر پر اپنی مہارت کے ذریعے، اپنے آئیڈیل معاشرے کو اس کتاب میں پیش کرتا ہے۔ عیسائی مورخین اور متکلمین کا ماننا ہے کہ اگوسٹین کی یہ کتاب عمرانیات میں انجیل کے بعد اہم کتاب ہے۔ قرون وسطی کا یہ فلسفی اپنی اس کتاب میں کسی ایک معاشرے، قوم یا عوام سے بحث نہیں کرتا، بلکہ وہ پہلا مفکر ہے جو بشریت کو ایک خاندان شمار کرتا ہے اور دوسروں عوامل کے برعکس نسل، قومیت اور سیاست کو اپنے نظریہ میں جگہ نہیں دیتا۔ صدیوں یونانی اور رومی ترقی و زوال کے اصول پر کاربند رہے لیکن افلاطون، ارسطو اور سنکا جیسے فلسفیوں کے لیے حقیقت اور واقعیت ترقی، بڑھاپے اور زوال کے ایک نامحدود سلسلہ سے تشکیل پاتے ہیں۔ اگوسٹین نے تاریخ اور معاشرے کے پھیلے اور منتشر اعضاء کو ایک ہی مجموعے میں دیکھا وہ چیز جس کی بنیاد ایک ہے اور آخر میں خدا کے شہر یا آئیڈیل سوسائٹی کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی۔ اگوسٹین کی نظر میں "خدا کے شہر" اور انسان کے شہر میں تصادم قطعی اور ناگزیر تھا۔ وہ انسان کے بنائے ہوئے شہر یا سوسائٹی کو برا نہیں کہتا لیکن یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ ہم سب اس میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور آئیڈیل سوسائٹی خدا کا شہر ہے۔ (۴۷)

کلیسائی اور سلطنتی نظام کے تسلسل، اور قرون وسطی میں عہد جہالت کی وجہ سے اگوسٹن اور اس کے پیروکاروں کے افکار نے اس وقت کے معاشروں میں کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑا اور نشاۃ ثانیہ اور مذہبی اصلاح طلبی کے آغاز سے لوٹر اور اس کے افکار سیکولرزم اور فردیت کے نفوذ کی وجہ سے فراموش ہوگئے۔ (۴۸) لیکن مغربی پروٹسٹنٹ مکتب کی کیتھولک چرچ سے جدائی، یورپ میں عقلانیت کے دور کا آغاز اور برطانیہ، جرمنی، فرانس اور روس کے انقلابات کے ساتھ اپنے مطلوبہ سماج کی تلاش میں مسلسل کوشش کرتا رہا، یورپ میں دینی اصلاح طلبی عقلانیت، مادی اور لادینی بالآخر سیاسی انقلابات اور تبدیلیوں پر منتہی ہوئی۔ سیاسی اور انقلابی معاشروں کے قیام کے ساتھ بالخصوص اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اور مغرب کو

درپیش سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی بحرانوں کے ساتھ دینی تفکر کا احیاء ایک مرتبہ پھر یورپ اور امریکہ میں معنویات کے احیاء کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

مغرب کی چار سو سال قبل کی تاریخ میں دینی معاشرہ کی ترویج کرنے والے افکار کے ساتھ دشمنی اور عداوت کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر برطانوی فلسفی اور متفکر جرمی بینتھم جو یورپ کے عہد عقلانیت کے آزاد خیال گروہ سے تعلق رکھتا ہے، ہر قسم کی دینی سنت (Tradition) بالخصوص عیسائیت پر سخت تنقید کرتا ہے۔ دینی افکار سے نفرت اور جدائی میں انیسویں صدی کے کارل مارکس سے زیادہ سخت کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی نظر میں دینی اور مذہبی افکار معاشرے میں افیون کی مانند ہیں۔ لیکن برطانوی مورّخ آرنلڈ توین بی اور برطانوی فلاسفر برٹرند رسل نے اس پر کہ کارل مارکس بھی دوسروں کی طرح تعصّبات کی گھاٹی میں جا گرا ہے، کارل مارکس پر تنقید کرتے ہوئے اس کو ان معاملات اور حادثات جن سے وہ دور بھاگتا رہا ہے، ان میں مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بہت سے مغربی مفکرین نے دوبارہ نئے سرے سے دینی معاشرے کے موضوع میں دلچسپی ظاہر کی،(۴۹) جیسے فرانسیس رنہ شاتوبریان(۵۰) (۱۷۶۸ سے ۱۸۴۸تک) جان ہنری نیومن(۵۱) (۱۸۰۱ سے ۱۸۹۰تک) سورن کی رکگارڈ(۵۲) (۱۸۱۳ سے ۱۸۵۵تک) اگوسٹ کانٹ (۱۷۹۸ سے ۱۸۵۷ تک)(۵۳) میکس وبر (۵۴) (۱۸۶۴ سے ۱۹۲۰تک) اور امیل دورخیم (۵۵) (۱۸۵۸سے ۱۹۱۷تک)۔

قدیم عسکری سوسائٹی، یونان کی سیاسی اور شہری سوسائٹی، سلطنت روم کی قانونی اور اداری سوسائٹی اور قرون وسطی کی مذہبی و دینی سوسائٹی کے بارے میں مغربی دانشوروں اور مفکرین کی ناخوشی اور نارضایتی کی وجہ سے یورپ میں اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ایک انقلابی معاشرے کے لیے کوشش اور جستجو شروع ہوئی۔ وولٹر، روبسپیر، مارکس، لینن، اسٹالین اور مایو، ماڈرن مغرب نما انقلابی معاشروں کے ہیرو ہیں۔ مغرب کی نظر میں اس انقلابی سوسائٹی کی خصوصیات کے کچھ اہم عوامل یہ ہیں:

۱۔ انسانیت کی نجات کا افسانہ اور گذشتہ تمام ایسے اخلاقی اقدار کی نفی جو مکروہ نظر آئیں۔
۲۔ سیاسی نظام کی برطرفی کے لئے تشدد کی ضرورت اور نئے سسٹم اور سوسائٹی کی تشکیل۔
۳۔ دہشت گردی اور عسکری گوریلا کاروائیوں کا استعمال۔

۴۔ اپنے عقیدے اور آئیڈیالوجی کی مکمل پاسداری۔
۵۔ برجستہ افراد اور پارٹیوں کا لازمی ہونا۔
۶۔ سیاسی، اداری اور معاشرتی مرکزیت

یہ خصوصیات مغرب میں برپا ہونے والے کم و بیش ہر انقلاب میں مکرر پائی اور دیکھی جاتی ہیں۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے تک مغرب میں ایک انقلابی سوسائٹی کے حصول کی کوئی مثال نہیں ملتی اگرچہ انقلابی تحریکیں کسی نہ کسی صورت میں رہی ہیں۔ انقلاب فرانس سے چند سال قبل ہونے والا امریکہ میں انقلاب درحقیقت استقلال کی جنگ تھا۔ امریکہ کی آزادی و استقلال کی جنگوں اور انقلاب فرانس میں بنیادی فرق یہ تھا کہ پہلا اپنے معین اہداف کے ساتھ برطانوی سامراج کے خلاف قیام کرتا ہے، جبکہ دوسرا یعنی انقلاب فرانس جہاں تک انقلابیوں کے لیے ممکن تھا نامحدود اور بہت زیادہ وسیع تھا۔ انقلاب فرانس کا نعرہ "آزادی، اخوت اور مساوات" زیادہ تر شہریوں کے حقوق پر بھروسہ کئے ہوئے تھا اور ایک ایسی تحریک تھی جو ایک سیکولر اور لادین نظام کی تشکیل کے لیے بادشاہی اور دینی نظام کے خلاف متحرک تھی(۵۶)۔ انقلاب روس کہ جس میں کامیابی حاصل کرنے والے افراد نے مارکس اور لینن کے افکار پر بھروسہ کیا انہوں نے انقلاب فرانس اور فرانسیسی معاشرے کو ایک "متوسط طبقے" کا انقلاب اور اس کو اسی متوسط طبقے اور مالکوں کے طبقے سے تعلق رکھنے والے معاشرے کے طور پر یاد کیا۔ روسی انقلاب کے اصلی اہداف میں سے ایک پرولٹیریٹ (محنتی مزدوروں) کی آمر حکومت کا قیام اور اس کا استحکام اور ایک سوشلسٹ معاشرے کو ایک آئیڈیل کمیونسٹ اتحاد کی جانب گامزن بنانا تھا۔

ہیگل کی تحریروں سے متاثر ہونے والے مارکس کو اس کی زندگی کے پہلے دور میں "بائیں بازوں کا ہیگل" جانا جاتا تھا۔ مارکس کے نزدیک انقلاب کا معنی یہ ہے کہ، انسان اپنی شناخت حاصل کرے اور ماقبل تاریخ دوروں سے تاریخ کے حالیہ دور میں منتقل ہو، جس میں آزادی کے حصول کا سفر جبراً طے کرنا پڑتا ہے۔ مارکس نے جس مقالے میں ہیگل کے فلسفہ پر تنقید لکھی ہے، اس میں واضح کیا ہے کہ "انقلاب ایک غیر متحرک، مجہول اور مادی عامل کا محتاج ہوتا ہے" اور نظریہ انقلاب اس وقت قابل عمل ہوتا ہے جب یہ انقلاب لوگوں کی خواہشوں کو پورا کر سکے۔ اور اس قسم کی آگاہانہ تحریک کی شرط یہ ہے کہ اس میں اس حس کا ادراک کرنے والے افراد موجود ہوں۔ مارکس کی نظر میں انسان کی خود بیگانگی کے اقتصادی اور مادی

اسباب ہوتے ہیں، اور یہ خود بیگانگی سرمایہ دارانہ نظام اور معاشرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی اصالت ہی، مالکیت پر مبنی ہے۔ مارکس، انگلس اور لینن کی نظر میں انقلابی سوسائٹی ایک آئیڈیل قسم کا مفہوم ہے۔ اور یہ لینن کی کتاب "کیا کرنا چاہئے؟" اور مارکس کے "مینفسٹ" اور "سرمایہ" جیسے رسالوں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ لینن نے مارکس کے آثار کی تشریح اور اس کو منتقل کر کے، انقلاب روس کے لئے، طریقہ کار مرتب کیا۔

مغرب میں انیسویں صدی کے اواخر میں دانشور، جارج سورل (۵۷) کے آثار، انقلابی سوسائٹی بالخصوص تشدد میں سب سے زیادہ موثر رہے۔ سورل، شروع میں ایک انجینئر اور پولیٹیکل کنزرویٹو تھا جو ۱۸۹۲ تک حکومت فرانس کے لیے کام کرتا رہا اور آخر تک یورپ کے لبرل خیالات کے بارے میں بدگمان اور صنعتی و سرمایہ دارانہ نظام کی "ترقی" سے بیزار رہا۔ ڈیموکریسی پر اعتراض، انجیل کے بارے میں اس کا کتابچہ، سقراط کی سزائے موت کا دفاع اور قدیم دنیا کے زوال کے بارے میں اس کی کتاب، ان سب کو ۱۸۹۰ء کے عشرے میں تحریر کیا۔ یہ سب اس کی انسانی معاشروں کی ترقی، انتشار اور زوال میں گہری دلچسپی کو بیان کرتے ہیں۔ مارکس اور انیسویں صدی کی تحریکوں کے مطالعہ سے سورل اس نتیجہ پر پہنچا کہ صرف ایک مکمل انقلاب ہی یورپ میں جدید معاشرے کو تشکیل دے سکتا ہے۔ مارکس کا کہنا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام بتدریج ناکام ہو جائے گا اس کے برعکس سورل کا ماننا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام مستقبل میں پیسے، تنخواہ اور کام کے مواقع کے ساتھ معاشرے کے نچلے طبقوں کو اپنی طرف جذب کرے گا اور ان کے شامل ہونے سے مزید طاقتور ہوگا۔ سورل کے ان نظریوں کا اس کی دو کتابوں "مارکسیزم کا زوال اور ترقی کی خام خیالی" میں واضح طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یورپ کے "لبیرل اور علاقائی" طبقہ کی نسبت سورل کا یہ تنفّر اس کی معروف کتاب "تشدد کے بارے میں تفکر" میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ تشدد پسند نہیں تھا لیکن اس کا ماننا تھا کہ سوسائٹی کے لیے سب سے بڑا خطرہ تشدد نہیں بلکہ زوال ہے۔ سورل یہ بتانے کی کوشش میں رہا کہ تشدد ہمیشہ انسانی معاشروں کا جز رہا ہے لیکن صرف تشدد برائے تشدد کافی نہیں بلکہ اس کو ایک معاشرتی تعمیری مقصد اور خواہش کے لیے ہونا چاہئے۔ صنعتی معاشروں کی جانب سے "امن" پر تاکید تشدد سے بچنے کے قانونی اقدامات سورل کی نظر میں ان کی خیالی خصوصیات میں سے ایک ہے جس سے وہ اپنے آپ کو عسکری سوسائٹی سے ممتاز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک لحاظ سے سوسائٹی کی تلاش میں مغربی بحران کو خاندانی سوسائٹی، عسکری سوسائٹی، مذہبی سوسائٹی، سیاسی سوسائٹی، انقلابی سوسائٹی، سرمایہ دارانہ سوسائٹی، صنعتی سوسائٹی، سوشلسٹ سوسائٹی، انارکسٹ سوسائٹی، مقامی اور فطری سوسائٹی، سول سوسائٹی، اطلاعاتی سوسائٹی، ایکسٹرا انڈسٹریل سوسائٹی وغیرہ۔۔۔ میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔ یونانیوں اور رومیوں کے دور سے لے کر عہد حاضر تک مغربی معاشرتی افکار کی تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمیشہ فطرتی اور لوگوں کی پسندیدہ سوسائٹی کی طرف بازگشت کا رجحان اور محرک رہا ہے۔ مثال کے طور پر مغرب میں ایک علاقائی اور قدرتی زندگی کی طرف رجحان اور رغبت چھٹی صدی عیسوی میں، سلطنت روم کے سقوط کے بعد سینٹ بینڈیکٹ کے طور طریقے اور اس کے آئین میں ظاہر ہوا جو درحقیقت ایک درویشانہ اور رہبانیت طرز کی سوسائٹی کی تلاش و جستجو تھی۔ اس طرح کی تحریکیں آنے والی صدیوں میں بھی ظاہر ہوتی رہیں اور سولہویں صدی کے اوائل میں انگلینڈ میں سر تھامس مور کی تالیفات مغرب میں اس قسم کی مقامی اور درویش منش سوسائٹی کی مسلسل جستجو کی ایک کڑی ہے۔ انیسویں صدی میں انارکسٹ فلسفہ کا ظہور جو سیاسی آثار میں "انارکی حکومت" یا "بغیر حکومت" کے نام سے معروف ہے انہیں آئیڈیل معاشروں کی ایک شاخ ہے۔ انارکیسٹ سوچ اور فلسفہ انگلینڈ کے ویلیم گڈون، فرانس کے پیر جوزف پرودون (۵۸) اور روس کے پیٹر گروپٹکین (۵۹) میں پایا جاتا ہے۔ انارکی یا "بغیر" پسندوں کی حکومت جو بیور کریسی اور ماڈرن صنعتی قدرت پسندی سے خالی ایک آئیڈیل سوسائٹی کے قیام کے لیے کوشاں ہیں، طاقت کو حذف کرنا چاہتے ہیں جبکہ انیسویں صدی کے لبرل و سوشلسٹ اسی طاقت کو حاصل کرنے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ "نا بغیر" پسند انیسویں صدی کے دوسرے حصے میں یورپ میں متحرک تھے۔ (۶۰) مغرب کے معروف فلسفی اور ماہر اقتصادیات ایڈم اسمتھ اور مشہور ماہر حیاتیات چارلیس ڈارون کے آثار میں معاشروں کی ساخت اور ڈھانچوں میں فطرتی اور طبیعی نظام کا کردار اور اس معاملے میں ماحول کا اثرات بخوبی نظر آتے ہیں۔ ایڈم اسمتھ نے جو خود سکاٹ لینڈ کی گلاسکو یونیورسٹی میں فلسفہ اخلاق کا استاد تھا، یورپ میں اقتصادی سسٹم کے ڈھانچے کے لیے نظام طبیعت سے مدد حاصل کی اور چارلس ڈاروین نے کوشش کی کہ اپنے نظریے میں "زندگی کا تانا" کے مفہوم کو انسانی اور حیواناتی ارتقاء اور تکامل میں سمیٹ سکے۔ آج مغربی معاشروں میں ناکامیوں کی وجہ سے ماحولیاتی اور مقامی تحریکوں کو کافی حمایت

حاصل ہو رہی ہے۔ ایک مقامی اور فطرتی سوسائٹی کو تشکیل دینے والوں کے افکار میں درج ذیل عوامل کا خاصہ عمل دخل ہے۔

۱۔ قدرتی نظام کی طرف توجہ

۲۔ اجتماعات میں تعاون

۳۔ سماجی خود مختاری

۴۔ سادہ زندگی لیکن ایک پیچیدہ اور آج کے عالمی نظام کی موجودگی میں اس قسم کے معاشروں کی بقا ایک غور طلب معاملہ ہے۔

انفارمیشنل یا اطلاعاتی سوسائٹی جو پچھلے کچھ عشروں سے مغربی دانشوروں اور حکومتی اہل کاروں کے زیر بحث ہے، درحقیقت برتر صنعتی سوسائٹی کے لیے پیش خیمہ ہے۔(۶۱) یہ خود دوسری عالمی جنگ کے بعد کی پیداوار ہے، اور خاص طور پر امریکہ اور جاپان میں اطلاعاتی اور برتر صنعتی سوسائٹی کے موضوعات رائج تھے۔ جبکہ برتر صنعتی اور اطلاعاتی سوسائٹی کے موضوع پر سب سے پہلے امریکہ کے ڈینئیل بیل اور فرئیس میکلوپ نے قلم اٹھایا۔ جاپان میں اطلاعاتی سوسائٹی پر "جوھوشاکایی" عنوان کے تحت پہلی جامع تحقیق عملی طریقہ کار کی صورت میں لکھی گئی اگرچہ یہاں پر ایسی فرصت نہیں کہ اطلاعاتی یا برتر صنعتی سوسائٹی کے بارے میں جامع اور مکمل بحث کی جاسکے لیکن مندرجہ بالا افراد کے بیان کردہ اہم نکات کا ذکر بے فائدہ نہ ہو گا، خاص طور پر انہی مفاہیم اور سوسائٹیوں کے ساتھ جو پہلے مورد بحث رہی ہیں۔

امریکہ سے تعلق رکھنے والا عمرانیات کا ماہر، ڈینئیل بل برتر صنعتی سوسائٹی کے نظریے کو بیان کرتے ہوئے، اس بات پر زور دیتا ہے کہ یہ تبدیلی پہلے اجتماعی ڈھانچے میں ہوتی ہے، اور اس کے نتائج مختلف سوسائٹیز میں مختلف سیاسی اور تہذیبی صورتوں میں ظاہر ہوں گے۔ برتر صنعتی سوسائٹی اپنی اجتماعی شکل کے لحاظ سے اکیسویں صدی میں امریکہ، مغربی یورپ، جاپان اور کسی حد تک سوویت یونین بالخصوص روس کے اجتماعی ڈھانچے کا بنیادی جز رہی ہے۔ مارکس کے برعکس بل، تاریخ کے جبری تکرر کا قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک برتر صنعتی سوسائٹی اس جامعہ کا ایک اہم حصہ ہے جس میں آنے والی تبدیلیاں اور جس کی مدیریت حاکم سیاسی نظام کے لیے مشکلات کا باعث بنتی ہیں۔ جیسے کہ ثقافتی تبدیلیاں اور زندگی گزارنے کے طریقہ کار میں تبدیلیاں جن کا رسوم و رواج سے تعلق ہوتا ہے۔ اس ترتیب سے نئے اجتماعی گروہ یا

سوسائٹیاں اور کمزور گروہوں کا وجود، طاقت و قدرت اور سوسائٹی میں اعزازات و فوقیت کی تقسیم کے موضوعات کو اجاگر کرتا ہے۔ برتر صنعتی سوسائٹی کا نظریہ، اجتماعی ڈھانچے میں آنے والی تبدیلیوں، اقتصادی امور اور صنعتی نظام کی تبدیلیوں سے منسلک ہے۔

بل دعویٰ نہیں کرتا کہ اجتماعی ڈھانچے میں آنے والی تبدیلیاں اپنے بعد حکومت کے طریقہ کار اور ثقافت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہیں، بلکہ اس کے نزدیک یہ تبدیلیاں سوسائٹی کے دوسرے حصوں کے لیے تحقیق کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ وہ موضوع کو مزید پرکھنے کے لیے سوسائٹی کو صنعتی، غیر صنعتی اور مافوق مادہ میں تقسیم کرتا ہے اور پھر مختلف زاویوں سے اور آپس میں موجود تضادات کے حوالے سے انھیں موضوع تحقیق قرار دیتا ہے۔ بل کے مطابق ایک برتر صنعتی اور انفارمیشنل سوسائٹی کی بنیاد، معاشرے کے لیے خدمات فراہم کرنے پر استوار ہے۔ اس بنا پر یہ سوسائٹی لوگوں کے درمیان ایک کھیل کی مانند ہے اور وہ چیز جو اس کھیل میں اہمیت کی حامل ہے، اطلاعات و معلومات ہیں۔ معاشرے میں اہمیت اسی فرد کی ہے جس نے تعلیم و تربیت حاصل کی ہے اور ایک ماہر کی طرح صنعتی سوسائٹی کو درپیش ضروریات و مسائل کا حل جانتا ہے۔ بل کی تقسیم بندی ایک دوسرے امریکی عمرانیات کے ماہر ڈینیل لرنر کی یاد دلاتی ہے جو اپنی تحقیق میں ہم عصر سوسائٹیوں کو پرانی، ترقی پذیر اور ترقی یافتہ میں تقسیم کرتا ہے۔ وہ پرانی سوسائٹی کی وضاحت ایک ایسے معاشرے سے کرتا ہے جہاں خدمات فراہم کی جاتی ہوں اور ماڈرن یا ترقی یافتہ سوسائٹی کی شناخت پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا اور مصنوعات کی پیداوار سے کرواتا ہے۔ اگر کوئی برتر صنعتی سوسائٹی کو خدماتی سوسائٹی کے برابر سمجھے جس طرح بل کا نظریہ ہے تو اسے ضرور ترقی پذیر سوسائٹیوں کو جنہیں لرنر پرانی سوسائٹی کہتا ہے، انڈسٹریل سوسائٹی سے بالاتر تسلیم کرنا پڑے گا۔

معلومات پر مبنی سوسائٹی اس لحاظ سے قابل غور ہے کہ "انفارمیشل انقلاب" جو انفارمیشنل سوسائٹی کی شناخت ہے، صرف انسان کے حالیہ تمدن کا نتیجہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے ایک اور جگہ پر استدلال کیا ہے کہ اطلاعات و انفارمیشن مکمل طور پر اپنے تینوں مراحل میں (ٹیکنالوجی اور اجتماعی ارتقاء، ۔زراعتی، صنعتی، ۔برتر صنعتی و۔۔۔) ان کی ارتقاء کا ایک اہم جز رہی ہے۔ (۶۲) اطلاعات مہارت اور علم کی صورت میں اپنی سابقہ صورتوں پر بھاری ہے اور بہت مقامات پر اپنے تینوں مراحل کی خصوصیات میں تبدیل

ہو گئی ہے۔ اگر ہم قبول کر لیں بلکہ جیسا کہ قبول کر چکے ہیں، انفارمیشن اور علم صرف صنعتی سوسائٹیوں سے مختص نہیں ہے، تو ہمیں انفارمیشن اور علمی لحاظ سے مغرب کے فلسفہ و علم و ٹیکنالوجی کے حوالے سے تعریف کرنی پڑے گی۔ دنیائے اسلام میں انفارمیشن اور علم کی مثال ریاضی، طب، دواسازی، جغرافیہ، تاریخ، نجومیات، فلسفہ، عمرانیات، ادب ، فن تعمیر و ہنر ہیں، جبکہ ان کے علاہ حمل و نقل اور ارتباطات کے ارتقاء، کاغذ اور کتاب سازی کی صنعت کے ارتقاء اور جہاز سازی کی مثال بھی دی جاسکتی ہے۔ درحقیقت قرون وسطی کے انفارمیشنل اور علمی انقلاب کا سب سے بڑا سبب اسلامی معاشروں کا نمونہ تھا۔ اگر مغربی تاریخ میں قرون وسطیٰ سیاہی اور تباہی کے مترادف ہے تو اسلامی معاشرے اور چند دیگر سوسائٹیوں مثلاً چین میں سنہری سالوں کے مساوی ہے۔

اگرچہ اس مضمون کا مقصد مغربی اور اسلامی سوسائٹی کے ارتقاء کا تقابلی جائزہ لینا نہیں ہے لیکن مغرب میں "انفارمیشنل سوسائٹی" کے عنوان کے تحت جاری بحث کے بارے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اسلام میں حصول علم کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ سوسائٹی کا تصور، مکمل طور پر اسلامی اجتماع میں وجود رکھتا تھا اور اسی تصور نے قرون وسطی کے اسلامی تمدن میں قومی، اقتصادی، قرابت داری، سیاسی اور مشترکہ مفادات کی وابستگیوں کے بجائے علمی اور انفارمیشنل انقلاب کی راہ ہموار کی۔ اسلام کے مطابق اجتماعی سیاست اور انفارمیشن کو ایک دوسرے سے جدا رکھ کر ترقی نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد و مختلف قوتیں نہیں ہیں۔ مغربی تاریخ میں اس سبب کا فقدان قرون وسطیٰ اور قدیم دور کے یورپ کی سوسائٹیوں کے فکری بحران کے دلائل میں سے ایک ہے۔ گذشتہ پانچ صدیوں میں دنیائے اسلام میں توقف اور عدم حرکت، اس دور سے شروع ہوا جب داخلی قوتوں نے قومی اور ملی بنیادوں پر اور خارجی قوتوں نے سامراجی بنیادوں پر اختلافات کو ہوا دی اور تقسیم کرنے کے طریقہ کو اختیار کیا۔ ایک طرف سے اسلامی اور ماڈرن علوم میں جدائی اور دوسری طرف سے ایک تجملاتی اور پر آسائش زندگی کی طرف رغبت اور مادیت اور ما بعد الطّبیعۃ علوم دوسری طرف اسلامی معاشرے کے زوال کا باعث بنا ہے۔ اس طرح علم و ہنر کے بارے میں اسلامی تفکر، عملاً عدم حرکت کا شکار ہو گیا اور مغرب کی علم و دانش سے وابستگی کا آغاز ہوا۔ یورپ میں علمی اور صنعتی انقلاب کے نئے دور سے سہم کر مسلمان حکام کمزور ہو گئے اور اجتماع کو چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کرنے کے ذریعے اور "جدید نظم و ترتیب" کی پیدائش سے خوف کھا کر رشد و ترقی کے

مغربی ماڈل کی پیروی کرنے لگے۔ اور اپنی سوسائٹیوں کو جدید بین الاقوامی سیاسی و اقتصادی نظاموں کے ماتحت کر دیا۔ عمرانیات اور علم استشراق، اور ماڈرن بیوروکریٹ طبقہ کی پیداوار مغربی تعلیمی نظام کے ساتھ وابستگی کے ہمراہ ان کا ظہور ایک پیچیدہ شکل میں ہوا۔ ایک ایسا طبقہ جس کے سیاسی رہنما اس جدائی اور تقسیم کی تحریک کو قانونی شکل دینے میں تیزی اور سرعت کے موجب بنے۔ آج کل سول سوسائٹی کے بارے میں گفتگو اور اس کے مفہوم کا مطالعہ اور تحقیق ان تاریخی تبدیلیوں کی حدود میں ہونی چاہئیں۔

تیسرا باب

سول سوسائٹی کا مفہوم

مغربی دنیاکے سیاسی افکار میں سول سوسائٹی کا موضوع بڑی اہمیت کاحامل ہے۔۔ صدیوں سے مغربی دنیا میں سیاسی اور اجتماعی فلسفہ کی خاص توجہ سوسائٹی اور اس کی قیادت جیسے موضوعات کی طرف رہی ہے۔ ایسی سوسائٹی یا معاشرہ جو وقت کے ساتھ ختم ہوااور ایسی سوسائٹی یامعاشرہ جو وجود میں آیا۔ ایسے لیڈر جن کی لیڈرشپ ختم ہوئی اور ایسے جن کی لیڈرشپ وجود میں آئی۔ لیکن جہاں مغربی دنیامیں اجتماعی اور سیاسی افکار کی بنیاد سوسائٹی یا سوسائٹی کے بارے میں تحقیق، ہوا کرتی تھی، وہاں سماج اور سماج مخالفوں کے درمیان ٹکراؤ بھی، اسی سکہ کا دوسرا رخ ہوا کرتا تھا۔ ایک ایسے معاشرے کے قیام کی راہ میں سول سوسائٹی کاایسا مفہوم پیش کرنا جس میں حکومت اور عوام کے حقوق واضح طور پر پہچانے جا سکیں مغربی دنیا میں سیاسی اور اجتماعی فلسفہ کی ایک کوشش تھی۔

سوسائٹی کے بارے میں یہ بنیادی تحقیقات اور ایک آئیڈیل سوسائٹی جس کی ہمیشہ سے مغربی دنیا کو تلاش رہی ہے، سوسائٹیز کے بارے میں تقابلی جائزے میں اور بالخصوص مغرب اور اسلام کے درمیان موازنہ میں انتہائی اہم ہے۔ سماج مخالف یا اینٹی سوسائٹی کا مفہوم اور کلمہ نہ صرف اسلامی ثقافت میں وجود نہیں رکھتابلکہ ایسے شواہد بھی نہیں ملتے جو مسلمانوں میں اس فکر کے وجود یا مسلمانوں کی تاریخ میں اس کے وجود پر دلالت کرتے ہوں۔ اگر چہ اسلام میں سیاسی اختلافات موجود ہیں لیکن اسلامی امت اجتماعی و معاشرتی تعصّبات سے کافی دور رہی ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ اسلامی تعلیمات کا نسل پرستی، قوم پرستی اور نیشلزم سے دور ہونا ہے جو تاریخ اسلام اور مغربی تمدن کی تاریخ کے درمیان پایا جانے والا ایک بہت بڑا فرق ہے۔ اور اس سلسلے میں اس فرق کا ذکر کرنا اور یاد دلانا، مغربی دنیا کی سول سوسائٹی کی وضاحت اور تعریف کے لیے ضروری ہے۔

آج کل کچھ لوگ ایران میں سول سوسائٹی، اس کے وجود، ظہور اور اسکی وسعت کے بارے میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں، اور کچھ لوگ سول سوسائٹی کی اچھائیوں کو دوسروں کے لیے بیان کرتے ہیں اور اسے

تمام مشکلات کا حل شمار کرتے ہیں۔ یہ بیان کئے بغیر کہ اس سوسائٹی کا معنی اور مفہوم کیا ہے؟ اس لفظ اور موضوع کی بنیاد اور اصالت کیا ہے؟ اور یہ کس قدر لوگوں کی خواہشات اور آرزؤں کو پورا کرنے میں کامیاب اور مؤثر ہے؟ کون سے اداروں کا قیام اس قسم کی سول سوسائٹی کے لیے ضروری ہے؟ کچھ لوگ سول سوسائٹی کو قانون کے احترام اور فرد اور اجتماع کی آزادی سے تعبیر کرتے ہیں، اکثر لوگ، چاہے جنہوں نے اس لفظ کو رائج کیا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں یا چاہے وہ لوگ جن تک میڈیا کے ذریعے یہ لفظ پہنچا، یا ادھر اُدھر سے اس لفظ کو سنا، وہ اس بارے میں کہ اس سول سوسائٹی کے جوانب اور اچھائیاں یا برائیاں کیا ہیں، وہ زیادہ اس بارے میں جاننا نہیں چاہتے، ایسے لوگ صرف یہ سمجھتے ہیں کہ سول سوسائٹی کے وجود میں آنے اور اس کے رائج ہو جانے سے ان کی زندگی بہتر بن جائے گی۔

اس قسم کی گفتگو، اور مغربی سول سوسائٹی کی تحلیل و تنقید کیے بغیر اس کی تقلید کرنا، مجھے اُن مباحثوں اور کمیونسٹ نظام کے زوال کے زمانے میں مشرقی یورپ کے آزاد خیال لوگوں کے رجحانات کی یاد دلاتا ہے۔ مشرقی یورپ کہ جو طویل عرصے تک ڈکٹیٹرشپ اور سوشلزم کی گھٹتی فضاؤں میں مصائب جھیلتا رہا تھا، ایک سول سوسائٹی کے طلوع کو کہ جو اس فرسودہ نظام کی جگہ لے، اور جو حکومت کی طاقت کے مقابلے میں فرد اور اجتماع کے لیے آزادی کی فضا ہموار کرے، ضروری اور لازمی جانتے تھے۔ سول سوسائٹی کا مفہوم جو ایک صدی سے بھی زیادہ فلسفی کتب کے صفحات میں گم ہو چکا تھا اور یہاں تک کہ طلباء اور میڈیا میں بھی زیر بحث نہیں تھا، سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ مشرقی یورپ میں دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اور یورپ کے ذریعہ امریکہ تک بھی جا پہنچا، اس طرح سے کہ کچھ سال پہلے دانشور حضرات کی توجہ کا مرکز بنا اور بعض حکمرانوں نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا، حتی کہ بعض لوگوں نے آج کل کے مغربی معاشرے میں "سول پریس □ پر زور دیا لیکن آج جبکہ سابق سوویت یونین کو پاش پاش ہوئے چھ سال کا عرصہ گزر چکا، خود مشرقی یورپ کے آزاد خیال لوگ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ خود سول سوسائٹی، سیاسی اور اقتصادی اختیارات کے مخصوص اور چند ہاتھوں میں چلے جانے کا سبب اور وسیلہ ہے اور ان ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام کے لیے گرین سگنل "Green Signal" ہے۔

مغربی دنیا میں سول سوسائٹی کا مفہوم طویل تاریخ کا حامل ہے لیکن انیسویں صدی اور اس کے بعد سے، سول سوسائٹی کا موضوع، فکری دائرہ کار کے عنوان سے جدید یورپی سوسائٹیز اور دوسرے صنعتی ممالک

کے تکامل کی تحلیل کے لیے، فلسفی اور عمرانیاتی موضوعات کے انتہائی اختلافی ابحاث میں سے ہے۔ مثلاً جرمن فلسفی ہیگل کی نگاہ میں جس طریقے سے حکومت سوسائٹی کے درمیان ایک آئیڈیل رابطے کا سبب بنتی ہے۔ سول سوسائٹی اس کے برخلاف، ذاتی شوق اور افرادی اور گروہی سرگرمیوں کو شامل ہے۔ اِن دونوں کے درمیان اتحاد کئی اداروں کے ذریعہ سے وجود میں آ سکتا ہے۔ اس عبارت میں حکومت اور سول سوسائٹی جو خود حاکمیت اور قوانین رکھتی ہے، ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ مغربی دنیا کی سیاسی تاریخ کی ثقافت میں ہمیشہ سے سول سوسائٹی کو حکومت کے مقابلہ میں اور ایک مخالف کے عنوان سے جانا گیا ہے۔ ہیگل خود ہی مغربی معاشرہ میں حکومت کو عالی ترین اور بہترین مرتبہ، قرار دیتا ہے اور آج کل مغربی دنیا میں سرکاری اداروں کی طاقت، اسی فلسفی اور مفکر کی افکار کی مرہون منت ہے۔ حکومت کے مفہوم اور سول سوسائٹی کے درمیان اختلافات کبھی بھی مغربی دنیا میں حل نہیں ہوسکے۔ امریکہ اور یورپ کی جمہوریت اور لبرل ازم کی کوشش تھی کہ اس مسئلہ کو پارلیمانی اداروں، انجمنوں اور جماعتوں کی آزادی، پریس کی آزادی اور غیر سرکاری اداروں کی اصلاح وترمیم کے ذریعہ سے مضبوط کرے، کمیونسٹ اور سوشلسٹ جو ہیگل کے نظریات کو قبول کرتے تھے، حکومت کی طاقت اور مضبوطی کو مزدوروں اور محنت کشوں کی نمائندگی کے عنوان سے جانتے تھے، سول سوسائٹی اور حکومت کے درمیان اس اختلاف سے چشم پوشی کرتے تھے۔ چنانچہ مارکس، سول سوسائٹی اور حکومت کے درمیان بنیادی اختلافات کا قائل تھا اس کے باوجود وہ حکومت کی مختلف صورتوں کو آئیڈیل جانتا تھا اور ان صورتوں کو مادّی زندگی کی اساس کے طور پر تسلیم کرتا تھا۔

اس طرح سے گذشتہ صدی میں سول سوسائٹی کا مفہوم اور جمہوریت مغربی دنیا میں ایک دوسرے کے مترادف ہوئے۔ اس کے اہم ترین پہلوؤں کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔ ۱۔ انفرادیت پسندی۔ ۲۔ سیکولرازم یا حکومت اور سیاست کا دین سے علیحدہ ہونا۔ ۳۔ ذاتی زندگی۔ ۴۔ بازار اور طلب و رسد۔ ۵۔ پلورلزم (کثرت پسندی)۔ ۶۔ اجتماع میں طبقات کا امتیاز یعنی سوسائٹی کا مختلف طبقات سے وجود میں آنا، لیکن اس کا لازمی امر یہ نہیں ہے کہ ہر طبقہ کے لیے مختلف قانون ہوں۔ موجودہ صدی میں لبرلزم، سرمایہ داری، کیمونزم، سوشلزم کی سوسائٹیز کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ یہ پانچوں پہلو ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں اور یہی اختلافات مغربی نظام کی ان آخری دھائیوں میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی بحران کی بنیاد اور سبب بنتے ہیں۔ انفرادیت پسندی، معاشروں کے سقوط، اور انفرادی افسردگی اور کنارہ کشی پر ختم

ہوئی۔ بڑھتی ہوئی جدید ٹیکنالوجی اور کلچر نے ذاتی زندگی اور اس کی حاکمیت کو محدود کر دیا۔ بازار اور خرید و فروخت، سرمایہ دارانہ نظام کے تحت چند افراد کے ہاتھوں میں منحصر ہو کر اپنی شکل تبدیل کر بیٹھا۔ اور کثرت اور تنوع پسندی بھی مصنوعی اور مسخ ہو کر رہ گئی۔ نہ صرف طبقاتی فرق زیادہ ہوا بلکہ سوسائٹیوں میں آزادی، عدل و انصاف اور اشخاص کے حقوق پر حملہ ہوا۔ اِن آخری عشروں میں امریکی اور یورپی، حکومتوں کی لوگوں اور عوام کے امور میں مداخلت نہ صرف کم نہیں ہوئی بلکہ اور زیادہ بڑھ ہو گئی ہے۔

مغربی دنیا میں آج کل سول سوسائٹی کے افکار کا دوبارہ زندہ ہونا اِن چار بحرانوں کا نتیجہ ہے جو مغربی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ا۔ سوشلسٹ ممالک میں حکومتی سرمایہ داری کا بحران اور شکست اور اس کے سماجی اور سیاسی نتائج۔ ۲۔ سیاسی گروہوں اور جماعتوں میں اور ان سے منسلک افکار میں بحران، فساد اور ٹوٹ پھوٹ۔ ۳۔ یورپ اور امریکہ میں عوامی اداروں کی کمزوری۔ ۴۔ بڑے پرائیویٹ اداروں کا وجود میں آنا اور اس کے نتیجہ میں پیداوار اور اس کی تقسیم کا منحصر ہونا اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت میں حکومتی اداروں کا کمزور ہونا۔

یہی وہ مرحلہ ہے جہاں مغربی سول سوسائٹی کے آئیڈیل ہونے کا مفہوم کئی زاویوں سے اسلامی معاشرہ کی تعلیمات اور اسلام کے کئی بنیادی آداب جیسے عقیدہ توحید، معاشرہ اور حکومت کے مفہوم سے اختلاف رکھتا ہے۔ مغربی دنیا کی جانب سے اسلامی ممالک اور خصوصاً ایران میں سول سوسائٹی کی تعریفیں کرنا، بغیر اس کے کہ مغربی دنیا اِن جوانب کی طرف توجہ کرے، خطا اور غلطی کا سبب بنتی ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ موجودہ صدی میں ایک ایسے وقت پر مغربی سول سوسائٹی کا مفہوم اور مغربی مادی سوسائٹی کا مفہوم اسلامی ممالک کی اجتماعی زندگی میں پیش کیا گیا جب دفاعی قوت اپنے کم ترین درجہ پر تھی۔ ضروری ہے کہ سول سوسائٹی کے معنی کو ہم کلچر اور اسلامک سوسائٹی میں تلاش کریں اور اس کا احساس کریں۔

سول سوسائٹی لاطینی زبان کا لفظ ہے کہ جسے معروف اور مشہور یونانی فلسفی ارسطو نے (۳۸۴ سے ۳۲۲ قبل از مسیح) استعمال کیا ہے (۶۳)۔ ارسطو کی نظر میں سول سوسائٹی ایک سیاسی سوسائٹی ہے اور حکومت اور سول سوسائٹی کے درمیان کسی قسم کا فرق موجود نہیں ہے۔ مغربی دنیا میں اِن دونوں کے درمیان فرق سترہویں صدی کے آغاز میں اور اس کے بعد کے مفکرین کے آثار میں شروع ہوا۔ ارسطو کی اصلی بحث،

حکومت اور شہر یا شہری حکومت کے نام سے معروف ہے۔ ارسطو سیاسی اور اقتصادی میدان اور اس طرح کی سیاسی شہریت کو خاندان اور ایک گاؤں یا دیہات جو کہ انسان کی بنیادی اور ابتدائی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آتا ہے، کے مقابلے میں قرار دیتا ہے اور بحث کرتا ہے۔ وہ فلسفی نظام اور افکار جنہیں ارسطو نے پیش کیا اور اوائل اسلام میں مسلم دانشمندوں نے جنہیں ترجمہ کیا، اور پھیلایا، یورپ کے فلسفہ، افکار، مذہب، علم اور ادب کی اساس اور بنیاد بن گئے۔ یورپ کے ابتدائی سیاسی افکار میں ارسطو کا اثر و رسوخ اتنا زیادہ تھا کہ اگر صرف تاریخی واقعات کی مثال کے ذریعے بیان کیا جائے تو کافی ہوگا۔ سیاسی معاشرے کی شہریت (جس کا مرکز ارسطو کی نظر میں اس وقت شہر ایتھنز تھا) اور عوام کا اس میں حصہ لینا سول سوسائٹی کو تشکیل دیتا تھا۔ ارسطو کہتا ہے کہ: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام سوسائٹیز سول سوسائٹی کا حصہ ہیں۔ خاندان والوں اور گاؤں والوں کے علاوہ، لوگوں کا ایک دوسرے سے رابطہ سول سوسائٹی کے ذریعہ سے برقرار تھا۔ اُس کے نزدیک سول سوسائٹی ایک متمدن سوسائٹی تھی۔ جو ابتدائی اور غیر متمدن سوسائٹی سے فرق رکھتی تھی۔ ایک ایسی سوسائٹی جو برابری اور مساوات کی حامل تھی جس میں سب لوگ اپنی طاقت اور اہمیت کے لحاظ سے حصہ دار تھے۔ بطور خلاصہ ارسطو کے نزدیک سول سوسائٹی ایک ایسی سوسائٹی تھی جس میں قانون حاکم تھا۔

قدیم یونان کا زمانہ ختم ہونے اور اس کے بعد روم کی بادشاہت کے خاتمہ کے ساتھ ہی مغربی دنیا اور یورپ میں تاریکی اور جہالت کا ایک طویل دور خاتم ہوا اور سترہویں صدی میں ایک بار پھر سول سوسائٹی کا مفہوم نشات ثانیہ کی دی ہوئی ترقی کے ساتھ اور یورپی معاشرہ کی بیداری اور علمی اور صنعتی میدانوں میں ان کے تحرکات کے ساتھ یورپی دانشوروں کی توجہ کا مرکز بنا۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ وہ ہزار سالہ دور جو مغربی دنیا اور یورپ جہالت اور تاریکی میں گذار رہا تھا، اسلام اور بعض دوسری مشرقی تہذیبوں، جیسے چینی اور ہندوستانی تمدن کا سنہری دور تھا۔ لیکن وہ آثار جو سول سوسائٹیز سے متعلق ہیں اُن میں انتہائی مختصر انداز میں یہ دور بیان ہوا ہے بلکہ ترقی یافتہ اور جدید سوسائٹیز جن کا تعلق یورپ سے نہیں تھا ان سے مکمل طور پر چشم پوشی کی گئی اور انہیں نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ کمزوری اور تحقیقات میں غفلت انتہائی قابل افسوس ہے، کیونکہ نہ صرف غیر یورپی سوسائٹیز کی طرف عدم توجہ، خاص طور پر وہ زمانہ جب یورپ میں جاگیر دارانہ نظام رائج تھا، ایک علمی انحراف اور تحقیقاتی غلطی ہے۔ اور سول سوسائٹی کو ایک یورپی تخلیق کے طور پر پیش

کرکے عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ کو صرف اور صرف مغرب اور یورپ کی طرف سے پیش کرتا ہے۔ بین النہرین کے اسلامی معاشروں میں، ایران، مرکزی ایشیا، جنوبی افریقہ، اسپین، اور ایشیا کے دیگر مناطق میں قرون وسطی میں سول سوسائٹی، عوامی نمائندگی، غیر سرکاری ادارہ، انجمنیں، اصناف، شہری اور سیاسی روابط، کس شکل و صورت میں تھے؟ ہندوستان، چین اور امریکہ کے اصلی باشندوں کی تہذیبوں میں جو بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے، سیاسی اور جمہوری تعلقات کس طریقے سے رائج تھے؟ (ان موضوعات پر تحقیق کی بہت ضرورت ہے)

یورپ میں آٹھویں صدی سے پندرہویں صدی تک مختلف قسم کی تبدیلیاں وجود میں آئیں۔ مثال کے طور پر زراعت کا تجارتی ہونا، نوٹوں کے تناسب میں اضافہ، دوسرے خطوں کے ساتھ تجارتی روابط کا وجود میں آنا، شہریوں کا کلیسا کے نظام کے ساتھ ٹکراؤ، سماجی اور سیاسی اداروں میں غیر معمولی قسم کی تبدیلیوں کا پیش آنا وغیرہ۔ اور یہ تبدیلیاں سبب بنیں کہ ایسی صنعتی انجمنیں وجود میں آئیں جن کے اراکین پیشور اور ماہر افراد تھے۔ یہ تمام تبدیلیاں سبب بنیں کہ شہریوں کے متوسط طبقہ نے ایک آزاد قانونی گروپ کے عنوان سے حکومت سے کچھ نئے مطالبات کئے، تا کہ حکومت اور عوام کے درمیان ایک نئے اور جدید رابطہ کی کسی حد تک تعریف کر سکیں، اور یہی وہ موقع تھا جب فطری حقوق کے موضوع پر لکھنے والے افراد نے سول سوسائٹی کو قدرتی اور ابتدائی کیفیت کے مقابلے میں پیش کیا۔ ان شرائط میں لوگ اپنے کام اور پیشہ کے ساتھ فطرت میں عمل دخل کرنے لگے اور اس تصرف اور عمل دخل کے ذریعہ اس کے مالک بننے لگے۔ لیکن انسانی خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی اور غیر محدود آزادی ہر ایک کو دوسرے کے مد مقابل لا کھڑا کر سکتی ہے، اور مفادات کی جنگ کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ ہابز کے بقول ان شرائط میں صنعت اور تجارت اس قابل نہیں رہتی کہ رشد اور ترقی کرے۔ یہاں پر یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے کچھ فطری حقوق سے صرف نظر کرے اور ان حقوق کو حاکم کے اختیار میں دیدے۔ اس طریقے سے سول سوسائٹی کا قیام ضروری اور اجتناب ناپذیر ہو جاتا ہے۔ اور حکومت اور سول سوسائٹی کے درمیان جدائی اور علیحدگی نے سولہویں صدی کے بعد آنے والی صدیوں میں سیاسی افکار کو جنم دیا اور ان سیاسی افکار میں ایک توازن کو پیدا کیا۔ انگریز فلسفی ہابز (۶۴) (۱۵۹۶۔۱۶۵۰) نے اس بات کی کوشش کی کہ سترہویں صدی کے یورپ میں رائج جدید علوم کے ذریعہ فرد اور سوسائٹی کے درمیان رابطہ کو معین کرے اور اس بحث میں سیاسی

سوسائٹی کے کردار کو بیان کرے۔ ہابز کے لیے ہر قسم کی حکومت کا وجود، چاہے بادشاہت ہو چاہے قبیلہ کی حکومت، چاہے فیوڈل حکومت یا چاہے ایک ماڈرن حکومت، یہ سب حکومتیں ایک ٹکراؤ کا نتیجہ ہیں اور ہر گز بھی ایک ضرورت کی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ انسانی معاشرہ میں سوسائٹی اور سیاسی نظاموں کے لیے سول سوسائٹی کی حیثیت ایک کلی اور عام عنوان کی تھی۔ ارسطو کے برعکس ہابز انسان کے لیے پولیٹیکل سوسائٹی کو ایک فطری اور پسندیدہ شے کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، بلکہ ایک ایسے معاشرے کی طرح دیکھتا ہے جہاں انسان ایک دوسرے کو بھیڑیوں کی طرح کاٹتے ہیں۔ ہابز کے نظریات میں انسان سیاسی حیوان نہیں تھے بلکہ ان کا وجود سیاسی میدانوں میں تجارت اور فخر و مباہات کے لیے تھا۔ اسی بنا پر ضروری تھا کہ سوسائٹی میں انسان اپنے مفادات اور خواہشات کو فوقیت دے اور ان کی طرف توجہ دے۔ اس کی نگاہ میں اس قسم کے مسائل اور ڈر و خوف تھا، جس کی وجہ سے انسان مجبور ہوا کہ ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی روابط قائم کرے اور یہی چیز ہابز کے لیے سول سوسائٹی یا پولیٹیکل سوسائٹی کی بنیاد بنی۔

سترہویں صدی عیسوی میں ہابز کے ہم عصر ایک اور جرمن مفکر اور فلسفی گاڈفریڈ لایبنیٹز (۱۶۴۶۔ ۱۷۱۶) نے پولیٹیکل سوسائٹی سے متعلق ہابز کے نظریات کو ردّ کیا۔ لایبنیٹز کا نظریہ حاکمیت اور پولیٹیکل سوسائٹی کے بارے میں کسی بھی طرح ہابز کے نظریات کے ساتھ سازگار نہ تھا۔ وہ خالص حاکمیت کا مخالف تھا اس کے نزدیک حاکمیت محدود حقوق مثلاً مالکیت کے حقوق رکھتی تھی، اور یہ چیز دونوں قسموں کی حکومت یعنی سیاسی اور دینی حکومتوں کے بارے میں صادق آتی تھی اور اسی نظریے کے سبب لایبنیٹز نے معاشرے میں تسلط رکھنے والے امیر یا حاکم کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ قانونی اور قضائی حاکم، ملکیتی حاکم اور مقتدر حاکم۔۔ امیر یا حاکم کے لیے اس قسم کی تقسیم یعنی جغرافیائی، عدالتی اور سیاسی، حاکم کے کردار یا سیاسی حاکم کو اعلیٰ جنگی عدالت، معاہدوں اور عہد و پیمان میں اور سوسائٹی یا ملک کے اندرونی یا بیرونی مسائل کی حد تک محدود کرتی ہے۔ لایبنیٹز کے نزدیک کوئی شخص یا بادشاہ کبھی بھی خدا کا نمائندہ بن کر یا اس کے سائے میں، مطلق حاکمیت کا حق نہیں رکھتا۔ جو چیز اس جرمن مفکر کی تالیفات میں سول سوسائٹی کے موازنے کے اعتبار سے قابل توجہ ہے، وہ یورپ کے بادشاہوں اور حکمرانوں کا مسلمان حکمرانوں اور بادشاہوں بالخصوص اس دور کی عثمانی سلطنت سے موازنہ اور مقائسہ ہے۔

لاینیٹز عثمانیدور کی اسلامی سوسائٹی کے اصول سے متاثر تھا، وہ اپنے حاکمیت اور سول سوسائٹی کے متعلق نظریات کو ثابت کرنے اور ان کے دفاع کے طور پر سترہویں صدی میں عثمانی بادشاہ، سلطان ابراہیم کی برطرفی کا تفصیلاً ذکر کرتا ہے جو اس کے فساد اور عدم لیاقت کی وجہ سے علماء اور عوام کے ذریعہ سے وجود میں آئی اور اس کو بادشاہت سے کنارہ گیر ہونا پڑا۔ وہ اسلامی اور شرعی قوانین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور سلطنت عثمانی ایک سلطنتی حکومت اور اسلامی سوسائٹی کا مجموعہ ہونے کا اظہار خیال کرتا ہے کہ حتی بادشاہی نظام میں جو اس دور میں اسلامی سوسائٹی میں رائج تھا، سلطان یا بادشاہ ایک سول سوسائٹی میں ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ خود کو قانون سے برتر و بالاتر سمجھے۔

ہماری نظر میں اگر لاینیٹز شریعت، قرآن اور تاریخ صدر اسلام کا باریک بینی سے مطالعہ کرتا تو بے شک اس نتیجہ پر پہنچتا کہ حتی اسلام کی نگاہ میں بھی حاکمیت کا رتبہ اور درجہ اپنی اصل جگہ سے بہت زیادہ اوپر جا چکا ہے۔ حاکمیت کا حق صرف خداوند عالم کے پاس ہے، نہ بادشاہوں کے پاس، نہ گروہوں کے پاس، نہ لوگوں کے پاس، نہ کلیسا کے پاس ہے اور نا ہی معبدوں کے محافظوں کے پاس ہے۔ وہ چیز جو قابل ملاحظہ ہے وہ یہ کہ آج کل جو آثار اور تألیفات سول سوسائٹی کے بارے میں رائج ہیں ان میں اُن نظریات کے بارے میں جو لاینیٹز اور اسی طرح کے دوسرے مفکرین نے اسلامی سوسائٹی کے بارے میں دیے، کوئی بھی اشارہ نہیں ملتا۔ اور یہی لاعلمی یا عدم آگاہی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ آج کل کے سول سوسائٹی کے بارے میں لکھنے والے کس قدر یورپی مفکرین کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور کس قدر منابع اور مآخذ میں کاٹ چھانٹ کرتے ہیں اور کس قدر اِن کی علم اور دانش میں کمی ہے۔ سترہویں صدی میں عثمانی سلطنت تین سو سال کی بقاء کے بعد تدریجاً کمزور ہو رہی تھی بغیر کسی شک وتردید کے جس چیز نے اس ایشیائی اور یورپی سپر پاور کو آنے والی دو صدیوں تک یورپی سیاسی نظام اور سوسائٹیز میں زندہ رکھا وہ اسلامی تعلیمات کا اثر اور اسلام کی دی ہوئی جمہوریت ہی تھی کہ جسے کم از کم مشروعیت اور اجتماعی تعلق کو ترکی کی عثمانی حکومت اور اس سے متعلق ریاستوں میں محفوظ کیا ہوا تھا۔

ہابز اور لاینیٹز دونوں ایک دوسرے کی مخالف سمتوں کی جانب رواں دواں تھے ہابز کا کہنا تھا کہ جو کچھ کوپرنیک، گالیلہ اور ہاروی نے طبیعی اور ریاضی علوم کے لیے انجام دیا ہے، خود اس نے سماجی علوم اور سیاست کے لیے انجام دیا ہے۔ ہابز نے ان مظالم اور خرافات کی وجہ سے جو اس نے گذشتہ صدیوں کے

دوران کلیسا میں مشاہدہ کیا تھا اور اس کے نتیجے میں قرون وسطی کی یورپی سوسائٹیز کی جہالت کی وجہ سے، دین، مذہب معنوی اخلاق سے دوری اختیار کرتے ہوئے ان چیزوں سے بیزاری کا اظہار کیا، اسی وجہ سے وہ یہ چاہتا تھا کہ انسان کو اس کی ظاہری اور اصلی شکل میں دیکھے اور اس کے اجتماعی پہلو کا اندازہ کرے اور اسے بیان کرے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ جو کچھ ابن خلدون (اس سے دو صدیاں پہلے سماجی اداروں کے بارے میں علمی انداز میں تدوین کرکے عمرانیات کا بانی کہلا چکا تھا اور سیاسی اور اقتصادی علوم کے پھیلاؤ کے لیے راہ ہموار کر چکا تھا۔) نے انجام دیا اور اس کی بنیاد رکھی، اس کے انجام دیئے ہوئے کام کو طبیعیات اور کیمیا کی شکل میں انجام دیں اور اسی وجہ سے اس کے بعض سیاسی آثار میں یورپ میں سماجیات کے بزرگ کے عنوان سے ذکر ہوا ہے۔

جبکہ مکیاولی اپنی تقاریر اور اپنے رسالہ میں یہ اظہار کرتا ہے کہ کس طریقہ سے سیاست اور حکومتی امور میں طاقت کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہابز کی یہ کوشش تھی کہ وہ ثابت کرے کہ کس طریقہ سے ماکیاولی کا نظریہ نے عملی شکل اختیار کی اور اپنے آخری ہدف اور مقصد تک پہنچا۔ سول سوسائٹی کے بارے میں ہابز کی سماجی قرارداد یہ ہے کہ افراد کے ذریعے طاقت کو ہاتھ میں لینا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ شہریوں کو حاکم کی اطاعت کرنی چاہئے لیکن یہ کہ ان کی جان خطرہ میں نہ ہو۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کیا ہابز نے اس سے نو صدیاں پہلے لکھی جانے والی کتاب یعنی کتاب کلیلہ ودمنہ کے ترجمے کا مطالعہ کیا تھا یا نہیں، لیکن جو کچھ اس انگریز فلسفی نے سوسائٹی کے مزاج، تند روی اور اطاعت کے بارے میں ذکر کیا ہے، صدیوں پہلے اسلامی تمدن کے متون میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہو چکا تھا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اسلامی تمدن کے زمانے کے مفکرین اس بات کے قائل تھے کہ انسان کی طبیعت اور مزاج اچھا اور برا پہلو رکھتا ہے۔ لیکن اگر انسان کو اس کی فطری حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اس کا رجحان پسندیدہ اخلاق اور اچھے آداب کی طرف ہی ہوگا۔

یورپ میں سترہویں صدی کے اواخر میں ایک طرف لوگوں کے کردار اور حکومت میں عمومی افکار کی شراکت کا موضوع، محل بحث تھا اور دوسری طرف درگزر یا تساھل وتسامح جس کو انگریزی میں ٹالرینس کہتے ہیں، موضوع بحث اور گفتگو تھا۔ اس بارے میں جان لاک (۶۵) (۱۶۳۲۔ ۱۷۰۴) انگریز فلسفی کے نظریات اور افکار کا مطالعہ کرنا بہت اہمیت کا حامل ہے۔

کیونکہ دینی تعصّبات اور اسی طرح قومی اور قبیلہ کے تعصّبات اور سول سوسائٹی کے مقابلہ میں تساہل اور تسامح کے بارے میں اس کی تالیفات اور گفتگو، موجودہ دور کے مغربی افکار کے ایک بڑے حصہ کو تشکیل دیتا ہے۔ در گزر یا ٹالرینس جو آج کل سوسائٹیز میں بحث اور گفتگو کا اہم مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کی لمبی جڑیں سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے یورپی افکار اور نظریات میں پائی جاتی ہیں۔ آج کل فارسی زبان کے ذرائع ابلاغ کی گفتگو میں ٹالرینس کا ترجمہ تساہل اور تسامح کیا جاتا ہے اور اس کی تعریف اور معنیٰ میں "مدارا، بردباری، آسان لینا، برداشت اور قبول کرنا" جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح سے لاک نے ٹالرینس کے لفظ کو استعمال کیا ہے اس کا تعلق عقائد اور کردار یا برتاؤ سے تھا۔ قبول کرنا اور ضرورتاً کسی چیز کی تائید کرنا جو مدمقابل کو قبول نہیں ہے۔ تساہل اور تسامح لغوی لحاظ سے صرف ایک معنی نہیں رکھتے اور ان کی تعریف اور ان کے بارے میں گفتگو ضروری ہے کہ اسلامی تاریخ اور مغرب کے دائرہ میں علیحدہ علیحدہ کی جائے۔

لاک اپنی کتاب جو اس نے ۱۶۶۷ء میں ٹالرینس کے بارے میں لکھی اس میں ٹالرینس کو تعصّبات کے مقابلے میں قرار دیتا ہے۔ اس بارے میں اور سول سوسائٹی کے بارے میں اپنی گفتگو میں اس کی کوشش تھی کہ یکسانیت اور یک رنگی کے قیام اور اس کی بقاء کے خطرے کو سوسائٹی میں واضح کرے۔ یورپی اشراف پسندی، خرافات، تعصب پسندی، فیوڈلیسٹی جیسے مسائل کہ جو حکومت پر کیتھولک کلیسا کے تسلط سے جڑے ہوئے تھے، اس عظیم فلسفی کو پریشان کئے ہوئے تھے۔ اور پروٹیسٹنٹ فرقہ کی طرف سے کی جانے والی اصلاحات اور جدت ہر گز اس بات پر قادر نہ تھیں کہ اختلافات اور فکری جمود میں کمی لاسکیں۔ لاک اس کتاب میں خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ کس طریقہ سے مسیحیت جو اس فرقہ بندی، جنگ اور بے چینی کو سول سوسائٹی میں ایجاد کرتی ہے، اس بات پر قادر ہوگی کہ دوسروں کے اظہار عقیدہ اور فکر کے حق کو قبول کرنے کے ساتھ، نقصانات اور سازشوں کو روک سکے۔ "تسامح اور تساہل کا مسئلہ اس دور کے مغربی سیاسی حلقوں میں کچھ اس طرح پیش ہوا کہ: سیاسی طاقتیں کون سے عقائد کو روکنے کا حق رکھتی ہیں؟

سوال کا اصلی موضوع یہ نہیں تھا کہ سیاسی طاقتیں مثلاً حکومتیں، مذہبی عقائد کو پر سوال اٹھائیں اور اُن کو پھیلنے سے روکیں بلکہ اس زمانہ میں اصلی نکتہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں کن عقائد کو قانونی حق دیا جائے۔ لاک نے ٹالرینس کے موضوع کو سیاست اور دین کے درمیان کے موضوع کے عنوان سے پیش نہیں کیا تھا

بلکہ اس کے لیے یہ موضوع صرف اور صرف ایک سیاسی سوال تھا کہ جو آزادی اور عقائد سے آشنائی اور سول سوسائٹی سے متعلق تھا۔ لاک کے بیان کے مطابق سیاسی طاقت کا ہدف یہ تھا کہ معاشرے یا سوسائٹی میں افراد کو عقیدہ کی آزادی ہو۔ چاہے حکومت سلطنتی ہو یا موروثی۔ اس طریقہ سے لاک کے افکار اور نظریات استبداد کے مقابلہ میں انقلاب فرانس کے لیے فکری بنیادیں قرار پائے۔ اور سیاسی اشرافیت اور مسیحی کلیساؤں کی افکار کو کنٹرول کرنے میں مؤثر ہوئے اور بالآخر ایک صدی بعد یورپی دنیا میں حرکت پیدا ہوئی۔

وہ تسامح اور تساہل جس کے بارے میں لاک گفتگو کرتا تھا اس کی زبان میں "کسی بھی شرط و شروط کے بغیر مکمل و مطلق آزادی تھی" کہ جس میں دین اور عقائد کی آزادی افراد کے لیے موجود ہو، اور اسی طریقہ سے سیاسی میدان میں بھی ہر ایک اپنے عقائد اور نظریات کو بیان اور ان کی ترویج کر سکے۔ لاک کی لکھی ہوئی عبارات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ماحول کو جو چند صدیوں تک یورپ میں مذہبی آزادی کے عنوان سے موجود نہیں تھا، سترہویں صدی میں مجسم کریں۔ عقائد کا کنٹرول، جانبدارانہ فکر، اور وہ گھٹن کا ماحول جو کلیسا، فیوڈل طبقہ اور یورپ کے اشرافی طبقے کی وجہ سے ایک ہزار سال تک اس خطہ پر چھایا ہوا تھا، مشرقی یورپ اور اس سے پہلے اسپین میں اسلام کو قبول کرنے اور اس کی کامیابی کی اہم ترین دلیل تھا۔ ایک طرف اس گھٹی ہوئی فضاء کا ہونا اور دوسری طرف سے ٹالرینس کے اصول اور اسلام کی دی ہوئی آزادی جو قانونی اور ضروری بنیادوں پر قائم تھی، سبب بنی کہ اسپین کے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ لاک نے کوشش کی کہ اس سیاسی اور مذہبی عقائد کی آزای کو یورپ میں عمومیت اور قانونی شکل دے۔ اور یہ چیز اس کے نزدیک سول سوسائٹی کے لیے رکن اول کی حیثیت رکھتی تھی۔ سول سوسائٹی میں افراد کے حقوق کا تحفظ حاکم اور حکومت کے فرائض اور ذمہ داری ہے۔

شروع سے آج تک یورپ میں سول سوسائٹی کے تحرّک کا براہ راست تعلق تعصّبات بالخصوص معاشرتی تعصّبات سے ہے۔ لاک اور دیگر مفکران کی سترہویں صدی میں یہ کوشش تھی کہ ایک سول سوسائٹی کے استقرار کے ذریعہ یورپ میں سوسائٹیز کے درمیان تعصب کو ختم کریں اور ان کے آثار کا بہت گہرائی کے ساتھ مطالعہ اور تحقیق اس بات کو ثابت کرتی ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کل سول سوسائٹی کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں بہت کم سوسائٹیز کے درمیان تعصب پر بحث کرتی ہیں۔

اور زیادہ تر حقوق اور آزادی کے مطالبے کو ان تعصّبات کے مقابلے میں بیان کرتی ہیں۔ "فیناٹک □ یا وہی یورپ کا تعصب صرف اور صرف ایک مذہبی تعصب نہیں تھا، بلکہ کلیسا کے بنیاد پرستوں اور جاگیرداروں کے ساتھ اتحاد کی وجہ سے اس نے نسلی، قومی اور لسانی تعصب کا رنگ پکڑ لیا تھا۔ اور انقلاب فرانس کی کامیابی کے ساتھ یہ تعصّبات یا فیٹیسیسم، نیشنل ازم کے ساتھ یکجا ہو گئے۔(٦٦)۔ مغربی دنیا میں سول سوسائٹی کی کہانی کا مقصد مذہبی، سیاسی اور نسلی تعصّبات سے مقابلے کا راستہ تلاش کرنا ہے۔ لاک کی تصنیفات میں تعصّبات کا موضوع فلسفی اور فکری مفہوم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ بات تیس سال بعد لکھی جانے والے لاک کے مقالے کی چوتھی جلد میں جو انسان کے ادراکات سے متعلق تھا، اور انیسویں باب میں جو "دیوانہ وار عاشقی" کے موضوع پر لکھی گئی ہیں واضح اور روشن ہے۔ لاک کے اظہار خیال کے مطابق اس قسم کا عاشق وہ ہے جو الہامات کے دعوے کے ساتھ تعصّبات کو ایجاد کرتا ہے۔ اور عقل اور فہم سے بیزار ہوا ہے۔ یہاں پر لاک کی توجہ انگلستان میں پائے جانے والے سیاسی اور مذہبی تعصّبات کی طرف ہے۔ جو قید و بند اور قتل و غارت تک جا پہنچا تھا، اس کی کوشش تھی کہ انگلستان میں مذہبی اور سیاسی طور پر سب ہم رنگ اور ہم عقیدہ ہوں۔

اُس وقت کے برطانیہ اور یورپ میں ایک عیسائی دوسرے عیسائی کے خلاف تعصب رکھتا تھا۔ شرفا کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے مقابلے میں تھا اور عیسائیت صرف اور صرف اس وقت تھوڑی سی متحد ہو سکی، جب اس کا تعصب دوسرے ادیان کے پیروکار مثال کے طور پر مسلمانوں کے خلاف ہوا۔ لاک کی سیاسی، دینی اور مذہبی لحاظ سے یہ کوشش تھی کہ وہ یورپ کو متمدن کرے اور سول سوسائٹی کو قائم کرے۔ جس طرح سے اس کے نزدیک ضروری تھا کہ عقل و خرد، دیوانہ وار عاشقی اور تعصب کی جگہ لے، اسی طرح سے لاک کے نزدیک سول سوسائٹی کو بھی استبدادی معاشرے کی جگہ نہیں لینی چاہئے۔ ایسا استبدادی معاشرہ جس میں بادشاہ اور شہزادہ عمومی مفادات اور مصلحتوں کو معین کرتا ہے۔ لاک بھی لاینیٹز کی طرح ہابز کے پیش کئے ہوئے راستوں کو جو اس نے معاشرے کو فطری کیفیت سے اجتماعی حالت میں تبدیل کرنے کے لیے پیش کئے رد کرتا ہے۔

لاک کی نگاہ میں سول سوسائٹی کے قیام کے لیے پوری طاقت اور قدرت کو یکجا کرنا چاہئے اور جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ لوگوں کے منافع اور مفادات ہیں۔ حکومت قانوناً لوگوں کے افکار میں مداخلت نہیں

کر سکتی اور یہ حکومت کی ذمہ داری یا فرض نہیں ہے۔ وہ کلیسا، بازار اور سوسائٹی کے کسی بھی دوسرے ادارے کے درمیان فرق کا قائل نہیں تھا اور اس کا اصرار تھا کہ سول سوسائٹی کے قیام کے لیے بنیادی شرط کلیسا کو حکومت سے جدا اور الگ کرنا ہے۔ عیسائی کلیساؤں کے بارے میں لاک کی تائید اور نظریہ قابل توجہ ہے کیونکہ کلیسا دین مسیحیت نہیں ہے، بلکہ ایک ادارہ اور نظام ہے جسے لوگ وجود میں لائے ہیں اور اس ادارہ یا نظام کا دعویٰ ہے کہ وہ افراد اور خداوند کے درمیان رابطہ قائم کرتا ہے۔ اس قسم کا ادارہ یا نظام جو کلیسا سے مشابہت رکھتا ہو اسلام میں موجود نہیں ہے اور خود یہ یورپ کے معاشرے اور اسلامی معاشرے میں ایک بہت بڑا تاریخی فرق ہے۔ لاک کی نگاہ میں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں اور سوسائٹی کے مفادات اور منافع کی حفاظت کرے اور ہر گز بھی لوگوں کے انفرادی فوائد کے لیے کام نہ کرے۔ فطری کیفیت سے اجتماعی کیفیت (سول سوسائٹی) کی طرف لوگوں کا سفر اس وقت ہوگا جب لوگ خود سے اپنے حق کو رضایت کامل کے ساتھ ایک فرد یا پارلیمنٹ کو دے دیں اور یہ تفویض حق اجباری نہیں ہو سکتا۔

دین و مذہب کی طرف لاک کا اشارہ حقیت میں مسیحیت اور اس کے مختلف فرقوں کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بات واضح طور پر اس کے تصنیفات میں پائی جاتی ہے اور اس مطلب کی تاکید ہوئی ہے۔ لاک اپنی گفتگو میں دوسرے ادیان مثلاً اسلام کی طرف اشارہ نہیں کرتا اور دعویدار ہے کہ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہ ہی کسی قسم کی حکومت قائم کی اور نہ ہی اس کا مشورہ دیا، لہٰذا کلیسا قانونی طور پر شہری امور اور سیاست میں کسی قسم کی مداخلت کا حق نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے لاک مسیحیت اور اس کی تاریخ پر اعتماد کرتے ہوئے نتیجہ نکالتا ہے کہ عبادت الٰہی، باطنی اور ذاتی ہے لہٰذا اس رتبہ پر نہیں ہے کہ سیاسی اور اجتماعی قوانین کے تابع ہو۔ دوسری طرف سے لاک واضح طور پر اظہار کرتا ہے کہ: وہ افراد جن کے عقائد انسانی معاشروں کے مخالف ہیں اور وہ اپنے عقائد پر قائم ہیں یا وہ لوگ جو بیرونی طاقتوں کے لیے کام کر رہے ہیں اور وہ لوگ جو تساہل یا تسامح یا ٹالرینس کی دوسروں کو تاکید نہیں کرتے اور ٹالرینس کو صرف اور صرف اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں یا اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں، ہر گز بھی یہ حق نہیں رکھتے کہ سول سوسائٹی سے فائدہ اٹھائیں۔ لاک کے نزدیک ملحد یعنی وہ لوگ جو خدا کے وجود کے منکر ہیں ہر گز بھی سوسائٹی اور سماج کی جانب سے معافی اور بخشش کے مستحق نہیں ہیں۔ لاک اپنی تالیفات میں اور وہ چند مضامین جو اس نے

حکومت کے بارے میں لکھے یورپ میں سیکولرازم یا سوسائٹی کے دنیاوی ہونے کے نظریہ کو مضبوط کرتا ہے۔

جبکہ دین کے سوسائٹی یا سیاست سے جدا ہونے کا مسئلہ یورپ میں تقریباً چار سو سال پرانا ہے لیکن لاک کی سیاسی اور فلسفی افکار نے حکومت اور سول سوسائٹی کے بعد سیکولرازم کو مضبوط کیا۔ اگرچہ حضرت مسیح علیہ السلام صرف محبت کا پیغام لانے والے تھے اور ہر گز ایسی شریعت جو انفرادی یا اجتماعی یا سیاسی زندگی کے لیے فرائض معین کرنے والی ہو، اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، لیکن یہ مسیحی کلیسا لوگوں کی بنائی ہوئی ایک انجمن تھی جو مسیحیت کو سلطنتی اتحادوں اور کلیسا میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ لاک بھی گذشتہ صدیوں کے دوسرے مفکرین کی طرح یورپ کی اس تاریخی تبدیلی پر معترض بھی تھا اور اس کے خلاف قیام بھی کیا۔ مسیحیت کا سیاسی، شرعی اور انجمنی ہونا، کلیسا کی بیوروکریسی، عدالت اور ایک منظّم شکل اختیار کرنے کے ساتھ متحقق ہوا۔ ۳۱۳ء میں میلان آڈر کے ذریعہ سے مسیحیت کا رسمی یا سرکاری دین بننا، ۳۲۳ء میں روم کی بادشاہت، کنسٹنٹائن کا مسیحی ہونا، مختلف ادیان کے پیروکاروں کا ایک دوسرے کی زندگیوں سے الگ ہو جانا۔ کلیسا کا عدالتوں میں شہریوں اور عام لوگوں کی افکار کی تفتیش اور اُن پر کڑی نظر رکھنے کا آغاز ہوا۔ جو قرون وسطی، صنعتی انقلاب اور تاریخ معاصر تک جاری رہا۔ یورپ میں سول سوسائٹی کے قیام کی کوشش دراصل اس ظلم و استبداد سے چھٹکارے اور ایک آئیڈیل معاشرے کے قیام کی کوشش تھی۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں سول سوسائٹی کے افکار کی تحریک، آج کے یورپ میں سیاسی اور اجتماعی نظام کے یکجا اور متحد ہونے کے نتیجہ ہی کی طرح تھی۔ کام اور کاریگر کا تجارتی اور پرائیویٹ ہونا، اقتصادی بازاروں میں پیسے کا بڑھاوا اور رشد اور یورپیوں کا جدید اور نئے منابع اور وسائل اور مناطق جدید مثلاً امریکہ، کا کشف کرنا ان سب چیزوں نے موجودہ نظام کو ہلا کر رکھ دیا۔ جب کہ یورپ کے پرانے نظام اور قرون وسطیٰ کا یورپ، کلیسا، سلطنت، زمین، جاگیرداری نظام پر قائم تھا۔ موجودہ صدیوں میں ان نظاموں اور نظریات پر لوگوں کے اعتراضات اور سوالات وجود میں آئے ہیں اور ان پر لوگوں کی انگلیاں اُٹھنے لگی ہیں۔ سیاسی نظریات اور تھیوری کے لحاظ سے یورپ ایک ایسے نظام کے درپے تھا جو سماجی عہد و پیمان کے ساتھ پھلے پھولے۔ حاکمیت اور بادشاہوں کے حقوق کے بارے میں یورپ کے مفکرین کی بحثوں میں

فطری قانون کا زندہ ہونا درحقیقت ایک رد عمل تھا جو اس سرزمین کے مفکرین کی جانب سے مذہبی اصلاحات اور مسیحیت کے دو بڑے حصوں یعنی کیتھولک اور پروٹیسٹینس کے مقابلے میں ظاہر ہوا تھا۔ یورپ کے قدیم مفکر ھوگو گروٹس کی تالیفات میں جو اس نے نئے قدرتی قوانین کے بارے میں لکھیں اور اسکے بعد دوسرے ممالک کے درمیان زیادہ رائج ہوئیں۔ وہ اپنی تالیفات میں قدرتی قوانین میں پائے جانے والے عقلی رجحانات کو عقلی اصولوں کی بنیادوں پر اور سوسائٹی میں فرد کی رضایت کی موافقت جیسے موضوعات پر بحث کرتا ہے۔ گروٹس نے نہ صرف عدالت سے متعلق ابتدائی نظریات یورپیوں کو سکھائے، بلکہ ہر چیز سے زیادہ فطرت کے موضوع اور حضرت عیسیٰؑ سے ما قبل فطری قوانین کی طرف توجہ دلائی۔ اور اس راستہ کو آنے والے مفکرین جیسے لاک کے لیے کھولا۔ لاک فطری قوانین کو شہری قوانین کے مقابلے میں مورد بحث قرار دیتا تھا۔

اس لحاظ سے لاک دورِ حاضر کا ایک ایسا مفکر ہے جس نے اپنے افکار کو دوسروں تک منتقل کیا ایک ایسا مفکر جو گروٹیس کی تالیفات کا مطالعہ کرنے کے ذریعہ فرد کے حقوق اور آزادی کے مفہوم کو زندہ کرتا ہے اور فطری قانون اور اجتماعی قانون کا مسئلہ ہے جس میں ہم لاک کی افکار اور بنیاد میں متعدد جگہ تناقضات اور تضاد گوئی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مثلاً لاک یہ کہتا ہے کہ کوئی بھی مشروع طاقت رکھنے والی دنیاوی چیز وجود نہیں رکھتی اور ہر قسم کے اقتدار کا منبع اور سرچشمہ خداوند کی ذات ہے۔ سول سوسائٹی میں لوگوں کا حکومت کو اختیار اور قدرت دینا، حقیقت میں یہ اعطائے قدرت، اسی فطری حق کا تسلسل ہے جو اسے خلافت خداداد کے عنوان کی وجہ سے ملا ہے۔

اس مقام پر لاک صرف اور صرف سول سوسائٹی اور تاریخی واقعات کی بات نہیں کر رہا، بلکہ اس کے اندر پائی جانے والی وحدت پسندی اور دینی مسائل کا ذکر بھی کرتا ہے کہ جو دوسرے مسائل میں اس کی بیان کی ہوئی چیزوں سے مختلف ہیں۔

یورپ کے سماجی اور فلسفی مسائل، سول سوسائٹی کے نظریات، حکومت کے حدود کا تعین اور افراد کے حقوق کی بحث، جرمن مفکر امانوئل کانٹ (٦٧) (١٧٢٤۔ ١٨٠٤) اور سکاٹ لینڈ کے روشن خیال مفکر ایڈم اسمتھ (٦٨) (١٧٢٣۔ ١٧٩٠) کے ان موضوعات میں داخل ہونے کے ساتھ، آخری مراحل کو جو لاک نے شروع کئے تھے، طے کیا۔

سکاٹ لینڈ کے روشن خیال مفکرین کے لیے سول سوسائٹی کا مفہوم جس قدر عقلی رجحانات کا مرہون منت تھا، اتنا ہی اخلاق اور وحی الٰہی سے بھی تعلق رکھتا تھا اور اس مفہوم کو سمجھنے اور اس تک پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ ان دونوں راستوں کو طے کیا جائے۔ اسمیت اور اس جیسے دوسرے مفکروں کے لیے سول سوسائٹی کی فکر فطری طاقت اور ذاتی اخلاق دونوں سے تعلق رکھتی تھی۔ ہمیں کانٹ کے آثار میں ملتا ہے کہ پہلی بار اجتماعی فضا اور ذاتی فضا، فرد اور خصوصیت اور ذاتیت اور اجتماع اور عمومیت یا کلیت کو اجتماعی زندگی کی نسبت مشاہدہ کرتے ہیں۔ کانٹ کی لکھی ہوئی تالیفات میں خصوصی اور پرائیوٹ اور اخلاقی فضا اور ماحول کو اجتماعی منظر اور سوسائٹی سے جدا اور الگ رکھا گیا ہے۔ کانٹ کے مطابق ہر شخص اپنے اخلاقی اعمال کا امتحان لے سکتا ہے اور ایسا تب ہوگا، جب وہ اپنے آپ سے سوال کرے گا کہ، کیا اخلاقی اعمال و کردار کا شوق معاشرہ کے تمام افراد کے بارے میں پایا جاتا ہے یا نہیں؟ کانٹ کے تمام آثار میں وہ کتاب جو سب سے زیادہ دنیاوی سطح پر سول سوسائٹی کے بارے میں بحث کرتی ہے وہ اس کتاب "جاویداں امن" جو ۱۷۹۵ء میں اس نے لکھی ہے۔ اس کتاب میں کانٹ ایک انٹرنیشل فیڈریشن کی بات کرتا ہے جو بین الاقوامی حالات کیفیت کو ایک انٹرنیشنل سوسائٹی میں تبدیل کردے۔ اقوام کے درمیان مسائل کو حل کرکے ایک دائمی امن کو وجود میں لائے۔ کانٹ اُن یورپی دانشوروں میں سے ہے جس کے فلسفہ نے علمی کیفیت اور حالت کو آج کے یورپ میں بدل کر رکھ دیا۔ تنقیدی فلسفہ میں تین سوالوں کے جواب دینا چاہتا تھا۔ ا۔ ہم کیا چیز جان سکتے ہیں؟ ۲۔ ہمیں کیا جاننا چاہئے اور ۳۔ ہمیں کس لیے اپنی امیدیں برقرار رکھنی چاہئیں۔ اس کا جواب یہ تھا کہ جو کچھ بھی ہم جانتے ہیں یا جان سکتے ہیں وہ صرف ہمارے تجربات ہیں اور تجربے کے بغیر ان چیزوں کو ہم نہیں جان سکتے۔

فرانسیسی مفکر اور عمرانیات کا ماہر الیکس ڈوٹو کویل (۱۸۰۵۔۱۸۵۹) اور دو جرمن دانشور کارل مارکس (۱۸۱۸۔ ۱۸۸۳) اور جورج ہیگل (۱۷۷۰۔ ۱۸۳۰) کے آثار کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم درحقیقت یورپ میں سول سوسائٹی کے روایتی اور ابتدائی دور کے خاتمے کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ (۶۹)۔ ان تینوں مفکروں کی یہ کوشش تھی کہ اپنی علمی صلاحیتوں کے مطابق، قانونی اور اخلاقی ہونے اور ایک قانونی سوسائٹی اور اخلاقی زندگی کے درمیان فرق کو پہلی بار یورپ میں حل کریں۔ اور ان مسائل کو پہلی بار یورپ کے معروف فلسفی ڈیوڈ ہیوم (۱۷۱۱۔ ۱۷۷۶) نے بیان کیا تھا۔ ان تینوں کے لیے اس فرق کو بیان

کرنا آسان نہ تھا۔ ڈوٹو کویل سول سوسائٹی کو ممکن اور حقیقت میں اس کو قابل مطالعہ قرار دیتا تھا۔ مارکس اور ہیگل اس کے برعکس اس موضوع کو صرف اور صرف نظریات اور تھیوری تک محدود سمجھتے تھے۔ لاک اور اس گروہ کے لیے وہ ابتدائی نظریات کے مالک تھے سول سوسائٹی کا مفہوم صرف ایک قاعدہ اور قانون ہے کہ جس میں ایک دوسرے سے روابط قائم ہوتے ہیں لیکن انیسویں صدی کے صاحبان نظر کے لیے سول سوسائٹی دو نئے اثر اور خطوط حاصل کر لیتی ہے۔

سول سوسائٹی، یورپ کے مفکرین کے لیے صرف ایک پولیٹیکل سوسائٹی کا موضوع نہیں ہے، بلکہ مادی اور اقتصادی مسائل، جیسے زمین کی مالکیت اور جائیداد کے عنوان سے پیش کئے گئے ہیں۔ صنعتی انقلاب کا آغاز، تجارت کا پھیلنا ، اور بینکوں کی ترقی سے سول سوسائٹی کا مالی اور اقتصادی پہلو، پولیٹکل سوسائٹی کا محور اور مرکز بن جاتا ہے مثلاً لاک کی نظر میں یہ مالکیت کا موضوع ہے جو عوام، اجتماع اور مختلف معاشروں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک حکومت تشکیل دیں اور خود کو حکومت کے اختیار میں دے دیں۔ اس کے نزدیک سول سوسائٹی مالکیت نہیں ہے لیکن حق مالکیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ لوگوں اور حکومت کے درمیان اجتماعی قرار دیں اور تعصب کا موضوع، ان موضوعات میں شامل ہیں جن سے یورپی مفکرین خاص طور پر فرانس کے روشن خیالی کے دور کے مفکرین اٹھارویں صدی میں بحث کرتے ہیں۔ (۷۰)۔ فرانسوا ماری آروہ والٹر (۱۶۹۴۔ ۱۷۷۸) کہ جس کے لکھے ہوئے مضامین نے انقلاب فرانس پر بہت زیادہ اثرات مرتب کئے اور جو عقلانیت کے دور کی اہم شخصیات میں شمار ہوتا ہے، مذہبی اور عقیدتی آزادی کے لیے قیام کیا۔ سلطنتی نظام کے خلاف اس کے لکھے ہوئے مضامین اور اسی طرح اس وقت کے اشراف کے ساتھ اس کا اختلاف، سبب بنا کہ اسے ملک بدر کیا جائے۔ اگرچہ والٹر نے براہِ راست سول سوسائٹی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا، لیکن اس کی سرگرمیاں اور اس کے مقالے ایک آزاد پولیٹکل سوسائٹی کے پھیلاؤ میں موثر ثابت ہوئے۔ والٹر جس نے ایک کیتھولک اسکول میں تربیت پائی، اپنی پوری زندگی خدا اور دین پر اعتقاد رکھتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے پادریوں کا سختی کے ساتھ مقابلہ اور مخالفت کی۔ اسی زمانے کا ایک اور مفکر جان جیک روسو (۱۷۱۲۔ ۱۷۷۸) اپنی کتاب "معاشرتی قرار دادوں" میں حکومت اور سول سوسائٹی کو ایک ہی چیز بیان کرتا تھا، اور کہتا تھا کہ لوگ اپنے درمیان لکھی جانے والی قرار دادوں کے ذریعہ ایک جائز اور منتخب حکومت کو وجود میں لاتے ہیں اور ایسی حکومت سے عہد و پیمان کرتے ہیں۔ اس کی تصنیفات بھی فرانس کے انقلاب

اور اسی طرح امریکہ کی جنگ میں استقلال حاصل کرنے کے لیے بہت مؤثر ثابت ہوئیں۔ یہ دونوں مفکر یعنی والٹر اور روسو یورپ کے روشن خیالی کے دور کی اہم شخصیات شمار کی جاتی ہیں اور اسی طرح آزادی پسند اور لبرل ازم کے حامی مفکرین میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن روسو، والٹر سے زیادہ سول سوسائٹی کے مسئلہ اور دین اور سیاسی تعصب کے مسائل سے بر سر پیکار ہوا۔ والٹر کے لیے دینی تعصب ایک سیاسی تعصب ہے۔ اور وہ اس مسئلہ کے حل کو حکومت کی طرف سے سرکاری دین ومذہب کے اعلان میں جانتا ہے۔ وہ اپنی کتاب "معاشرتی قرار دادوں" کے آخری باب میں "شہری مذہب" کے عنوان کے ذیل میں، بتاتا ہے کہ پولیٹکل سوسائٹی کا حقیقی پیروکار ایسا متعصب فرد ہوگا شہری مذہب کا گرویدہ ہو۔ ایک ایسی چیز جسے آج کل سول سوسائٹی کے مبلغین اور مؤلفین بہت کم بیان کرتے ہیں۔

سول سوسائٹی یا پولیٹکل سوسائٹی کی وہ تصویر جس کا خواب روسو نے دیکھا، یورپ کے مفکرین کی جانب سے سخت عکس العمل کو وجود میں لاتا ہے۔ ان مفکرین میں سکاٹ لینڈ کا ایک سیاسی مفکر ایڈم فرگوسن بھی ہے جس نے سول سوسائٹی کی تاریخ کے موضوع پر ۱۷۶۷ء میں مقالہ لکھا۔ اس کی نگاہ میں سول سوسائٹی ہر گز بھی فطرت سے جدا نہیں ہوتی۔ وہ انسانی سول سوسائٹی کا حیوانی معاشرہ سے موازنہ کرتا ہے اور اظہار کرتا ہے کہ جس طریقے سے دوسرے موجودات اپنی ابتدائی حالت سے بہتر حالت کی طرف ارتقاء حاصل کرتے ہیں، اسی طریقے سے انسانی اجتماعات بھی سول سوسائٹی کے ذریعہ سے بدویت یا دیہاتی زندگی کے مرحلے سے مدنیت یا شہریت کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ اس کا اصرار تھا کہ سوسائٹی صرف انسانوں سے تشکیل نہیں پاتی، بلکہ انسانوں کا ایک دوسرے سے رابطہ اور محبت ہے جو اانسانی معاشروں کو اعلی ترین درجات پر فائز کرتی ہے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں سول سوسائٹی کا مفہوم یورپی مفکرین جیسے لاک، کانٹ اور روسو کے نظریات کے ذریعہ سیاست کے تمام پہلوؤں اور حکومت کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اس کے نتیجہ میں بعض مفکرین جیسے فرگوسن کے آثار حکومت کے لیے ایک مستقل حیثیت حاصل کر لیتے ہیں اور وہ عمومیت جو سول سوسائٹی کے لیے فرض کی گئی تھی، اپنا وجود کھو بیٹھی۔ انیسویں صدی اور اس کے بعد سول سوسائٹی کا مفہوم یورپ کی ماڈرن سوسائٹی کی ترقی کا تجزیہ کرنے کے لیے اور اسی طرح دوسرے صنعتی ممالک کی تحلیل کے لیے، عمرانیات اور فلسفی موضوعات میں بحث کے لیے انتہائی اہم موضوع تھا۔

جس طریقہ سے حکومت سبب بنتی ہے کہ معاشرے میں ایک آئیڈیل رابطہ برقرار ہو۔ سول سوسائٹی بھی اس کے برعکس ذاتی شوق اور انفرادی اور گروہی سرگرمیوں میں شامل ہے۔ ان دونوں کے درمیان اتحاد کئی انجمنوں کے ذریعہ وجود میں آئے گا۔ اس عبارت میں حکومت اور سول سوسائٹی جس میں سوسائٹی حاکمیت اور قوانین سے مزین ہو، ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ (۷۱)

ڈوٹوکویل سول سوسائٹی کو غیر سرکاری انجمنوں کی سرگرمیوں اور اُن کے مجموعہ میں دیکھتا تھا۔ ہیگل حکومت کو سول سوسائٹی اور خاندان کا ثمرہ اور حاصل جانتا تھا، اور حکومت کو فرد کی آزادی کا مظہر شمار کرتا تھا۔ لیکن مارکس کی افکار میں سول سوسائٹی بازار اور ایک شخصی روابط کے مستقل مالکیت کے دائرہ میں تعریف ہوئی ہے۔ اگرچہ مارکس حکومت اور سول سوسائٹی کے درمیان بنیادی تضاد کا قائل ہے اس کے باوجود وہ حکومت کی مختلف شکلوں کو اسی سول سوسائٹی سے ماخوذ جانتے ہوئے الگ کرتا ہے، اور اس کو زندگی کے مادی شرائط میں تلاش کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے اختتام کے ساتھ یورپ میں سول سوسائٹی کی بحث اور گفتگو تقریباً ختم ہو جاتی ہے اور اس بحث کی جگہ فرقہ وارانہ لڑائیاں، آئیڈیالوجی، نیشنل ازم، سوشلزم، کیمونزم، فاشزم، اور اگزیسٹنشیلیزم لے لیتے ہیں (۷۲)۔ صرف بیسویں صدی کی ابتدا میں اور اس صدی کے تیسرے عشرے میں آنٹونیو گرامشی جو اٹلی کے بائیں بازو کے سیاسی فعالوں میں شمار ہوتا تھا، اس نے سول سوسائٹی کے مفہوم کو دوبارہ زندہ کیا۔ گرامشی جو مارکسسٹی اعتقادات کا مالک تھا، مارکس اور ہیگل سے بھی آگے جا پہنچا اور سول سوسائٹی کو حکومت کا ایک حصہ یا ٹکڑا جانتا تھا اور اس کی تمام خدمات پیداوار کے لیے ہیں اور اقتصادی اور سیاسی مفکرین سوسائٹی یا معاشرے میں اتصال اور رابطہ پیدا کرتے ہیں اور اس طریقہ سے معاشرے میں بااثر طبقات کی قدرت طلبی اور تسلط پسندی میں اضافہ ہوتا ہے (۷۳)۔ سویت یونین کے ٹکڑے ہوئے اور مرکزی اور مشرقی یورپ میں کیمونزم اور سوشلزم کے اختتام تک گرامشی کی تالیفات میں موجود سول سوسائٹی کے مختلف پہلو مفکرین اور مؤلفین کی جانب سے فراموش کر دیئے گئے تھے۔

یورپ میں لبرل ازم کے ابتدائی مفکرین اور فلسفی اور اسی طرح اس براعظم کے سیاسی اقتصاد کے مفکرین کامیاب ہوئے کہ ڈیموکریسی کی ابتدائی بنیادوں، فرد کی آزادی، اور وہ عمومی قواعد جو سول سوسائٹی کے عنوان سے معروف ہوئے ان کی بنیاد رکھیں لیکن فوراً ہی معلوم ہوا کہ اس قسم کی آزادی اور حکومت اور

معاشرے کے درمیان رابطہ خود بہ خود، وجود میں نہیں آئے گا۔ نہ صرف یہ کہ انجمنیں اس قسم کے نظام کو معین کرتی ہیں بلکہ اس کی حفاظت اور بقاء کے لیے ضروری اداروں کو بھی قائم کرتی ہیں۔ انیسویں صدی کے مفکرین ٹوکویل نے فوراً ہی اس بات کو تعیین کیا کہ وہ جدید حکومتیں جو ڈیموکریسی کی بنیاد پر قائم ہوئی ہیں اندازے سے کہیں زیادہ طاقتور ہیں۔ اور گذشتہ صدیوں میں قائم حکومتوں کے مقابلے میں یہ جدید حکومتیں صنعت میں جدت کے ذریعے سے معاشرے یا سوسائٹی کو زیادہ نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ڈوٹوکویل ان لوگوں میں سے تھا جو ایک سول سوسائٹی میں حکومت کے کم طاقت ور ہونے کا خواہاں تھے۔ ایک سوسائٹی میں حکومت کی قدرت وطاقت کی منصفانہ تقسیم اس بات کی راہ ہموار کرتی ہے کہ قدرت مجریہ یا انتظامیہ، قدرت مقنّنہ یا پارلیمنٹ اور قدرت عدلیہ یا قضائیہ ایک دوسرے سے مستقل یا جدا کام کریں اور حکومت کی تشکیل عام انتخابات کے ذریعہ سے براہِ راست عوام کے ہاتھوں وجود میں آئے۔ لیکن ڈوٹوکویل کے نزدیک اہم ترین چیز جو حکومت کی طاقت کو کنٹرول کرتی ہے وہ انجمنیں اور پرائیوٹ ادارے مثلاً انجمنیں، مختلف صنعتیں، مختلف یونین اور قومی ادارہ اور کلی طور پر وہ ادارے جو رضاکارانہ طور پر لوگوں کے شہری امور کو چلانے کی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں۔ اس طریقے سے سول سوسائٹی کا ڈوٹوکویل کا پیش کردہ نمونہ سول سوسائٹی میں غیر سرکاری اداروں کے پھیلاؤ اور فعالیت کے محور پر منحصر ہے اور اس قسم کے ادارے معاشرے اور حکومت کے درمیان رابطے کو معین کرتے ہیں۔ غرض کہ سول سوسائٹی کی طاقت، حکومت کی قدرت اور طاقت کو محدود اور کم کرنے کے ذریعے ممکن ہے۔ ڈوٹوکویل کی غیر سرکاری اداروں کے بارے میں یہ خوش فہمی سبب بنی کہ لبرل مفکرین انیسویں صدی کے اس دور میں وہ اختلافات جو ایک سول سوسائٹی میں پیش آتے ہیں، انہیں اہمیت نہ دیں۔ وہ کون سے عوامل ہیں جو اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ یہ غیر سرکاری ادارے وہ قدرت، فعالیت اور اتحاد جس کی ان سے امید کی جاتی تھی، کے مالک نہیں ہیں؟ وہ کون سے عوامل اور شرائط ہیں کہ جو اس قسم کے اداروں کی تنزلی کا سبب بنے؟ یہ وہ سوال تھے جن کی طرف ڈوٹوکویل اور دوسرے مفکرین نے توجہ نہیں کی۔

ڈوٹوکویل کی ساری پریشانی ڈیموکریٹک حکومتوں کے استبدادی ہونے کی طرف تھی۔ نہ یہ کہ اس کی توجہ غیر سرکاری انجمنوں اور اداروں کے کمزور ہونے کی طرف ہو کہ جس کے نتیجہ میں اقتصادی، سیاسی، انسانی اور ٹیکنالوجی کی تبدیلیاں واقع ہوں۔ اس کا اصرار تھا کہ آزادی اور برابری، حکومتی اداروں کے زائل

ہونے اور انحلال کے ذریعہ وجود میں نہیں آسکتی اور اسی بناپر شہری مجبور ہیں کہ ڈیموکریسی نظام میں حکومت کی اطاعت کریں، لیکن اس قسم کے رابطے میں حکومت کے جبر سے محفوظ رہنے کے لیے، سول سوسائٹی کے اداروں مثلاً سیاسی جماعتوں، پریس یا اخبارات، انجمنوں اور اصناف یا پیشہ وروں کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈوٹوکویل اپنی پیش کی ہوئی سول سوسائٹی کو انیسویں صدی کی صنعتی دنیااور سرمایہ داری کے دائرے میں بیان کرتا ہے۔ اس نے کبھی بھی یہ تصور نہیں کیا کہ غیر سرمایہ دار معاشروں میں سول سوسائٹی کی تصویر کیا ہوگی۔ اگرچہ وہ اس پر تاکید کرتا تھا کہ علمی، دینی اور مذہبی ادارے اور طبقات اس معاشرے کی بنیاد کو تشکیل دیتے ہیں۔

جس چیز نے ڈوٹوکویل کو شہرت بخشی امریکہ کی ڈیموکریسی کے بارے میں لکھے ہوئے اس کے مضامین اور امریکہ کے سفر ہیں۔ وہ ۲۶ سال کی عمر میں فرانسیسی حکومت کی طرف سے امریکہ بھیجا گیا۔، تاکہ امریکہ کی عوامی رہبری والے نظام کا مطالعہ اور مشاہدہ کرے اور ایک رپورٹ تیار کرے۔ ڈوٹوکویل نے نو مہینے تک ایک اور فرانسیسی کے ساتھ امریکی ریاستوں نیو انگلینڈ، نیویارک، پنسیلوانیا، واشنگٹن (امریکی دار الحکومت)، اوھایو، ٹنسی اور نیواورلئن کا سفر کیا۔ اس رپورٹ کے شائع ہونے کے دو سال بعد ڈوٹوکویل نے ارادہ کیا کہ ایک مفصل کتاب (امریکہ میں جمہوریت) کے موضوع پر لکھے اور اس کتاب کے چھپنے اور بازار میں آنے کے ذریعے وہ مغربی دنیا کے صاحبان نظر، مفکرین اور ماہرین سماجیات کی صنف میں داخل ہوا۔ مغربی دنیامیں سول سوسائٹی سے متعلق آثار اور امریکہ میں جمہوریت سے متعلق اس کی کتاب میں اس کا مقام سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ خلاصتاً ایک اشارہ امریکہ کے تمدن کی خصوصیات اور یورپ کے نظاموں کے ساتھ اس کے واضح فرق کو بیان کریں۔

موجودہ امریکہ کے تمدن کو چار جملوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ موجود امریکہ کا تمدن ایک ایسا تمدن ہے جس میں فن و ہنر اور مشین کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس سے حاصل کی ہوئی چیزیں مثلاً صنعت، ذرائع ابلاغ، دانش، ہنر، معماری اور علم، سرمایہ داری کی خدمت کے لیے ہیں۔ ۲۔ آج کا امریکی تمدن مادیات اور مادیت پسندی کے دائرے میں پھلتا پھولتا اور شکل اختیار کرتا ہے اور اسی وجہ سے دنیااور قابل لمس چیزوں کی طرف رجحان رکھتا ہے اور غیر ملموس اور معنویات سے دور ہے۔ ۳۔ آج کا امریکی تمدن ایک طرف سے فردیت اور تنہائی پسند اور دوسری طرف سے خصلت پیروی، تقلید اور ہمنوائی کے درمیان پائے

جانے والے اختلافات اور تناقضات کا نتیجہ ہے۔ ۴۔ آج کا امریکی تمدن امریکہ اور اس کی ڈیموکریسی کے منفرد ہونے کا معتقد ہے اور اپنی برتری کو اس میں تلاش کرتا ہے اور یہ خود قومی آئین و مذہب کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اِن چار نکات کی توضیح اور تشریح کے لیے ہم کئی وضاحتیں دے چکے ہیں، لیکن یہاں پر ہماری بات امریکہ کے منفرد ہونے کے نظریہ کو بیان کرنے سے متعلق ہے کہ جو ہر چیز سے زیادہ ڈوٹوکویل کی تألیفات، سول سوسائٹی اور ڈیموکریسی کے موضوع سے متعلق ہے۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں آزادی کی خاطر لڑی جانے والی جنگوں کے آغاز اور انقلاب فرانس سے آج تک امریکی ہمیشہ اپنی قوم اور ملک و ملت پر فخر کرتے رہے ہیں۔ ان کا اپنے بارے میں برتری کا احساس اور اللہ کی طرف سے ایک خاص ماموریت کا دیا جانا، انفرادیت کی صفت کے ساتھ تھا جس کی بنیاد فردی آزادی، تجسّس، تہاجم، قومیت، تسلط طلبی، قومی تکبر پر تھی بلکہ اس نے امپیریلزم کو بھی تقویت دی۔ ڈوٹوکویل، جس نے ۱۸۳۰م کی دہائی میں امریکہ کا سفر کیا اور اس کی کتاب امریکہ کے سول معاشرے کے عمائدین کے ہاں مقبول ہوئی تھی، اس نے امریکیوں کو اپنے فرانسوی معاشرے سے موازنہ کرتے ہوئے ان کے برتر ہونے کو کشف کیا۔ شخصی آزادی، شہری اور قصبوں کے چھوٹے معاشرے جن میں امریکی عوام اپنی مدد آپ کے تحت، پرائیوٹ NGOs میں شریک ہوتے تھے، جن کا اُس وقت کے سیاسی نظام میں ایک اہم کردار تھا، ان سب باتوں نے ڈوٹوکویل کو بہت متاثر کیا اور یہ پہلا یورپی مفکر تھا جس نے امریکی ڈیموکریسی کو ایک مخصوص ایجاد قرار دیا۔ لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ ڈوٹوکویل اپنے اس دور میں فرانس اور انگلستان کے کلچر اور سسٹم کے علاوہ دیگر معاشروں کے نظام سے بے خبر تھا۔ اس کا نظریہ جو آج تک مسلسل تکرار کیا جارہا ہے دو بنیادی عناصر پر مشتمل تھا۔ اولاً یہ کہ جب وہ امریکہ کے سفر پر روانہ ہوا اُس وقت فرانس کا معاشرہ انقلاب کے بعد ڈکٹیٹر شپ اور افراتفری کا شکار تھا، فرانس کا انقلابی نعرہ "آزادی، مساوات اور اخوت" اپنا مفہوم کھو چکا تھا۔ دوسری بات جس نے ڈوٹوکویل کو امریکی ڈیموکریسی کا گرویدہ بنایا وہ امریکہ کے حکومتی اور عدالتی سسٹم کا فرانس اور انگلستان کے نظام سے موازنہ کرنا تھا۔ فرانس اور انگلستان اس زمانے میں یورپی آزادی اور ڈیموکریسی کی جنم گاہ شمار ہوتے تھے جہاں مرکزی حکومت تمام عوامی امور پر مسلط تھی۔ کسی مستقل سیاسی یا علاقائی نظارت کے بجائے ایک مرکزی نظام کے ذریعے پیرس اور لندن سے تمام شہروں کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔

امریکہ کی سول معاشرہ میں کامیابی بالخصوص صوبائی اور ریاستی خود مختاری اور امن وامان جو کہ دو بڑے سمندروں کی وجہ سے امریکہ کو نصیب ہوئی تھی، اس نے، اس بے خبر فرانسوی کو اپنے نئے تمدن کا گرویدہ بنالیا تھا۔ ڈوٹو کویل کے امریکی سیاسی اور سماجی نظام سے متعلق مشاہدات اس زمانے میں شروع ہوئے جب امریکہ کی کل آبادی ایک کروڑ تیس لاکھ تھی۔ اور لوگوں کی اکثریت دیہاتوں میں ساکن اور کھیتی باڑی سے وابستہ تھی، امریکہ صنعتی ترقی کی دوڑ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ یورپی ممالک میں دو بڑے مذہب کیتھولک اور پروٹسٹ تھے، جبکہ امریکہ میں کئی چھوٹے بڑے مذہبی گروہ تھے۔ فرانس کا انقلاب، مذہب کے خلاف اور سیکولرزم کا حامی تھا جبکہ امریکہ میں آزادی کی جنگ غیر ملکیوں اور انگلستان اور فرانسوی سامراجی طاقتوں کے خلاف تھی۔ ڈوٹو کویل اپنے اس امریکہ کے سفر کے دوران اجتماعات پر مذہب کی تاثیر سے بہت زیادہ متاثر تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود ڈوٹو کویل کی تیز نگاہ نے اس بات کو تشخیص دے دیا تھا کہ انفرادیت، آزادی اور مساوات ہی امریکہ کا ایک کامل نظام نہیں ہے بلکہ چند دیگر عناصر بھی ہیں۔ اس نے امریکہ میں فکری استبداد سے متعلق بھی گفتگو کی اور یہ ان ابتدائی افراد میں سے تھا جنہوں نے امریکہ کو آئندہ چند سالوں میں مادیت پرستی اور لذت طلبی کا شکار بننے کی پیش گوئی کی تھی۔ یہ موضوع اور امریکی معاشرہ میں عدالت و انصاف کی مرکزیت کا نہ ہونا ڈوٹو کویل کے اپنے باپ کو لکھے گئے خطوط میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں امریکہ کی سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی فضا، جس نے ڈوٹو کویل کو متاثر کیا تھا، داخلی جنگ جو کہ ۱۸۶۱ سے ۱۸۶۵ تک لڑی گئی اور ساٹھ لاکھ امریکی مارے گئے نیز صنعتی ترقی، شہر نشینی، آبادی کے اضافے اور سرمایہ داری میں ترقی کی بنا پر مکمل تبدیل ہو چکی تھی۔ امریکی آئیڈیالزم ماند پڑ گیا اور اپنی جگہ مصلحت پسندی کے تحت سب سے بڑے واحد سیاسی یونٹ یعنی "ریاست ہائے متحدہ" (USA) کو دے دی۔ اگر ڈوٹو کویل نے پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں امریکہ کو دیکھا ہوتا، تو یقیناً وہاں کی سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور معاشرتی فضاء کو سمجھ نہ سکتا۔

نہ صرف امریکی سول معاشرہ تبدیل ہوا، بلکہ ان کا منفرد ہونے کا نظریہ بھی انحطاط کا شکار ہو گیا۔ اور یہ درحقیقت ایک مذہبی رہبر اور قومی آئین کی صورت میں نمودار ہوا۔

ریچرڈ ہافستاڈر، امریکی تاریخ نویس اپنی مملکت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے، "واحد قوم، ہونے کے ناطے ہماری سرنوشت اور تقدیر، وحدت سے منسلک ہے نہ کہ مختلف نظریات سے"۔ لیکن ابراہام لنکن (جو کہ داخلی جنگ کے زمانے میں صدر تھا) نے اس کو امریکہ کے "سیاسی مذہب" کا نام دیا۔

امریکی بننا اور امریکی ہونا سول معاشرے کا جز اور خود ایک دین اور مذہب بن چکا تھا۔ اور "امریکہ کے منفرد" ہونے کے نظریہ نے (جو کہ ڈوٹو کویل کے بعد بہت زیادہ مشہور کیا گیا) قوم پرستی کے احساس کو بھی اپنے دامن میں لے لیا۔ انیسویں صدی کے اواسط اور بیسویں صدی کے آغاز میں سرمایہ داری میں اضافہ اور صنعتی ترقی کے پیش نظر، یہ نو ظہور سرمایہ دار امریکہ، جنوبی امریکہ، بحر کبیر اور بحر الکاہل تک وسعت اختیار کر گیا، اور امریکہ کی آئیڈیالوجی بغیر اس کے امریکی عوام اس کے معترف ہوں یہ سرمایہ داری آئیڈیالوجی میں تبدیل ہو گئی۔ امریکہ کی ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی بھی یورپ کی طرح صنعتی انقلاب اور سرمایہ دارانہ نظام کے تحت جس کی تاثیر قومی حدود سے تجاوز کر چکی تھی اور چند جہتوں سے جس کا آزادی پسند اور لبرل مفکرین نے سوچا تک بھی نہ تھا امریکہ نے ایک خاص اور واضح اقتصادی اور سیاسی روپ اپنا لیا۔ اجتماعی فضا کی کمی بلکہ نہ ہونے کی وجہ سے جہاں سول سوسائٹی میں اجتماعی فائدے کو انفرادی فائدہ پر ترجیح دی جائے اور تنقیدی تفکر کی عدم موجودگی نے ڈوٹو کویل کے عقیدہ کے مطابق امریکیوں کی زندگی کیلئے ایک بڑے خطرے کو جنم دیا ہے۔

لاک اور کانٹ سے لے کر ڈوٹو کویل، ہیگل اور مارکس تک جب ہم سول سوسائٹی کی نئی اور پرانی حدود کا جائزہ لیں تو اقتصادی میدان میں ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ مغربی سول سوسائٹی ایک دنیاوی متوسط سرمایہ داری معاشرہ ہے۔ آزادی یعنی آزادی رکھنا، آزاد ہونا یا بننا ہے اور سول سوسائٹی ایک فارمولے کے تحت ہے جس کے مادی اور دنیوی خصائص اجتماعی اداروں کو جنہیں بشری تمدن نے ایجاد کیا ہے اور ان کا سب سے بڑا سرچشمہ حکومت اور ان کے درمیان جوڑ توڑ کرنا ہے۔ مغربی مفکرین کی نگاہ میں سول سوسائٹی ایک عمومی فضا ہے لیکن تحقیق اور مطالعہ میں یہ فضا بتدریج تنگ تر اور چھوٹی ہو جاتی ہے۔ سول سوسائٹی کا مفہوم کوئی خاص تعریف اور مشخص حدود کا حامل نہیں ہے یہ بات اُس وقت واضح ہوتی ہے جب سول سوسائٹی کے اقتصادی پہلوؤں کی طرف توجہ کی جائے۔ سب سے پہلے نظریہ دان اور مفکرین جنہوں نے سول سوسائٹی کو حکومت سے الگ جانا وہ سیاسی ماہرین اقتصاد تھے۔ (۴۷)

اس موضوع میں ہیگل نے ایڈم اسمیت اور جیمز اسٹیورٹ کے افکار سے استفادہ کیا ہے۔ ہیگل کے لیے سول سوسائٹی عصر جدید کا ایک شاہکار ہے۔ ہیگل کے لیے سول سوسائٹی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں آزادی کے مفاہیم رومی قانون، مسیحیت اور روشن خیالی کے تفکرات ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ افراد اپنے انفرادی منافع کو سول سوسائٹی میں تلاش کرتے ہیں لیکن اس بات کا انحصار فرد اور حکومت اور حکومتی اداروں کے درمیان رابطے پر ہے۔ ہیگل سول سوسائٹی کو ترقی کی ایک تنگ وادی، آزادی عطا کرنی والی اور روشن کنندہ خیال کرتا ہے کیونکہ یہاں پر افراد اپنی آزادی کو کسب کرتے ہیں۔

سول سوسائٹی کا مفہوم ہیگل کی نگاہ میں دوسرے مفکرین کی نسبت تین بنیادی فرق کا حامل ہے۔ پہلے مرحلہ میں ہیگل سول سوسائٹی کی تعریف اس ترتیب سے بیان کرتا ہے کہ اقتصادی پہلو غالب اور مسلط نہیں ہے۔ ہیگل کے لیے سول سوسائٹی ایک قسم کے عملی کام اور اجتماعی امور کی ایسی انجام دہی ہے، جو سرمایہ داری اقتصاد کے ساتھ ساتھ ہو، درحقیقت یہ سرمایہ داری بازار کے لیے آئینہ کی مانند ہے لیکن خود سول سوسائٹی اقتصاد سے کاملاً مختلف ہے۔ وہ اس اجتماعی امور کی انجام دہی کو ایک خاندان کے کردار کی تکمیل اور حکومت کی فعالیت کی تکمیل میں دیکھتا ہے۔ ہیگل کے تفکرات میں سول سوسائٹی تاریخ بشریت میں ایک عظیم قدم تھا جو کہ ایک خاندان کو کسی اجتماع کے بنیادی ادارے کی حیثیت سے ایک حکومت کی اعلیٰ ترین مقام کی سطح تک ارتقاء دیتا ہے اور یہ اخلاقی زندگی کا میدان ہے جو ایک معاشرہ میں خاندان اور حکومت کو متعین کرتا ہے۔ ہیگل کی نگاہ میں سول سوسائٹی، حکومت اور خاندان کی نسبت مختلف ہے۔ سول سوسائٹی ایک ایسا حصہ اور فضا ہے جہاں افراد اپنی ذاتی خواہشات کو پیش اور پورا کرتے ہیں۔

دوسرے مرحلہ میں ہیگل معاشرتی اخلاق پر بہت زیادہ تاکید کرتا ہے۔ وہ قوت دافعہ اور جاذبہ اور ذاتی عادات اور اخلاق نیز معاشرتی اخلاق کو تشخیص اور واضح کرتا ہے۔ اس کے علاوہ، عقیدہ کے مطابق جب افراد اپنے ذاتی منافع کو معاشرے کے منافع پر مقدم رکھتے ہیں تو سول سوسائٹی میں اضطراب بڑھ جاتا ہے جبکہ ایڈم اسمیت (اقتصاد دان اور اسکاٹش مفکر) شخصی خواہشات کو معاشرے کی ترقی متصور کرتا ہے۔ ہیگل اس لحاظ سے اپنی تحریروں میں یورپی ماڈرن اور جدید زندگی سے اظہار ناراضگی کرتا ہے کیونکہ ان حالات میں افراد معاشرے کے اندر حکومت اور افراتفری کے مقابلہ میں محفوظ نہیں رہتے۔

ہیگل کی نظر میں معاشرے میں ماڈرن شخص، ایک بے بنیاد فرد کی مانند ہے جس کے لیے واحد اجتماعی پناہ گاہ اخلاق ہے۔ افراد کا تعارض اور پراکندگی اور ان حالات میں معاشرے کا ترقی کرنا، ہیگل کے لیے ناقابل قبول ہے، ایسی صورت میں سول سوسائٹی، صرف افراد کی ذاتی خواہشات کی تکمیل کا میدان رہ جائے گی۔ ایسے افراد جو سول سوسائٹی میں تعلیم یافتہ نہیں ہوئے اور انہیں عمومی احترام کا پاس بھی نہیں ہے، فی الواقع یہ لوگ کسی حکومت کے شہری بننے کی شائستگی نہیں رکھتے۔ الغرض ہیگل حکومت کو عام، کلی اور اعلیٰ ترین اخلاقی زندگی کی تجلی سمجھتا ہے۔ جو سوال پیش نظر ہے وہ یہ کہ کیا صاحبان حکومت اپنے آپ کو جزئی اور مخصوص رجحانات سے الگ کر سکتے ہیں؟ یہ چند اعتراضات میں سے ایک ہے جو ہیگل اور سول سوسائٹی پر کیا جاتا ہے۔

تیسرے مرحلہ میں، ہیگل کے عقیدہ کے مطابق سول سوسائٹی کے مفہوم اور اس کی آئیڈیل سطح تک رسائی کو ہم ایسے ہی ترک نہیں کر سکتے، کیونکہ اس صورت میں معاشرہ انحطاط اور گراوٹ کی طرف چلا جائے گا۔ اس کے خیال میں سول سوسائٹی کو تعلیم و تربیت اور ایک سسٹم کے ساتھ یکجہتی کی طرف لے جانا چاہئے۔ ہیگل کے نظریات کے تحت سول سوسائٹی ایک ایسی فضا اور جگہ ہے جہاں ذاتی اور انفرادی اخلاق کو اجتماعی اور عمومی اخلاق کے ساتھ مرکب کیا گیا ہے۔ سول سوسائٹی کا مفہوم ہیگل کے نظریات میں انتہائی پیچیدہ ہے جو مختلف تاریخی اور اجتماعی حالات اور واقعات سے عبور کرتا ہے۔ اس کی نگاہ میں سول سوسائٹی ایک سرمایہ دار معاشرہ ہے جب کہ یہ معاشرہ شخصی آزادی کو بھی مہیا کرتا ہے لیکن دوسری طرف یہ ذاتی آزادی خصوصاً اقتصادی فعالیت کی صورت میں بازار کی شرائط اور مادی و مالی فعالیت پر منحصر ہے۔ اس کے افکار میں معاشرے میں سیاسی دلالی سول سوسائٹی کے مختلف اداروں میں پھیلی ہوئی ہے، اور یہ دلالی اور مصلحت، قانونی عدالتوں، رفاہی سنٹرز، مختلف طبقات اور گروہوں کی صورت میں ایک عمومی رنگ اختیار کر چکی ہے۔ اس بناء پر کسی بھی فرد کو معاشرے کے اندر اپنے جزئی اور منافع کے ہی پیچھے نہیں رہنا چاہیئے بلکہ پوری آگاہی کے ساتھ کلی مقاصد اور اجتماعی منافعوں کے لیے بھی خدمات انجام دینے چاہئیں۔ ہیگل کا سول سوسائٹی کا نظریہ فی الواقع ہابز کے نظریہ "ابتدائی حالت" کی بدلی ہوئی صورت ہے(۷۵)۔ ہابز "ابتدائی حالت" کو سول سوسائٹی اور سیاسی معاشرے پر برتری دیتا ہے، جبکہ ہیگل سول سوسائٹی کو حکومت کے اندر اور حکومت کے ساتھ دیکھتا ہے۔

"سول سوسائٹی کے مختلف سلسلہ وار ادارے کہ جہاں حکومت سب سے بڑا ادارہ ہوتی ہے" ہیگل کا سول سوسائٹی سے متعلق پیش آنے والے مسائل کا جواب ہے۔ وہ معاشرے کی اصالت کا قائل ہے لیکن اس کے عقیدہ کے مطابق افراد کسی منظّم حکومت کے بغیر اپنے اجتماعات کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ لیکن اس کے باوجود سول سوسائٹی، ایسا میدان ہے جہاں مخفی سرگرمیاں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جہاں معاشرتی آداب اور اخلاق اس بات سے مرتبط ہیں کہ کیسے سول سوسائٹی کے مختلف سلسلہ وار انسٹیٹیویشن کو حکومت کے ساتھ ملایا جائے۔ ہیگل سول سوسائٹی کو پہلے مرحلہ میں کسی حکومت کے آغاز کے ساتھ مشروط کرتا ہے لیکن اپنے کمال کی راہ میں یہ خود حکومت ہے جو سول سوسائٹی کی پہلی شرط کو تشکیل دیتی ہے۔ سول سوسائٹی خود بخود وجود میں نہیں آتی اگرچہ اس کی ابتدائی شرائط کسی حکومت کے وجود سے پہلے مہیا ہوں۔ لیکن بالاخر یہ حکومت ہی ہے جو سول سوسائٹی کے وجود کا باعث بنتی ہے۔ ہیگل کے اعتقاد کے مطابق سول سوسائٹی اپنے تکامل کے لیے حکومت کی محتاج ہے اور خود حکومت اس معاشرے پر مقدم ہے۔ ہیگل کے سول معاشرے میں حقوق، قوانین کی شکل میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور ان پر نظارت اور کنٹرول نامطلوب عنصر نہیں ہے بلکہ یہ مختلف مراکز، پولیس، شہری کونسل اور مختلف گروہوں کے ذریعہ انجام پاتی ہے۔

مارکس نے سول سوسائٹی سے متعلق ہیگل کے نظریات وراثت میں پائے ہیں لیکن اپنی زندگی میں اس کی تالیفات میں بنیادی تبدیلی لاکر اس کے مضمون کو بدل ڈالا۔ ہیگل جو کہ حکومت کو تمام چیزوں پر برتری دیتا تھا لیکن مارکس نے یہ بات پیش کی کہ سول سوسائٹی میں جو بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ اس معاشرے کے اندر سے وجود میں آتی ہے۔ مارکس سول سوسائٹی کی مختلف افراد کے نظریات اور اختلاف کے درمیان حل و فصل کرنے کی صلاحیت کو رد کرتے ہوئے ہیگل کی ان ترجیحات کو جو وہ ایک حکومت کے لیے خیال کرتا ہے تبدیل کرتا ہے وہ سول سوسائٹی کے پس منظر کو تاریخی بیان کرتا ہے۔ مارکس سول سوسائٹی کو اس کی نظر کے مطابق دو مرحلے میں آشکار کرتا ہے۔ ایک یہ کہ ہیگل کا حکومت سے متعلق دعوی ایک خواب سے زیادہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ سول سوسائٹی سے متعلق تحقیق اور سمجھ صرف مارکس کے سیاسی اقتصاد کے دائرہ کار میں قابل فہم ہے۔ مارکس سول سوسائٹی کو سماجی اور سیاسی طاقتوں نیز مغلوب اور غالب قوتوں اور قیدی اور زندان بان کے درمیان گفتگو کی صورت میں جلوہ گر کرتا ہے اور اس اعتبار سے کہ سول سوسائٹی تاریخ کا حصہ ہے، یہ سیاسی اور اقتصادی کشمکش کے درمیان واسطہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اس

لحاظ سے کہ سول سوسائٹی حکومتی نسخہ ہے لہٰذا یہ معاشرے میں موجود اعتراضات کو رفع نہیں کر سکتی بلکہ حکومتی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو منعکس کرتی ہے۔ صرف انقلاب ہی ہے جو سوسائٹی اور سیاست کے درمیان فرق واضح کر سکتا ہے اور جب سیاست کو جو ظاہری سوسائٹی میں اقتدار طلبی کی صورت میں ہے باہر کر دیا جائے تو اس وقت ایک عمومی فضا ظاہر ہو گی۔

مارکس کے تفکرات میں سول سوسائٹی اپنی راہ کی خود سے تشخیص دیتی ہے، لیکن ایسا معاشرہ میں جب یہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ہو تو فساد کا موجب بنتا ہے۔ اور افراد کے درمیان روابط رشد و نمو کا وسیلہ قرار پاتے ہیں، مارکس کے لیے سول سوسائٹی نہ فطرت کے مقابلہ میں ہے اور نہ رشد و نمو کا وسیلہ، بلکہ یہ سول سوسائٹی صنعتی معاشرے کی ملکیت ہے اور اس اعتبار سے ایک سرمایہ دارانہ معاشرہ ہوگا۔ مارکس کہتا ہے کہ سول سوسائٹی کی صحیح جگہ اور فطرت کو اُسی صورت میں پہچانا جاسکتا ہے جب پیداوار اور تقسیم کے مراحل کو دیکھا جائے۔ مارکس کی نگاہ میں سول سوسائٹی حکومت، تعلیم و تربیت، نظریات، خواہشات اور غلبہ پانے والے گروہ کی نمائندہ ہے۔ سول سوسائٹی سرمایہ دار طبقات کے اتحاد کا مرکز ہے جہاں ان کی اپنی مصلحت اور زمان و مکان کی شرائط کے مطابق ان کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے راہیں متعین کی جاتی ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ قانونی تعلقات اور حکومتی اعتراضات کی جڑیں مادی زندگی کی شرائط سے وابستہ ہیں، جسے ہیگل سول سوسائٹی کے ڈھانچے میں دیکھتا ہے۔ ان حدود و قیود کے اندر سول سوسائٹی یورپی جاگیردارنہ سسٹم، بے رحمانہ اقتصادی تبادلات کی دوڑ، مالکیت اور اس کے دائرہ کار اور خود غرض خواہشات کا مجموعہ ہو گی۔ مارکس جو اصطلاحات، ہیگل کے سول سوسائٹی کے نظریہ میں پاتا ہے اس کے مطابق اس معاشرے کو اقتصاد اور پیداواری کا سسٹم قرار دیتے ہوئے اسے مادیات کی تاریخ کی تکمیل سمجھتا ہے۔ اس اعتبار سے مارکس ہیگل سے ایک ہی چیز کو قبول کرتا ہے اور وہ "زندگی" ہے، جبکہ باقی تمام مسائل کو ہوشیاری اور آگاہی کا نتیجہ قرار دیتا ہے اِس بنا پر مارکس حکومت کا جواز اور حکومت کی عدالت محوری کو ہیگل کی نگاہ میں باطل تصور کرتا ہے۔ مارکس نہ صرف ہیگل کے بیان کردہ سول سوسائٹی کے نظریہ پر اعتراض کرتا ہے بلکہ سرمایہ داری کی بنیاد کو، جو کہ معاشرے میں فساد کا باعث ہے، بڑی شدت سے تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔

مارکس کے آثار خصوصاً "جرمنی آئیڈیالوجی" اور سیاسی اقتصاد پر تنقید کے مطالعہ سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ سول سوسائٹی کا وجود طول تاریخ کے ہر دور میں قدیمی اور جدید معاشروں میں ہونا ناقابل انکار ہے۔ اور یہ ایک روشن حقیقت ہے لیکن اس کا مکمل نمونہ سرمایہ دار طبقہ کی کامیابیوں سے امکان پذیر ہوا اس بناء پر سول سوسائٹی کی خود مختار سیاسی اقتصاد میں ہی پائے جائے گی۔ اس کے بقول "انسانی پوسٹ مارٹم بندر کے پوسٹ مارٹم کی چابی ہے۔" مارکس کے سیاسی نظریات ہمیشہ مالکیت میں خلاصہ ہوئے ہیں لیکن مارکس کے زمانہ کے بعد اس نظریہ اور تھیوری کو جدید معاشرے کی کیفیت کی شناخت کیلئے بہت پیچیدہ کر دیا گیا۔ کام کی تقسیم، مزدور اور سرمایہ آج کے جہان میں ان عمیق مسائل کی مختلف جہات کا ایک گوشہ ہیں۔ سول سوسائٹی کی تاریخ خود حکومت اور معاشرہ کی تاریخ ہے۔ جس طرح ابتدائی سیاسی معاشروں کو یورپین مفکرین کی گفتار کے مطابق سول سوسائٹی کی طرف لے جانا چاہئے اسی طرح یورپی ممالک کی حکومت کو مختص نمائندوں کی حکومت میں تبدیل کرنا چاہئے۔ امریکہ میں خصوصاً شمالی ریاستوں میں سول سوسائٹی جاگیر دارانہ نظام کی وجہ سے وجود میں نہیں آئی، بلکہ ریاستی حکومت خود ابتدائی سول سوسائٹی کے زیر اثر قرار پائی تھی۔ امریکہ میں یورپیوں کی ابتدائی ہجرت کے ساتھ جو کسی محکم اور مستقل حکومت کے عدم موجودگی میں ہوئی، سول سوسائٹی نے عظیم مرکزیت حاصل کرلی اس کے برعکس فرانس اور انگلستان میں جہاں قدر تمند حکومتیں تھیں سول سوسائٹی ان حکومتوں کے سائے میں تشکیل پائی ۔ روس کی حالت انیسویں صدی میں بلشویک (مزدوروں) کے انقلاب سے پہلے تک امریکہ کے برعکس تھی۔ روس میں سول سوسائٹی نہ ہونے کے برابر تھی، جبکہ حکومت ایک طاقتور شاہی نظام کے تحت تھی، امریکہ اور روس کا تقابل کیا جائے تو ریاست "پروسیا" انیسویں صدی کے اواخر میں امریکہ اور روس کی درمیانی حالت میں تھی، کیونکہ نہ تو سیاسی طبقہ اور نہ ہی اقتصادی طبقہ قدرت میں تھا۔ اور جرمن علاقوں میں سول سوسائٹی مارکس اور اس کے ہمفکر مفکرین کی پسندیدہ نہیں تھی۔ ان تین ممالک کی مختلف کیفیت کا ایک ہی صدی اور زمانے میں ہونے کی وجہ سے مارکس کے نظریات میں تناقض کا باعث بنا۔ جرمنی میں کسانوں کا احتجاج اور انارکی پھیلانا، امریکہ میں داخلی جنگ، مشرقی یورپ کی سرحدوں پر روسی انقلاب اور بین الاقوامی سیاسی اور اقتصادی تبدیلیوں نے نہ صرف سول سوسائٹی کے مفہوم کو یورپی مفکرین کے لیے مبہم کر دیا، بلکہ اس مفہوم کو آئیڈیالوجی کے ساتھ مدغم کر دیا اور ایک دراز مدت کے لیے فراموشی کی نذر ہو گیا۔

نصف صدی تک یورپی مفکرین کے سول سوسائٹی سے متعلق خاموشی کے بعد، ایک اٹالین مارکسیسٹ اور مصنف آنٹونیو گرامشی نے جو کہ مزدوروں کی تنظیموں سے مایوس ہو چکا تھا اور فاشیسٹ نظام کے ظہور کے ساتھ جسے اپنے ملک میں دیکھ رہا تھا، ایک بار پھر سول سوسائٹی کو زندہ کر گیا۔ اس موضوع کی تحقیق کا بڑا سبب سول سوسائٹی کی فعالیت تھی جو پہلی جنگ عظیم کے بعد اقتصادی اور سیاسی بحرانوں کے با وجود نہ کم ہوئی اور نہ ہی یورپی حکومتوں بالخصوص اٹلی میں کمزور نہیں ہوئی، بلکہ فاشسٹوں نے بائیں بازو کی طاقتوں کے بغیر اپنے آپ کو منظّم کیا اور بھاری مینڈیٹ کے ساتھ جو کہ مزدوروں کے طبقوں کے ذریعے ان کو نصیب ہوا تھا حکومت وقت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ یہ لوگ سیاسی معمہ کے حل کی تلاش میں تھے کہ گرامشی نے مسلط طبقہ کے تسلط اور معاشرے کے چیدہ (elite) افراد کا سیاست اور اجتماعات کے ساتھ رابطہ سے متعلق تحلیل پیش کی۔ اس نکتہ کی طرف متوجہ رہنا چاہئے کہ یورپ کے بجائے روس میں سوشلسٹ انقلاب نے جرمنی، انگلستان اور اٹلی کے بائیں بازو سے متعلق مفکرین اور روشن خیال حضرات کو پریشان اور سرگرداں کر دیا تھا۔ مارکس کے اندازوں اور پیش بینی کے مطابق جرمنی، انگلستان اور اٹلی میں مزدوروں اور محنت کش افراد کی طرف سے انقلاب برپا ہونے چاہئیں تھے، نہ کہ روسی کسان اور نیم صنعتی معاشرے میں۔ جرمنی میں عمرانیات کے مفکرین کا ایک گروہ، میکس ہورکایمر کی رہبری میں ان واقعات سے بہت رنجیدہ ہوئے اور سیاسی سوسیالوجی، نفسیات، اور کمیونیکشن کے موضوعات میں معروف فرانکفرٹ مکتب کو ایجاد کیا۔ ان کے درمیان معروف مفکرین مثلاً ہربرٹ مارکوزی، تئودور ایڈورنو، والٹر بنیامین اور دوسرے افراد نمایاں تھے جن کی تنقیدی روش کو یورپ اور پھر امریکہ میں ترویج کیا گیا۔ لیکن گرامشی اٹلی میں تھا اور اس نے تسلط طلبی اور قدرت طلبی کی حدود و قیود میں رہتے ہوئے، سول سوسائٹی کو مارکس کی تالیفات میں زندہ کیا۔

گرامشی نے اس سوال کے جواب میں کہ کیوں مارکس کا انقلاب یورپ میں تشکیل نہ پا سکا؟ طاقت پسندی کا نظریہ اور مؤثر افراد کے باہمی اتفاق کے فقدان کو بیان کیا اور ساتھ میں یہ دعویٰ کیا کہ حکومت کا مطالعہ، سول سوسائٹی کو سمجھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سول سوسائٹی ہی ہے جہاں حکومت اپنے پروگراموں کے ذریعہ خریدار اور وفادار پیدا کرتی ہے۔ اس بنا پر سول سوسائٹی ایسی فضا مہیا کرتی ہے جہاں حکومت اور موثر حکام نامرئی طور پر معاشرے کو اپنے پنجوں میں لیتے ہوئے قدرت کو اپنے فائدوں کے

لیے حاصل کرتے ہیں، اور یہ امر تمام اداروں میں نمایاں ہے۔ یہاں تک کہ مدارس، چرچ، مذاہب، یونیورسٹیوں، مختلف اصناف اور سیاسی جماعتوں پر بھی غالب ہے۔ گرامشی کے عقیدہ کے مطابق پولیٹیکل سوسائٹی قانون، مقررات اور دستورات کے ذریعہ عوام پر نظام اور کنٹرول رکھتی ہے۔ جب کہ سول سوسائٹی اپنے اجتماعات، افکار کی تبدیلی اور سیاسی نفسیات کے ذریعہ لوگوں پر حکومت کرتی ہے۔ گرامشی کے نظریات کے مطابق سول سوسائٹی ایک قسم کے عملی کاموں اور مؤسسات کا مجموعہ ہے جو آئیڈیالوجی حکومت کو جواز بخشتا ہے اور یہ کام دو طریقوں سے انجام پاتا ہے ایک یہ کہ اکثریت کی رضایت کے ساتھ ون یونٹ ایجاد کرنا اور دوسرا مختلف عدالتی، حکومتی اداروں کے قیام اور گروہی فعالیت کے ساتھ۔ گرامشی اپنے ان بیانات کے ساتھ کوشش کرتا ہے کہ حکومت کو سول سوسائٹی کی شناخت کے ساتھ درجہ بندی کرے۔ اس نظریے کی بنیاد یورپ اور امریکہ کا تاریخی تجزیہ اور امور سیاسی سے امور اقتصادی تک عصر جدید و ماڈرن لائف کے تجزیہ پر رکھی گئی ہے۔ سول سوسائٹی حکومت کا ایک حصہ قرار پائے گی جو پیداواری خدمات اور غالب طبقوں کی محروم طبقوں پر غلبہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ گرامشی کے لیے تمام حکومتیں ضروری ہیں لیکن ایسی حکومت کہ جو سول سوسائٹی پر مشتمل ہو زیادہ ضروری اور لازم ہے۔ سول سوسائٹی ایک ایسا کور ہے جو حکومتوں، حکمرانوں اور حاکم طبقہ کی محافظت کرتی ہے۔ اس بناپر سول سوسائٹی مختلف گروہوں کے درمیان مقابلے کا میدان ہے، یہ ہمیشہ حکومتوں کو سیاسی جواز عطا کرتی ہے۔ اب تسلط اور غلبہ کی حالت میں کیا کرنا چاہئے؟ گرامشی کا جواب یہ ہے کہ مختلف قسم کے گروہوں اور تحریکوں کے ذریعہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی حصوں کے ساتھ ایک منظّم معاشرہ کو جنم دیا جائے تا کہ یہ خود کو زندان سے آزاد کرا سکے۔ گرامشی کی نگاہ میں انقلاب یعنی اقتصادی قدرت کی سرگردانی اور حکومت کو ہاتھ میں لینا ہے۔ گرامشی اس سیاسی جدوجہد اور نظریات کی وجہ سے ایک عرصہ تک زندان میں رہا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سرد جنگ کی صورت میں دو بڑے بلاک سرمایہ دار لیبر لسٹ اور کیمونسٹی سوشالیسٹ ہی واحد سیاسی، فوجی اور اقتصادی نمونے نہ تھے بلکہ دوسرے افکار یورپی مفکرین، سیاسی معتبر افراد، روشن خیال حضرات اور بہت سے دوسرے مغربی مفکرین بھی تھے۔ نصف صدی تک سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی مغربی روشن خیال حضرات دو سیاسی مکتب "آزاد دنیا کی صنعتی ڈیموکریسی" اور "عوامی سوشیالسٹ ڈیموکریٹک" کے ایسے شیفتہ و فریفتہ تھے کہ سول سوسائٹی کے مفہوم کو بہت کم اہمیت دیتے

تھے۔ گرامشی اور اس جیسے مفکرین کو دونوں کیمپوں یعنی روش شناسی اور عمرانیات سے دھتکارا جا چکا تھا۔ کیونکہ گرامشی کے افکار میں جہاں مغربی سرمایہ دارانہ نظام کو محکوم کیا گیا تھا وہاں روسی سوشیالسٹ اور یورپی سامراج کو بھی جس نے مشرقی اور مرکزی علاقوں پر تسلط جمایا ہوا تھا، باطل قرار دیا گیا۔ اقتصادی ترقی، سیاسی تحولات، ٹیکنالوجی کے نظریات اور گرامشی قدرت پسندی مغربی سرمایہ داری معاشرے میں زیادہ صادق آتی تھی۔ سول سوسائٹی متحدہ روس کے سقوط اور مشرقی اور مرکزی یورپ میں تبدیلیوں تک ایک دور افتادہ موضوع اور اصطلاح تھی۔ یہاں تک کہ ایران کا اسلامی انقلاب اور ۱۹۷۰ء کے عشرہ میں مسلمانوں کی آزادی پسند تحریکیں بھی مغرب کی خشکی اور فکری یکسانیت کو ختم نہ کر سکیں۔

۱۹۸۰ء کے عشرے کے آخر میں مرکزی اور مشرقی یورپ میں سول سوسائٹی اقتدار طلب حکومتوں کے مقابلہ میں ایک حربہ کے طور پر پیش کی گئی اور اس کے بعد کی تبدیلیوں نے یورپی اور بعض دوسرے غیر یورپی ممالک میں ایک نئے انداز کو اجاگر کیا۔ سول سوسائٹی نے ایک بار پھر معاشرے کے دیرینہ سوالوں ڈیموکریسی اور شراکت کو پیش کیا اور گرامشی، ہیگل او دوسرے افراد کے نظریات کو عصر جدید کے مفکرین جیسے یورگن ہابرماس وغیرہ نے اپنی تحریروں میں دوبارہ زندہ کیا۔

چوتھا باب

سول سوسائٹی اور ڈیموکریسی

ویتنام کی جنگ میں امریکہ کی شکست، ایران میں انقلاب اسلامی کا وجود اور طلوع، اور دوسری طرف وہ مشکلات اور پیچیدگیاں جو ماڈرنیٹی (Modernity) کی تھیوری کی وجہ سے افریقی، مشرقی اور لاطینی امریکہ میں پیدا ہوئیں تھیں اور اسی طرح لبرلزم سرمایہ داری آپریشن کی ناکامی جو تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ممالک کے لیے بنا تھا، اور یہ آپریشن درحقیقت ان کی سیاسی اور اقتصادی ترقی کے لئے نہیں تھا بلکہ ان کے اوپر تھوپا گیا تھا؛ ان ساری چیزوں نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں، امریکہ کو اپنی اسٹرٹیجی اور خارجہ اور بین الاقوامی سیاست اور اس کی آپریشن بندی میں تجدید نظر کرنے پر مجبور کر دیا۔ رونالڈ ریگن کی صدارت کے زمانے سے ترقی کی راہوں کو طے کرنے والے ممالک میں ڈیموکریسی کی سیاست نے آمریت، سامراجیت اور مارشل لاء نظام کی جگہ لے لی۔ اور امریکہ کی خارجہ سیاست نے ڈیموکریسی کے نام پر درحقیقت انہیں اقتصادی اور سیاسی اہداف کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ جس کی بنیاد دوسری عالمی جنگ عظیم کے بعد رکھی گئی تھی۔ امریکہ کی اسی جاہ طلبی اور سلطنت پسندی کی پالیسی کو دوسرے مغربی ممالک نے بھی اسی عشرے میں اپنایا اور "مارگریٹ تھیچر" کی (Conservative) حکومت نے بھی واشنگٹن کی طرح آزاد بازاری (open markets) اور جمہوری سوسائٹیوں کی حمایت کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔

اس عشرہ کے ختم ہونے کے بعد دوسری دہائی (۱۹۹۰ء) کے شروع ہوتے ہی کہ جس میں خلیج فارس کی جنگ اور سوویت یونین اور مرکزی اور مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک کے شیرازے بکھرنے سے ڈیموکریسی کے مفہوم نے اپنے کم ترین درجے، کے سیاسی نفوذ کو بھی کھو دیا۔ جارج بش کے بقول: "ہم نے ڈیموکریسی کو بچانے کے لیے خلیج فارس پر لشکر کشی نہیں کی ہے"۔ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد امریکہ کا اصلی ہدف اور مقصد یہ تھا کہ امریکہ کے قومی منافع کو مشرق وسطی اور دوسرے علاقوں میں محفوظ بنایا جائے۔ اور واشنگٹن کی رہبری میں یکجہتی نظام بنایا جائے۔ مشرق وسطی میں امریکہ کا قومی منافع یہ تھا کہ تیل کی قیمت کو کم سے کم رکھا جائے اور اسے صنعتی ممالک میں اسی قیمت پر منتقل کر کے اسے

استعمال کیا جائے۔ اقتصادی اور سلامتی کی اسٹریٹجی کے اعتبار سے یہ درحقیقت اس دورے کا آغاز تھا کہ جسے اصطلاح میں عالمگیر بازار Globalization of markets اور فوجی اور ٹیکنیکی انقلاب کہا جاتا ہے۔ بل کلنٹن کی حکومت شروع ہوتے ہی، بے روح ڈیموکریسی کو "سول سوسائٹی" کا لباس پہنایا گیا، امریکہ کے حکام او رؤسا نے بھی یورپ کی تقلید کرتے ہوئے "سول سوسائٹی" کی پورے انہاک سے حمایت اور طرفداری کرنا شروع کردی۔ دوسرے لفظوں میں اس مرتبہ امریکہ کی خارجہ سیاست نے یہ طے کر لیا تھا کہ اپنے طرفداروں کو محفوظ کرنے کی خاطر، مشرقی، افریقی، لاطینی امریکہ بالخصوص سابقہ روس میں (سول سوسائٹی) کی اصطلاح کو استعمال کرے۔

دوسری عالمی جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد یعنی ۱۹۴۸ء میں جارج کینن، جو سرد جنگ کے اصلی مسببوں میں سے بھی ہے، اور اس موقع پر امریکہ کی وزارت خارجہ کی سیاسی کمیشن کا صدر تھا اس نے امریکہ کی اس دوران کی اسٹریٹیجی اس طرح بیان کی:

"حالانکہ ہم دنیا کی پچاس فیصد ثروت کے مالک ہیں، لیکن ہماری تعداد دنیا میں صرف ۶/۳ فیصد ہے۔ ہماری سیاست کا ہدف یہ ہونا چاہئے کہ آئندہ سالوں میں امریکہ کے اس تناسب اور تفوق و چیرہ دستی کو باقی رکھا جائے"۔

کینن پھر تاکید کرتا ہے کہ:

"ہماری سیاست میں کبھی حقوق بشر، ڈیموکریسی اور دوسروں کی زندگی کا معیار بلند کرنے کی گفتگو شامل نہیں ہونا چاہئے وہ دن آگیا ہے کہ ہم طاقت اور اس کے مفہوم کو اپنی مرکزیت اور اپنی بھاری بھر کم سیاست میں قرار دیں"۔

اس عقیدے اور نظریے کا اصلی اور اولین مقصد یہ تھا (کہ جو امریکہ کی عالمی سیاست میں چار دہائیوں تک قائم رہا) یعنی سرد جنگ کے اختتام اور روس کا شیرازہ بکھرنے تک قائم رہا، کہ سب سے پہلے تو امریکہ کی اقتصادی اور سیاسی بالادستی کو باقی رکھا جائے، اور اس کے بعد "کیمونزم" کے ساتھ مقابلہ کیا جائے اور اس نظام کو شکست دی جائے۔ سوویت یونین کو توڑنے اور دنیائے کیمونزم میں تزلزل برپا کرنے کے بعد بھی امریکیوں نے اپنا اصلی ہدف نہیں چھوڑا، بلکہ نئی سیاست میں تبدیلیوں اور مد مقابل ایک سپر پاور کی عدم موجودگی کے پیش نظر، اپنی سیاست میں پھر سے تجدید نظر کرنا شروع کردیا۔ اس بار امریکہ نے آمریت اور داخلی سلامتی کے بجائے، کہ جس سے یہ طے تھا کہ اقتصادی فائدہ ہوگا؛ اپنی سیاست کو بدل دیا اور "سول

سوسائٹی"، "ڈیموکریسی" اور "حقوق بشر" کی باتیں کرنا شروع کردیا۔ یہ مفاہیم اور ان سے ملتے جلتے دوسرے "دلچسپ اور دلربا" الفاظ اپنے اندر کافی حد تک قبض وانبساط کی صلاحیت رکھتے تھے اور ان میں یہ صلاحیت تھی کہ امریکہ کی عالمی اور نئی سیاست کے ہتھکنڈے کے طور پر، دوسرے ممالک میں مصلحتی مداخلت میں موثر ثابت ہوں۔ کارل گرشمین نے واشنگٹن کی سیاست کو آخری دہائی میں اس طرح بیان کیا:

"ایسی دنیا کہ جس میں علوم اور ذرائع ابلاغ و اطلاعات نے کافی حد تک ترقی کی ہے، اس میں قدرت اور طاقت پر قومی امن و سلامتی کے لئے بھروسہ کرنا کافی نہیں ہے، بلکہ اصلی اہداف تک پہنچنے کے لئے نئے نظریات، ٹیکنیک اور طریقے اپنانا بہت ضروری ہے۔"۔

دوسرے لفظوں میں امریکہ کی عالمی سیاست کا مقصد بدلا نہیں ہے اگر کوئی چیز بدلی ہے تو وہ اس کا طور طریقہ ہے۔ ذرائع ابلاغ، ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی یہ امریکہ کی نامحسوس قدرت اور حکومت کے ستون ہیں کہ جو: جدید لبرلزم" کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے ختم ہونے کے بعد جس میں امریکہ سپر پاور اور قوی ترین سیاسی اور اقتصادی نظام لیکر بین الاقوامی سطح پر ظاہر ہوا، ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کی ترویج و تشہیر اب اس کی عالمی سیاست کا ہتھکنڈہ نہیں رہ گئے تھے، بلکہ اس کے برخلاف اس کی سیاست کا مقصد یہ تھا کہ یورپی سرزمین کو اقتصادی میدان میں ترقی کی طرف بڑھایا جائے اور اس کی "مارشل فیلڈ" کے تحت مدد کی جائے، اور دوسرے بعض مغربی یورپ کے ممالک جیسی جرمنی اور اٹلی کے حکومتی معاملات میں مداخلت کرے، ان کی راہنمائی کی جائے اور مشرق، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں انفرادی اور فوجی حکومت تشکیل دی جائے۔ جیسے انڈونیشیا، جنوبی کوریا، گویٹمالا، پاکستان، سعودی عرب، اردن اور دوسرے ممالک، یہ ساری چیزیں امریکہ کی اصلی سیاست کا مقصد تھیں۔ بعض ممالک جیسے جاپان کے متعلق امریکہ کی سیاست کا اصلی مقصد یہ تھا کہ ان کے بنیادی اور سیاسی نظام اور بیوروکریسی میں تبدیلی لائی جائے، اور اس نظام کو آمادہ کیا جائے کہ وہ "سرمایہ داری" کی پیسیفک ایشیا میں حمایت کرسکے۔ کیمونزم سے مقابلہ کا نعرہ لگانے سے امریکہ کا اصلی مقصد یہ تھا کہ ہر اس خطرے کی روک تھام کی جائے جو امریکہ کی اقتصادی اور سیاسی سرمایہ داری کے خلاف ہو کہ جس سے واشنگٹن کی سرداری اور قدرت کو عالمی سطح پر نقصان پہنچے۔ ایسی سیاست کہ جس نے نہ صرف قومی ڈیموکریسی اور عوامی نمائندگی کو ان ممالک میں نقصان پہنچایا بلکہ امریکہ کی مداخلت نے غیر حکومتی اداروں

اور احزاب کو جیسے سیاسی احزاب، مزدور یونین وغیرہ کو یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں کہ جن میں یہ ادارے اور تنظیمیں اہم کردار ادا کرتے ہیں، تنزلزل اور نابودی کے دہانے تک پہنچادیا۔

ایک اہم اور تاریخی دستاویز کہ جو اس دورے میں امریکہ کی عالمی سیاست کی طرف راہنمائی کرتی ہے، وہ قانون ہے کہ جو "میمورنڈم ۶۸ N.S.C" یعنی سیکورٹی کونسل کے نام سے مشہور تھا۔(۷۶) یہ میمورنڈم کہ جو دسیوں سال تک امریکہ کی عالمی سیاست کا حصہ بنا رہا، اس کے اثرات، عالمی تبدیلیوں اور سوویت یونین کے ٹوٹنے کے باوجود، امریکہ کی خارجہ سیاست میں دیکھے جاسکتے ہیں، امریکہ کی اسٹریٹجی کو دو اہم حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ موجودہ دنیا میں امریکی سسٹم کی بقااور دوام کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا۔

۲۔ سوویت یونین کے اتحاد اور امریکہ کے آئیڈیالوجیک، سیاسی اور اقتصادی دشمنوں کو مہار کرنا۔ اس میمورنڈم میں یہاں تک تاکید ہوئی ہے کہ اگر روسی جمہوریتیں نہ ہوتیں تب بھی ہمیں ان مشکلات (امریکہ کی مخالفت) کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس میمورنڈم میں پیش کی گئی اسٹریٹجی مکمل طور پر اس رپورٹ سے ہم آہنگ ہے جسے صدر روزولٹ نے دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی خارجہ سیاست کے بعد پیش کی تھی۔ یہ رپورٹ جو ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۳ء کے اواسط تک تیار کی گئی، اس کا لب لباب اور اہم نکتہ یہ ہے کہ امریکہ کی خارجہ سیاست کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ دنیا بالخصوص تیسری دنیا کے قدرتی ذخائر اور عالمی بازار پر تسلط قائم رکھا جائے، اور اس مقصد کے حصول کی خاطر امریکہ اپنی پوری انسانی اور اقتصادی قدرت و توانائی کو اکٹھا کرے گا اور کسی بھی پیش قدمی سے پہلو تہی نہیں کرے گا۔ یہ ایسی اسٹریٹیجی تھی جس نے امریکی حکام کے اتنے ہاتھ کھول دیئے تھے کہ نہ صرف وہ عالمی مصلحت و سلامتی کی خاطر دوسرے ممالک کے داخلی امور میں مداخلت کریں، بلکہ ہر وہ سیاسی و اقتصادی تحریک کہ جو یورپ کے سرمایہ داری نظام اور اس کی بالادستی کے خلاف ہو اس کی روک تھام کریں۔ اس طرح سے سیاسی ترقی امریکہ کی نظر میں قابل قبول ممالک میں سیاسی استحکام میں بدل گیا اور اقتصادی ترقی وارتقاء اور کمیونزم سے مقابلے کی وجہ سے لوگوں کے عقائد کا گلا گھوٹنا اور سول سوسائٹی کی انجمنوں کا ختم کرنا عالمی طور پر جائز ہوگیا۔ حکومتی برجستہ افراد کی حمایت، ملکی یا فوجی پیمانہ پر فوجی یا انفرادی حکومت کی حمایت کرنا، انفرادی احزاب اور گروہوں کی تشویق و تحسین، روایتی اور مذہبی اداروں کو ختم کرنا، ہنرمندوں اور کاریگروں کی یونین پر نظر رکھنا، قومی تعلیم و

تربیت میں براہ راست مداخلت کرنا، قومی اداروں اور انجمنوں کی روک تھام کرنا، یہ ساری سیاستیں ڈیموکریسی کے اصول کے خلاف ہیں اور یہ سیاستیں سول سوسائٹی کے ایجاد کے خلاف ہیں کہ جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حکومت و سلطنت سے بالکل ہٹ کر ہو۔

یورپ میں پائے جانے والے مختلف نظریات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک معاشرے کو کنٹرول کرنے کے دو راستے ہیں:

سول سوسائٹی کے حساب کتاب کو سیاسی معاشرے سے الگ رکھا جائے۔ سیاسی معاشرے کی فہرست میں حکومتی ادارے، سیاسی برجستہ افراد، بیوروکریسی اور قوائے مجریہ، مقنّنہ و عدلیہ قرار پاتے ہیں اور سول سوسائٹی کی فہرست میں طریقہ کار اور کنٹرول کرنے کی ذمہ داری غیر حکومتی اداروں سے وابستہ ہے کہ جس میں سیاسی احزاب، مختلف یونینیں، یہاں تک چھوٹے چھوٹے مختلف گروہ بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔ یہ دو طرح کی فہرستیں اپنی اپنی مستقل فضا اور ماحول کو تشکیل دیتے ہیں کہ جس کے درمیان کے روابط اور ان پر تسلط معاشرہ کے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی ستون کو بناتا ہے۔ دو سپر پاور چاہے وہ امریکہ ہو یا روس، ان دونوں کی اسٹرٹیجی یا سیاست، سرد جنگ کی حدود میں تیسری دنیا کے متعلق بالکل الگ چل رہی تھی۔ ان میں سے کسی میں بھی حقیقی معنی میں نہ صرف یہ کہ آزادی عمل نہیں پائی جاتی تھی، بلکہ اگر ہم سول سوسائٹی کی سیاسی اور اقتصادی طور پر چھان بین کریں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ مذہبی اور غیر حکومتی ادارے نظریات کے دباؤ اور ماڈرنیٹی کی سیاست کی وجہ سے نظر انداز کئے جانے لگے تھے۔ درحقیقت مذہبی تحریک آزادی کا لاطینی امریکہ میں سر اٹھانا اور اسلامی تحریکوں کا ایشیا، افریقہ اور یورپ میں وجود، یہ سب داخلی اور خارجی پیمانہ پر حکومت اور سلطنت طلبی کی زنجیروں کو توڑنے اور عوامی اداروں کی طرف واپسی (مغربیوں کی زبان میں سول سوسائٹی) کی ایک کوشش تھی۔

آخری دہائی میں ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کے متعلق مغرب بالخصوص امریکہ کی سیاست کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مغربی طاقتوں جیسے امریکہ کی خارجہ سیاست کا ایک کلی تصور پیش کریں۔ آخری چند دہائیوں کی تحقیقات جو سیاسی اور اقتصادی میدان میں انجام پائیں ان سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ امریکہ کی یہ عظیم قدرت، چاہے اس نظام کے اندر ہو یا باہر، ایک بہت بڑے گروہ کے ہاتھ میں ہے کہ جو اس ملک کے چیدہ افراد سے تشکیل پایا ہے۔ امریکہ کے تین سو میلین لوگوں میں سے صرف چند

ہزار افراد پر مشتمل ایک گروہ ہے کہ جو در حقیقت اس نظام کے متعلق منصوبہ بندی کرتا ہے، جیسے خارجہ سیاست اور صلح وجنگ کے متعلق منصوبہ بندی کرنا، تنخواہیں اور بجٹ معین کرنا، سرمایہ لگانا، قومی قوانین بنانا، عمومی صحت پر توجہ دینا اور ذرائع ابلاغ، اخبارات و جرائد پر نظر رکھنا اور ان کے متعلق سیاست بنانا۔ امریکہ کے خارجہ امور کی سیاست بنانا اور منصوبہ بندی کرنا یہ سب امریکہ کی داخلی سیاست اور قدرت سے براہ راست وابستہ ہے۔ اسی طرح سے امریکہ میں حکومت اور معاشرے کے روابط اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس طرح کے منصوبے اور سیاست کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے۔ ڈورکیم اور پیرسون کے سماجی نظریہ کے تئیں طاقت، معاشرے میں تقسیم ہوتی ہے اور حکومت ایک طبیعی اور بے طرف محور اور مرکز ہے۔ احزاب یا دوسرے مختلف اعضاء کو کنٹرول کرنا معاشرہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ نظریہ لبرل افراد کا موقف بھی ہے اور ڈوٹوکویل کے بقول ان ساری کارکردگیوں کی جڑ امریکہ کی ڈیموکریسی میں ہے، کہ جو رضاکارانہ غیر حکومتی اداروں سے بنی ہے۔ اس نظریے کے پیش نظر، امریکہ کی عالمی اور خارجہ سیاست، ترقی پسند معاشرے کے اکثر لوگوں کی رائے کی عکاس ہے۔ "رئیلسٹ" مکتب کے نظریات عالمی اور خارجہ سیاست کے متعلق ان نظریات کے موافق ہے۔ اگر ہم دوسرے لبرل سماجی افراد جیسے، میکس وبر کے نظریات کو مان لیں تو حکومت ایک ایسا ادارہ ہے جو اپنے تک محدود ہے، اور وہ سول سوسائٹی کی ہمہ گیر نمائندگی نہیں کرتا ہے۔ ان حالات اور شرائط کے مطابق خارجہ سیاست بنانا ایک گروہ کے ہاتھ میں ہے جو حکومت میں مداخلت کرتے ہیں، اس طرح کی سیاست اور آپریشن بندی ضروری نہیں ہے کہ وہ معاشرہ اور سوسائٹی کی پوری طرح آئینہ دار ہو۔

تجربی تحقیقات، امریکہ کی خارجہ سیاست کے متعلق، موجودہ صدی میں لبرل افراد کے نظریات اور ان کے طریقہ کار کو رد کرتی ہیں، اور اس نظریہ پر زور دیتی ہیں کہ امریکہ کے نظام سے متعلق منصوبہ بندی ایک خاص گروہ کے تحت انجام پاتی ہے، جو اقتصاد پر مبنی سیاست کے ماہرین سے تشکیل پاتا ہے۔ (۷۷) اس نظریے کے مطابق حکومت یا تو معاشرے سے ہٹ کر ایک مستقل اکائی ہے یا پورے معاشرے کی اچھی طرح عکاسی نہیں کرتی۔ اس چیز کے متعلق یورپ میں مختلف تصنیفات پائی جاتی ہیں، جس میں درج ذیل نمونے پیش کئے جاسکتے ہیں: سی۔ رایٹ میلز کی تحریر میں "ماہرین قدرت" کے متعلق اور رول میلیبنڈ کی تحریر "سرمایہ داری حکومت کی سوسائٹی میں" کے متعلق اور اس کے علاوہ علوم سیاسی کے محققین کے

مقالات جیسے جی ویلیم ڈیم ھوف اور تھامس۔ آر، ڈای، کے سارے نظریات کا خلاصہ " قدرت و طاقت کا تمرکز " بنتا ہے۔ " طولانی حکومت " کا جو مفہوم گرامشی نے پیش کیا ہے۔ وہ اس مفہوم (قدرت و طاقت کا تمرکز) سے بالکل ہم آہنگ ہے کیونکہ گرامشی کی نظر میں سول سوسائٹی اور حکومت کے درمیان ایک ظاہری فرق ہوتا ہے اور قدرت و سطوت کا رجحان ہمیشہ معاشرہ اور سوسائٹی میں اسی طرح باقی رہتا ہے، جس طرح حکومت میں۔ اور یہ تفوق اور برتری کا رجحان ہمیشہ منفی حالت میں نہیں رہا ہے، بلکہ اس میں تحرّک پایا جاتا ہے اور اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ پورے معاشرے اور سماج کو کسی خاص سمت اور جہت کی طرف لے کر چلے۔ اس طرح سے طولانی حکومت، سیاسی سوسائٹی اور سول سوسائٹی سے مل کر بنتی ہے۔ اگرچہ جن اہل قلم کے نظریات اور آثار کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے انہوں نے زیادہ تر قومی حکومت کے بارے میں لکھا ہے اور عالمی اور خارجہ سیاست کے بارے میں کم لکھا ہے لیکن اس کے باوجود یہ آثار ہمیں، یورپ اور امریکہ کی سیاسی تبدیلیوں کے بارے میں آگاہ کر سکتے ہیں بالخصوص اس سیاست کے بارے میں جو اِن لوگوں کی " ڈیموکریسی " اور " سول سوسائٹی " کے متعلق رہی ہے۔ مشرقی اور غیر مغربی ممالک یا آج کی زبان میں " ترقی پذیر ممالک " کے متعلق اس آخری دہائی میں، امریکہ اور مغربی یورپ کی سیاست یہ رہی ہے۔ تیسری دنیا کی سول سوسائٹی میں اثرورسوخ پیدا کیا جائے اور " ڈیموکریسی " کی کارکردگی پر نظر رکھی جائے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد والی دہائیوں میں " ماڈرنیٹی " کی یہ کوشش رہی ہے کہ فوجی، سیاسی اور اقتصادی میدان میں نابغہ افراد کی تعلیم وتربیت اور پرورش و پرداخت کے ذریعہ، مغرب کی چیرہ دستی کو دنیائے سرمایہ داری میں محفوظ بنایا جائے۔ جبکہ نظریہ " ڈیموکریسی " اور " سول سوسائٹی " کی کوشش یہ ہے کہ مغربی عوامی نمائندگی کو عوام الناس اور نابغہ افراد میں نشر کرکے، اس پر نظر رکھیں۔ سول سوسائٹی ایسے حالات میں اس بات کی کوشاں ہے کہ ایک قومی حکومت تشکیل دی جائے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سول سوسائٹی حکومت سے ہٹ کر ایک کھلی فضا اور ماحول کا نام ہے کہ جو مستقل ہو اور حکومت کی سیاست اور اس کے فیصلوں میں مداخلت کرے۔

مغرب اور بالخصوص امریکہ کی عالمی سیاست میں تبدیلی یعنی استبدادی حکومت کی حمایت کو چھوڑ کر بے روح اور توافقی ڈیموکریسی کی حمایت کرنا اس وجہ سے ہے کہ آخری دو عشروں میں مغربی سرمایہ داری اور لبرالزم تین بنیادی تبدیلیوں کے ساتھ عالمی سطح پر رونما ہوا۔ پہلی تبدیلی یہ کہ عوامی اور خود مختار اور مستقل

حکومتیں دنیا کے مختلف حصوں میں وجود میں آئیں، جن میں سر فہرست ایران ہے، ان حکومتوں کی یہ کوشش رہی کہ "کمیونزم" اور "لبرلزم" کے دائرے سے ہٹ کر، اپنے ذاتی طور طریقے اور ڈیموکریسی اور عوامی رہبریت کو بھاوا دیا جائے اور اسی کی نشر و اشاعت کی جائے۔ مغرب کی نظر میں، غیر مغربی عوامی رہبریت، نظام سرمایہ داری کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے اور یہ چیز یورپ اور امریکہ کے سماجی اور سیاسی اصولوں کے خلاف ہے کہ جسے لگام دینا اور مہار کرنا بہت ضروری ہے۔ دوسری تبدیلی جو اسی بیداری اور ہوشیاری کا ادامہ ہے اور دنیائے مشرق بالخصوص مسلمانوں میں وجود میں آئی اور اس کے نتیجہ میں روس اور اس سے وابستہ حکومتیں مرکزی اور مشرقی یورپ میں ٹوٹ گئیں اور اس کے بعد مغربی ماڈرنیٹی سوشلزم کی صورت میں زیر خاک کردی گئی۔ سوشلزم اور کمیونزم کی دنیائے لبرلزم کے ساتھ شراکت نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا یورپ اور امریکہ کی تجربی اور کلاسیک لبرلزم کہ جو کم از کم ایک صدی تک دنیا میں طاقت کا، اولین ستون بنی رہی، اس میں اتنی طاقت و توانائی ہے کہ وہ نئی دنیا کی مشکلات اور پیچیدگیوں کو ہضم کرسکے؟ تیسری تبدیلی، دنیا کے اقتصاد کا بدلنا، دوسرے لفظوں میں عالمی سطح پر سرمایہ، کام اور ٹیکنالوجی کا نقل و انتقال یا ایک نئی دریافت "گلوبلائزیشن" کا وجود میں آنا۔ یہ تینوں مل کر سبب بنے کہ علاقائی، قومی اور عالمی سطح پر سماج اور معاشرے کو کنٹرول کرنے کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔ "سول سوسائٹی"، "عالمی سول سوسائٹی" اور "ڈیموکریسی" کا پیش خیمہ در حقیقت امریکہ اور اس کے ہمفکر ممالک کے وہ منصوبے ہیں، جن کو انہوں نے ترمیم کیا تھا۔ اور وہ ممالک کہ جو روسی حکومت سے علیحدگی اختیار کئے ہوئے تھے، انہیں مجبوراً اس اسٹریٹجی کے تحت آکر، زیر نظر ہونا تھا۔

آخری دہائی میں عالمی اقتصاد یا عالمگیر معاشیات کا اصلی سبب صرف تجارتی ادارے یا ملٹی نیشنل اور غیر ملکی کمپنیاں ہیں۔ دولت و ثروت کی فراوانی پر نظر رکھنا اور اسے تقسیم کرنا، یہ سرمایہ اور ٹیکنولوجی کی توسیع اور تقسیم کار کے ہمیشہ ساتھ ساتھ رہا ہے۔ صنعتوں کی مدیریت انہیں ایجاد کرنے سے زیادہ، سیاست اور معاشی امور میں اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے عالمگیر شرائط میں عالمی سرمایہ داروں کی نظر، قومی نظریات و قوانین کی بجائے بین الاقوامی سطح پر رائج طور طریقوں کے بالکل مطابق ہے۔ ان غیر ملکی اداروں کے ماہرین، اپنا خود مستقل سیاسی اور اقتصادی منصوبہ رکھتے ہیں، اور یہ منصوبے دو مفاہیم یعنی "نیولبرل" اور

"سول سوسائٹی" میں خلاصہ ہوتے ہیں۔ موجودہ حالات میں غیر ملکی سرمایہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حکومتیں تین اہم امور کی انجام دہی کی ذمہ داری لیں:

۱۔ ایسی مالی اور بجٹ کی سیاست کو بروئے کار لائیں جس کے ذریعہ قومی اقتصاد مستحکم ہو۔

۲۔ عالمگیر معاشیات کی ترقی کے لئے بنیادوں کو مضبوط بنائیں۔

۳۔ عمومی امن وسلامتی اور سماجی کنٹرول کو مستحکم بنائیں جو ایک واحد کلی آئیڈیالوجی کے تابع ہو۔

جس طرح سے بنیادیں جیسے مواصلاتی نظام، لاجسٹک، اخبارات، سیٹلائیٹس، کمپیوٹر وغیرہ۔۔۔۔ عالمی نظام کے لئے انفارمیشن ایکسپریس وے ہیں، اسی طرح سے تعلیم یافتہ طبقہ دوسرے لفظوں میں وہ جوان نسل جو بیدار ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو، اسے "شراکت"، "ڈیموکریسی" اور "سول سوسائٹی" کا عنوان دے کر انہیں کنٹرول کرنا اس "نیولبرلزم" کی حدود کا لازمہ ہے۔ "نیولبرلزم" نظریے کے پیش نظر، عالمگیر معاشیات کے ماہرین کے بنائے ہوئے اس منصوبے کا تقاضا ہے کہ معاشرے کو کنٹرول کرنے کے ذریعے سے سیاسی نظام کو مستحکم بنایا جائے، کیونکہ استبدادی اور فردی نظام کو جو پہلے رائج تھے اور انہیں مغربی حکومتوں کی حمایت حاصل تھی، ان میں یہ توانائی نہیں ہے کہ وہ آج کے عالمی اقتصادی کی ذمہ داریوں کو نبھا سکیں۔ ان ماہرین کے مطابق عالمگیر اقتصاد کا ظہور درحقیقت "عالمی سوسائٹی" کا پیش خیمہ ہے۔ گرامشی نے کئی سال پہلے کہا تھا کہ انیسویں صدی کے اواخر میں سرمایہ اور سرمایہ داری کے مستحکم ہونے سے حکومت کی طاقت اور اس کے تصرف کو مغرب کے مرکزی ممالک میں "سول سوسائٹی" کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرح سے اکیسویں صدی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بین الاقوامی اور عالمگیر معاشیات کہ جو امریکہ کی سرمایہ داری کے تحت وجود میں آئی اس کی وجہ سے حکومتی ماحول اور فضا نے "سول سوسائٹی" میں رسوخ پیدا کرنا شروع کر دیا۔ اسی وجہ سے بین الاقوامی سطح کے صاحبان نظر جیسے رابرٹ کاکس اس بات کے معتقد ہیں کہ عالمی سطح پر قدرت اور حکومت کو بے اثر بنا کر "سول سوسائٹی" کو اس کی جگہ مستحکم بنایا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسی چیز ممکن ہے؟ مگر یہ کہ کہا جائے ایسی "عالمی سوسائٹی" درحقیقت خود ہی طاقت پسندی کی بنیاد ہے۔ اور سماج کو کنٹرول کرنے پر مبنی ہے۔ عالمگیر معاشیات کی یہ کوشش ہے کہ دنیا کو ایک سیاسی نظام میں بدلا جائے اور ایسے نظام کے ستون تین چیزوں پر استوار ہوں:

۱۔ وہ اقتصادی سسٹم کہ جس کی اصلی علت ملٹی نیشنل تجارتی ادارے ہوں۔

۲۔ایسا سیاسی نظریہ کہ جس کے مبلغین اور مفکرین، عالمی سرمایہ دار طبقے کے حامی ہوں۔
۳۔ایسا ثقافتی نظام جو آج کی رائج مصرفی اور عوامی ثقافت کی ترویج کرسکے۔

امریکہ کی دوسرے ممالک کے امور میں مداخلت درحقیقت سیاسی اور معاشی طاقت پسند، طبقے کی مداخلت ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ ان ممالک میں پرانے اور نئے گروہوں کے ساتھ فوجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی روابط بڑھا کر سیاسی نظام، عوامی نمائندگی اور حکومت کو اپنے سلیقے کے مطابق تبدیل کیا جائے، اور اسی طرح معاشرتی ماحول بدلنے سے اور برجستہ شخصیتوں کی تشویق اور حوصلہ افزائی کے ذریعے مغرب کی طرف رجحان سے مطمع نظر عالمی سیاست کو مستحکم بنایا جائے۔ سیاسی نظاموں کو نیولبرلزم کے ساتھ مدغم کرنا "پولارکی" طریقے کے ذریعے انجام پاتا ہے کہ جو مصلحتی اور بناوٹی ہوتا ہے۔ (۷۸) پولارکی ڈیموکریسی کے لئے حقیقی اور عوامی روش نہیں ہے بلکہ صرف ظاہری ڈیموکریسی ہے کہ جسے کسی معاشرے کے گنے چنے برجستہ افراد، حکام، روشنفکر افراد اور مفکرین بناتے ہیں تا کہ ان کے ذریعے معاشروں، گروہوں اور سیاسی کانفرنسوں اور انتخابات پر نظر رکھی جاسکے۔ پولارکی درحقیقت پہلے سے طے شدہ ایک ورکشاپ ہے، وہ احزاب اور گروہ کہ جو ڈیموکریسی، آزادی اور سول سوسائٹی کا دعویٰ کرتے ہیں، جواز پیدا کرلیتے ہیں۔ پولارکی کی یہ کوشش رہی ہے روشن خیالوں یا دوسرے لفظوں میں سماج کے ذہین افراد کو اپنی طرف کھینچے اور اس طرح سے اپنے طبقہ کے لوگوں کی آئیڈیالوجی کو جواز بخشے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ مغرب کے سیاسی اور معاشی اثرات جو موجودہ مفکرین کے ہیں، چاہے وہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے، مارکس سے لیکر کارل منہایم تک، سب روشن خیالوں کے لئے بہت زیادہ احترام کے قائل نہیں ہیں۔ مارکس کی نظر میں یہ افراد (روشن خیال) معاشی اور سماجی سسٹم کا حاصل اور نتیجہ ہیں اور منہایم کے بقول یہ لوگ مستقل اور اس نظام کے دائرے سے خارج نہیں ہیں۔ اسی طرح گرامشی کی نظر میں حکومتی روشن خیال صرف سسٹم کو جواز عطا کرتے ہیں۔

مغربی معاشرے کے روشن خیالوں کی اپنی حکومت کے ساتھ ہمفکری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغربی اور امریکی ممالک میں ایسے برجستہ اور روشنفکر افراد نہیں پائے جاتے جو نظام پر تنقید کرسکیں۔ جو چیز سیاسی علوم کے مطالعات ثابت کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ امریکہ، فرانس اور برطانیہ کے شہری نظام میں علوم کے برجستہ اور روشن خیال افراد کے نظریات اور ان کی آراء، ان ممالک کے سیاسی اور معاشی برجستہ افراد اور روشن

خیالوں سے ہم آہنگ ہیں۔ اور سول سوسائٹی کی کارکردگی میں ان کا مقام و حیثیت زیر سوال ہے اب اصلی سوال یہ ہے کہ مغربی نظام میں قومی سیاست اور علوم اجتماعی کے آثار میں کیا رابطہ پایا جاتا ہے کہ جس میں روشن خیال افراد اور اسٹوڈنٹس طبقہ کافی حد تک حصہ دار ہے؟ مثلاً جس طرح سے یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں علم استشراق اور اسلام شناسی انیسویں صدی سے لیکر اب تک دوسری جنگ عظیم کے بعد والے سالوں میں سامراجی اور مغربی سیاست سے وابستہ رہی ہے، اسی طرح سے امریکہ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں ماڈرنیٹی کی ادبیات اور تحقیقات، واشنگٹن کی بنائی ہوئی سیاست سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ امریکہ میں بہت ساری ایسی تحقیقات ہیں کہ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آخری آدھی صدی میں ماڈرنیٹی، مواصلات، بین الاقوامی امور، انسانی حقوق و جمہوریت وغیرہ یہ سب امریکہ کی سیاست اور منصوبوں سے وابستہ رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے موضوعات میں فکری اور مالی طور پر حکومتی اداروں نے مدد کی اور ایسی طولانی مدت تحقیقات کا بے حساب بجٹ امریکہ کی وفاقی حکومت نے ادا کیا تھا۔

ڈیموکریسی کا مفہوم، مغرب کے آثار میں ہمیشہ سے مورد اختلاف رہا ہے اور اس کے لئے کوئی ایک تعریف بیان نہیں کی گئی ہے۔ (۷۹) آج کل جب مغربی حکام، بالخصوص امریکی حکام "ڈیموکریسی کی ترویج" کی بات کرتے ہیں تو ان کی مراد "پولارکی" ہوتی ہے کہ جو ایسا مفہوم ہے کہ جسے مغربی علمی و سیاسی مفکرین نے قوت عطا کی ہے تا کہ وہ موجودہ سیاست کے دائرے میں آسکے۔ پولارکی کا اطلاق ایسے سسٹم پر ہوتا ہے کہ جس میں گنے چنے افراد حکومت کرتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق پلورلزم، سیاسی طور پر منتخب افراد کی توجہ اور جواب دہی میں پوشیدہ اور مضمر ہے۔ اس نظریہ کے تحت اس پلورلزم کی دو اصلی جہات ہیں؛ بحث و منازعہ اور ہمہ گیری سیاست۔ اس تعریف کے مطابق، ڈیموکریسی، سیاسی دائرے میں محدود ہے کہ جو محدود چیزوں کے ارد گرد گھومتی ہے۔ جیسے الیکشن کا طریقہ، حزبی اور گروہی کانفرنس، بیلیٹ باکس، کمیٹیاں اور کمیشن وغیرہ۔۔۔ ڈیموکریسی کی یہ تعریف درحقیقت قانونی تعریف ہے کہ جو ڈیموکریسی کی پرانی تعاریف جیسے عوام کی قدرت و حکومت سے مختلف ہے۔ پولارکی اور ڈیموکریسی کے مفاہیم درحقیقت ان نظریات کا ماحصل ہیں، جنہیں اٹلی کے مفکرین گاتانو موسکا اور ویلفرڈو پاروٹو نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں سیاسی ماہرین اور کثرت ثروت کے متعلق پیش کیا تھا۔ موسکا کے کہنے کے مطابق ڈیموکریسی کے ذریعہ سے حکمران طبقہ اپنی قدرت و سطوت کو زیادہ محکم بناسکتا ہے، جبکہ پاروٹو

سیاسی نظام کے استقرار میں فاشسٹ رجحان رکھتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ سول سوسائٹی کا مفہوم، بلکہ یونانی دانشوروں اور فلاسفہ سے لیا گیا ڈیموکریسی کا مفہوم بھی اپنا اصلی معنی کھو رہا تھا۔(۸۰) بیسویں صدی کے اواسط میں، جوزف شومپٹسر، (۸۱) نامی مغربی مفکر نے کیپٹلزم، سوشلزم اور ڈیموکریسی کے بارے میں کتاب تحریر کی اور ڈیموکریسی کے روایتی معنی کی تردید کی اور ایک نیا نظریہ پیش کیا کہ جو قانونی ادارتی حقوق پر مشتمل ہے۔ جس میں عوام، رقابت کے ذریعہ سے قدرت حاصل کرتی ہے اور خود منصوبے بناتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جمہوریت کے متعلق دو گروہوں کے درمیان اختلاف جاری رہے؛ ایک وہ گروہ جو "ماہرین سیاست" سے متعلق تھا اور دوسرا وہ گروہ جو ڈیموکریسی کی روایتی تعریف محفوظ رکھ کے، عوامی حکومت کو ترجیح دیتے تھے، اور یہ اختلاف اور منازعات جاری رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کے اوائل میں رابرٹ والی نے "پولارکی، شراکت اور اپوزیشن" نامی کتاب لکھی کہ جس کے بعد یہ منازعات ختم ہوئے۔ گذشتہ دہائیوں میں اور آج تک ڈیموکریسی کی تعریف اور کارکردگی میں ترقی کے بجائے تنزل رہا ہے اور ٹیکنالوجی کا پروان چڑھنا، بیوروکریسی کا وجود میں آنا، سیاسی اور معاشی حالات کا بدلنا، یہ ساری چیزیں "ڈیموکریسی" پر بہت اثر انداز ہوئی ہیں کہ جن میں سے اہم ترین موارد یہ ہیں کہ مغرب میں سیاسی رہبریت، اور بیوروکریسی میں بحران پیدا ہوا اور لوگ اپنے ہی نظام سے منہ موڑنے لگے۔

آج "پولارکی" نے مغرب میں ایک نیا دور شروع کیا ہے کہ جس میں ڈیموکریسی کی باگ ڈور صرف، منجھے ہوئے پرانے سیاسی افراد کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ نئے نئے طریقوں، جدید مواصلاتی نظام سے استفادہ کرتے ہوئے نچلے طبقے والوں کو بھی اجازت ہے کہ وہ سیاست میں شریک ہو سکیں۔ تاکہ معاشرہ میں عدم مساوات کو جائز قرار دیا جا سکے۔ اس اعتبار سے اس طرح کی ڈیموکریسی، روایتی ڈیموکریسی اور قدرت طلبی سے زیادہ مؤثر ہے۔ اس طرح سے ڈیموکریسی اصلی ہدف تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے اور گروہوں کے مابین اداروں، بیوروکریٹک قوانین، آئینی حقوق اور ٹیکنالوجی پر اختلاف عملی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ جس کا اصلی ہدف یہ ہے کہ قدرت حاصل کر کے اسے استعمال کیا جائے۔ معاشرے کو ڈیموکریسی استعمال کرنے یا خود اس کے ڈیموکریٹک ہونے کی تھیوری میں ایک تناقض پایا جاتا ہے:

اولاً تو یہ کہ اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ سماجی اور معاشی فضا کو سیاسی دائرے سے دور رکھا جائے اور دوسرے یہ کہ سماج کے ڈیموکریٹک ہونے کے بعد اس کی یہ کوشش رہتی ہے کہ ڈیموکریسی اور سرمایہ

داری کے مابین اٹوٹ رابطے کو ظاہر کرے۔ مثلاً سموئیل ہینٹنگٹن کہ جو ماڈرن ازم کے نظریات کا ماہر مانا جاتا ہے لکھتا ہے کہ :

"سیاسی ڈیموکریسی، آمدنی اور ثروت کی عدم برابری کے موافق ہے اور بعض مقامات پر پوری طرح سے مربوط ہے۔ معاشی اہداف اور اجتماعی عدالت و انصاف کی حدود میں ڈیموکریسی کی تعریف زیادہ، سودمند نہیں ہے"۔

اس طرح کا اعتراض کرنا ہمارے عقیدے کے مطابق کافی تعجب انگیز ہے۔ (۸۲) لیکن وہ لوگ کہ جنہوں نے "ڈیموکریسی" اور "سول سوسائٹی" کو مغرب کے سرمایہ داری نظریات کی حدود میں قبول کیا ہے ان کے لئے ایک استدلال ہے، کیونکہ اس نظریے کا معنی یہ ہے کہ موجودہ معاشی نظام، امریکہ اور مغربی یورپ کی سرمایہ داری پر قائم ہے اور صحیح ہے۔ بین الاقوامی سطح پر جو معاشی خلا ہے وہ ڈیموکریسی ہونے کی وجہ سے قابل تغییر و تبدیل نہیں ہے۔ درحقیقت موجودہ رائج، عالمی نظام جائز، مناسب اور مستحکم رہے گا۔

گذشتہ زمانے میں جب ڈیموکریسی کے بارے میں گفتگو ہوتی تھی تو ہمیشہ دو اہم عوامل اور نتیجے سامنے آتے تھے؛ وہ ڈیموکریسی جو مغربیوں، حکام اور بہت سے روشن خیالوں کی نظر میں قابل قبول ہے، اس ڈیموکریسی اور عام ڈیموکریسی میں فرق یہ ہے کہ آج کی دنیا میں خود، ڈیموکریسی پر اعتماد کیا جائے نہ کہ اس کے نتیجہ پر۔ وہ سول سوسائٹی جو مغربیوں کی نظر میں قابل قبول ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کے ڈھانچے پر توجہ دی جائے نہ کہ اس کی اصل پر۔۔ امریکہ اور مغربی یا شمالی یورپی ممالک میں پولارکی کے ذریعہ ترویج ہونے والی اصل ڈیموکریسی ہے۔

مغرب کی عمومی اور روایتی ڈیموکریسی میں، اکثریت کی حکومت تھی اور مختلف طبقات کی آراء کو مد نظر رکھا جاتا تھا، جبکہ موجودہ ڈیموکریسی میں اکثریت کی جگہ اقلیت آ گئی ہے۔ وہ بھی ایسی اقلیت جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ہم نے اکثریت کی رائے کے مطابق قدم اٹھایا ہے۔ یہ ایسی سیاست ہے کہ جسے مغرب دوسرے ممالک بالخصوص مسلمان ممالک کے لئے اپناتا ہے جبکہ گذشتہ زمانوں میں مغرب کے سیاسی، معاشی اور سماجی منافع، استبداد اور ڈکٹیٹرشپ اور انفرادی حکومتوں کے ذریعہ محفوظ کیے جاتے تھے۔ اور "قوم بنانا" یا "حکومت کی تشکیل" پر قومی اور ماڈرن حکومت کے دائرہ کار میں توجہ دی جاتی تھی۔ موجودہ اسٹریٹجی اس بات کی دعویدار ہے کہ یہ سارے مقاصد "سول سوسائٹی" کے پرچم تلے انجام دیئے جائیں۔ مغرب کا اجتماعی

کنٹرول اور اس کے کارمند، اوپر والے طبقہ سے نچلے طبقہ کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ آخری دہائی میں مغرب کا اصلی ہدف، بالخصوص گذشتہ سوویت یونین کے متعلق، یہ نہیں تھا کہ حکومتوں پر حملہ کر کے انہیں بر طرف کیا جائے بلکہ ان کا اصلی ہدف یہ تھا کہ وہ احزاب جو سول سوسائٹی کی حمایت کا دم بھرتے ہیں ان کے معاملات میں مداخلت کی جائے، اور جو میڈیا کی آزادی، گروہوں کی ترقی اور مختلف یونینوں کی تاسیس اور میڈیا کو اپنے راہ سے ہٹانا اور طلباء تنظیموں میں اثر و رسوخ کا دعویدار بن جانا یہ اسٹریٹجی، مشرقی ممالک جیسے جنوبی کوریا، فلپائن، انڈونیشیا اور امریکہ سارے جنوبی ممالک اور افریقہ میں لاگو کی جاتی ہے۔ وہ افراد جو مفید نہیں ہیں (لوکارنو، پینوشہ وغیرہ) ان کو بر طرف کرنے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ عالمی سرمایہ داری کے تحت سیاسی اور معاشی نظام کو محفوظ بنایا جائے۔ سوویت یونین اور مشرقی و مرکزی یورپ میں نہ صرف کیمیونسٹ اور سوشلسٹ گروہ، منحل نہیں ہوئے، بلکہ روس کا شیرازہ بکھرتے ہی یورپ نے یہ سیاست اپنائی کہ کیمیونزم کی برجستہ شخصیات کو کیپٹلسٹ میں تبدیل کر دیا جائے۔ اور سابقہ حکام، برجستہ افراد اور روشن خیال لوگوں کو مصلحتی ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کے دائرے میں کنٹرول کیا جائے۔ ساری دنیا کو ڈیموکریٹک بنانے میں "موجودہ امکانات" سے بھرپور استفادہ کرنا یورپ کی عقلمندی کی دلیل ہے۔ (۸۳)

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی خارجہ سیاست کے دو اہم ذرائع میں سے فوجی اور معاشی امداد ہے۔ امریکہ نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۹۰ء تک چار سو بلین ڈالر سے زیادہ پیسہ معاشی امداد اور تقریباً اس کے کئی برابر فوجی امداد کے لئے خرچہ کیا ہے۔ لیکن ایران کا اسلامی انقلاب آتے ہی اور اس کے بعد سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد ابھی بھی امریکہ آمدنی کے ذرائع اور اس کے حمایت یافتہ ممالک پر پوری طرح سے مسلط نہیں ہو سکا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اواسط سے امریکہ کی عالمی سیاست میں اس وقت تبدیلیاں آئیں کہ جب واشنگٹن کے سیاسی اور معاشرتی ماہرین نے یہ طے کیا کہ سیاست کے پرانے حربوں نے اپنا نفوذ اور تسلط کھو دیا ہے۔

ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کی حمایت میں امریکہ کی موجودہ سیاست اور اسٹریٹجی ایک ایسی مصلحت ہے کہ جس کی داستان بہت مفصل اور پیچیدہ ہے کہ جس کی تشریح کرنا اس مختصر سی تحریر میں ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس سیاست کا جوہر، بہت سی امریکی حکومتی اور غیر حکومتی اداروں کی کارکردگیوں میں پوشیدہ ہے کہ جسے اختصار سے بیان کیا جائے گا۔

رونالڈ ریگن اور جارج بش کی صدارت عظمیٰ کے دوران، امریکی قیدیوں کی آزادی کے بعد سے خلیج فارس کی جنگ تک، امریکہ کے سیاسی، معاشی اور سماجی ماہرین نے متعدد نشستیں اور کانفرنسیں امریکہ کی خارجہ سیاست پر تجدید نظر کی غرض سے منعقد کیں کہ جس میں مختلف اداروں کے نمائندے جیسے وائٹ ہاؤس، امریکی کانگریس، CIA، وزارت خارجہ، وزارت دفاع، سلامتی کونسل، بیرونی رابطہ کونسل، تین فریقی کمیشن، اور بھی بہت سی امریکی اور بین الاقوامی کمپنیوں کے منیجرز و مالکین اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے شرکت کی۔ ان نشستوں کے نتائج میں سے ایک اہم نتیجہ یہ تھا کہ "ڈیموکریسی پراجیکٹ" کی تاسیس کی جائے اور "قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی" کو تشکیل دیا جائے کہ جسے ۱۹۸۳ میں امریکی کانگریس نے باضابطہ طور پر تسلیم کرلیا۔

اس منصوبے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ امریکہ کے منافع اور اس کی قومی سلامتی کو تیسری دنیا میں محفوظ بنایا جائے اور مداخلت و نفوذ کے ذریعے واشنگٹن کی قابل قبول ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کو ترویج کیا جائے۔ سہ ماہی واشنگٹن، دوسرا شمارہ ۱۹۸۱ء میں "ڈیموکریسی پراجیکٹ" کے دو اہم مشیروں نے "ترویج ڈیموکریسی" کے عنوان کے تحت، اس پراجیکٹ کی سیاسی امداد اور کارکردگیوں کو اس طرح بیان کیا:

> اس صدی تک سپر پاورز کے پاس سے خارجہ سیاست میں تین اہم حربے رہے ہیں: ڈپلومیسی، فوجی اور معاشی۔ ابھی بھی یہ تین حربے اہمیت کے حامل ہیں لیکن اب اس میں دو چیزوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے؛ ایک پروپیگنڈا اور دوسرا سیاسی طور پر ہمفکر افراد اور اداروں کی کمک کرنا۔ تاکہ نئی نئی شخصیات اور اداروں کی تخلیق ہو سکے نہ کہ پہلے سے موجود اداروں کی مدد کے جائے۔

امریکہ کی خارجہ سیاست کے ماہرین کو اس بات کا خوف تھا کہ آخری دو دہائیوں میں جو سیاسی اور سماجی تحریکیں ابھر کر سامنے آئی ہیں وہ عوامی تھیں اور اپنی مخصوص ڈیموکریسی کے طریقہ کار کی تلاش میں ہیں اور یہ طریقہ کار ممکن ہے امریکہ کے سیاسی اور معاشی اہداف سے ناسازگار ہو۔ اس لئے عوامی تحریکوں اور دوسری ڈیموکریسیوں کی روک تھام کرنے کا تنہا راستہ یہ ہے کہ امریکہ اور مغرب کی مخصوص ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کو بڑھاوا دیا جائے۔ اسی غرض اور مقصد کے پیش نظر بعد والے سالوں میں امریکہ میں قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی یا اس کے ہمطراز ادارے، مغربی ممالک جیسے برطانیہ، جرمنی، اسکینڈینیوین ممالک اور فرانس میں قائم کئے گئے۔

"ڈیموکریسی پراجیکٹ" اور اس سے وابستہ اداروں کے علمی اور فکری جواز سے سیاسی آثار سرچشمہ پاتے ہیں یعنی سیاسی امداد صرف، مد نظر ممالک کی سول سوسائٹی میں نفوذ کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے، اور قومی سلامتی کونسل کے ماہرین جو قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی کی تاسیس کی حمایت کرتے تھے، انہوں نے اپنا آب و دانہ ویلیم، اے، دگلس کی "ڈیموکریسی کی ترقی" نامی کتاب میں ڈھونڈ لیا۔ ڈگلس جو امریکہ کا ایک سماجی اور سیاسی ماہر ہے اس نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ڈیموکریسی ہی ایک ایسی کشتی ہے کہ جس کے ذریعہ سے موجودہ عالمی نظام کو نجات دلائی جاسکتی ہے، اور امریکہ کے سیاسی اور معاشی منافع کو محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔ ڈگلس نے اپنی کتاب میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ترقی پذیر ممالک کی عوام کو ان بچوں کے مشابہ قرار دیا کہ جن کے ترقی یافتہ نہ ہونے کی وجہ روایتی طور طریقے ہیں، اور ان کا تیسری دنیا میں جگہ نہ پانا بھی فکری پسماندگی کی وجہ سے ہے۔ اس بنا پر ان ممالک کو درس و نظم اور سماجی طور پر کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے اور ڈیموکریسی اس ذمہ داری کو بہتر طریقہ سے انجام دے سکتی ہے۔ ڈگلس کی یہ تحلیل اگر چہ اخلاقی اور ادبی اعتبار سے توہین آمیز ہے اور حقیقت کے راستے سے دور ہے، لیکن انتہائی چالاکی سے تیسری دنیا کے ماہرین اور روشن خیالوں کی نفسیات کو بیان کر رہا ہے کہ جو مغرب کے شیفتہ ہیں اور ہر چیز میں امریکہ اور یورپ کی تقلید کرتے ہیں۔ ڈگلس نے بھی بہت سے مغربی حکام کی مانند اس بات کو درک کرلیا تھا کہ مشرق کے مغرب زدہ روشن خیال، فکری طور پر استقلال نہیں رکھتے ہیں، اور اپنی شخصیت اور اپنے کام کے جواز کو مغرب کی تقلید میں ڈھونڈتے ہیں۔ ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کے افکار یا اس سے مشابہ مفاہیم قریب ایک صدی سے یورپ سے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں منتقل ہوئے ہیں اور اس میں اتنی عمومیت ہے کہ عمومی افکار کو جمع کرنے کا بہترین حربہ بن گئے ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد ڈگلس کو امریکہ کی سلامتی کونسل کے سینئر ایڈوائزر کی سیٹ پر منصوب کیا گیا۔

"ڈیموکریسی پراجیکٹ" کے طرفدار امریکہ کی سیاسی محافل میں اس بات کے معتقد تھے کہ دوسرے ممالک کی فوجی نظام سے بدلتی ہوئی سیاست (جیسے ایران، گویٹمالا، ہائیٹی، نیکاراگوئے وغیرہ) آج کی دنیا کی معاشی حقیقت سے موافقت نہیں رکھتی، اور بے عزتی کے علاوہ نظام سرمایہ داری اور مغرب کی صنعتی ڈیموکریسی کے زوال کا سبب ہے اس لئے صرف مغربی ڈیموکریسی ہی اس بحران اور زوال سے نجات کا ذریعہ ہے۔ امریکہ کی خارجہ کونسل ایک غیر حکومتی ادارہ ہے لیکن امریکہ کی خارجہ اور عالمی سیاست میں

بہت اثر ورسوخ رکھتی ہے یہ ادارہ ۱۹۲۱ء میں پہلی عالمی جنگ کے بعد سرمایہ داروں، بڑی بڑی کمپنیوں کے حصص رکھنے والے افراد اور امریکہ کی قومی اداروں کے سربراہ حضرات وغیرہ کے ذریعہ شہر نیویارک میں بنایا گیا۔ یہ ادارہ کہ جس کے فی الحال ۳۳۰۰ اراکین ہیں اور برابر نیویارک، واشنگٹن اور باقی امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں، برجستہ شخصیات اور امریکہ کے خارجہ سیاست کے حکام سے مل کر بنا ہوا ہے کہ جس میں بعض اخبارات اور جرائد کے قلم نگاروں اور ایڈیٹروں اور اسی طرح سے اساتید حضرات اور اس ملک کی خارجہ اور عالمی سیاست کے معروف قانون دان افراد بھی ہیں۔ اس ادارے کی رکنیت محدود ہے اور صرف اس ادارے کے اراکین کی دعوت اور انتخابات کے ذریعے ہی ممکن ہے اس ادارے کے اخراجات امریکہ کی بڑی بڑی مالی اور معاشی کمپنیاں اٹھاتی ہیں، جیسے ریکفلر، فورڈ وغیرہ۔۔۔ (۸۴)۔

امریکہ کی خارجہ کونسل کے قانونی اہداف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بین الاقوامی اور خارجہ امور کے قوانین میں پوری ذہانت وفراست کا استعمال کرنا۔ اور امریکی خارجہ سیاست کے آئیڈیاز اور تحلیلیں پیش کرنا۔

۲۔ جن افراد نے امریکہ کی خارجہ سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے انہیں ان اطلاعات اور آئیڈیاز کے ذریعے شریک اور حصہ دار بنانا۔

۳۔ امریکہ کی خارجہ سیاست کے لئے مفکرین اور آئندہ نسلوں کے لیڈروں کی تربیت وپرورش کرنا۔

امریکہ کی خارجہ کونسل نے اپنے اہداف تک پہنچنے کے لئے، "خارجہ امور" کے نام سے ایک جریدہ اور بہت سی نشریات شائع کرتی ہے۔ اور اسی طرح امریکہ کی بین الاقوامی اور خارجہ سیاست پر بحث کرنے کے لئے نشستیں اور سمینار وغیرہ منعقد کرتی ہے۔ یہ ادارہ اسی طرح سے دنیا کی دو سو بڑی کمپنیوں کے لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔ معروف امریکی سرمایہ دار اور خارجہ کونسل کے اعزازی رکن ڈیوڈ ریکفلر نے چند سال پہلے اس ادارے کی ۷۵ سالگرہ پر کہا کہ:

> یہ ادارہ تقریباً آٹھ دہائیوں سے امریکہ کے سیاستدانوں کے لئے بہترین مدرسہ کے طور پر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اور یہ وہی ادارہ ہے کہ جہاں امریکہ کے سیاسی نمائندے، خارجہ سیاستدانوں اور بین الاقوامی افراد ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

امریکہ کے سابق صدور، وزراء خارجہ، سلامتی اور فوجی کونسل کی شخصیات اور دوسری اہم بڑی شخصیتیں، امریکہ کی خارجہ کونسل کے رکن رہے ہیں۔ جیسے جارج بش، اڈلی اسٹیونسن، ہنری کیسنجر، زبینگنیو برجینسکی، سایروس وینس، جارج شولنٹز، ایلن ڈیلس، ایوریل ہریمن، بیل مویر، ویلٹر لیپچن، ویلیم بینڈی، ویری کریسٹوفر، جان مکلوی اور بھی امریکی بہت سے صدارتی مشیر اور آخری دہائیوں میں سیاست میں رول ادا کرنے والے افراد۔ خلاصہ یہ کہ امریکہ کی خارجہ کونسل ایک منفرد گروہ ہے کہ جو امریکہ کے سیاسی ماہرین سے مل کر بنا ہے جو سرمایہ داروں اور کمپنیوں کے مالکین کے منافع کو مد نظر رکھ کے کام کرتا ہے۔ اس ادارے نے "ڈیمو کریسی اور سول سوسائٹی" کی ترویج کے لیے، امریکہ کا سیاسی حربہ بن کر، بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس ادارے کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ ایران کی نسبت، ان شخصیتوں اور نظریات کو آگے لایا جائے جو موجودہ اسلامی نظام کی جگہ لے سکیں اور اسلام کی فکری، سیاسی، معاشی اور ثقافتی قیادت امریکہ کے موافق ہو۔

سیاسی حوادث میں اور بالخصوص "سیاسی ترقی" کے منصوبوں میں مداخلت اور نفوذ، امریکہ کی سنجیدگی اور کوشش کی ایک طولانی تاریخ ہے۔ اور یہ دوسری عالمی جنگ کے بعد والی دہائیوں میں بہت زیادہ رائج ہو گئی ہے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب امریکہ اور سوویت یونین کی سرد جنگ میں کافی حد تک گرما گرمی آ گئی تھی، "آزاد اکیڈمی" کے عنوان کے تحت ایک لائحہ عمل بنایا گیا جس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا ادارہ بنایا جائے جو تیسری دنیا کے ممالک میں امریکہ جیسی ڈیمو کریسی کی ترویج کر سکے لیکن لائحہ عمل کئی وجوہات کی بنا پر امریکی کانگریس میں پاس نہ ہو سکا اور اس کی سیاسی ذمہ داریاں امریکہ کے دوسرے مرکزی اداروں جیسے U.S.A انفارمیشن ایجنسی اور سیکرٹ سروس C.I.A میں تقسیم کر دی گئیں۔ ۱۹۷۹ء میں یعنی انقلاب اسلامی ایران کے ساتھ ساتھ، امریکہ کے بعض سیاسی ماہرین اور حکام کہ جو امریکہ کے حکومتی اور قومی اداروں میں خدمات انجام دے رہے تھے، عوامی تحریکوں سے خوفزدہ و ہراساں تھے اور انہوں نے "پولیٹیکل فاؤنڈیشن آف امریکہ" نامی ادارہ قائم کیا کہ جس کا خرچ خود امریکہ کی حکومت، امریکن انفارمیشن ایجنسی کے ذریعے ادا کرتی تھی۔ اس فاؤنڈیشن کے اراکین امریکہ کے سیاسی، سلامتی، حکومتی اور معاشی شخصیات ہیں اور ساتھ ہی سیاسی احزاب اور بڑی بڑی مزدور یونین کے نمائندے بھی شریک ہیں۔ ہنری کسنجر اور زبیگنیو برجینسکی، اس زمانے کے امریکہ کی سیاست کے اہم نام ہیں اور ایلن وینسٹین کہ جو چند

سالوں بعد حکومت کی طرف سے "قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی" کا پہلا سربراہ بنا، یہ تمام افراد، امریکہ کی اس سیاسی فاؤنڈیشن کے اصلی اراکین میں سے ہیں ۱۹۸۱ء میں اس فاؤنڈیشن کی درخواست پر وائٹ ہاؤس میں ایک کمیشن بنایا گیا کہ جس کا اصلی ہدف یہ تھا کہ ایک ایسا منصوبہ بنایا جائے جس کے ذریعہ امریکہ کے مد نظر ممالک میں ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کی ترویج کی جاسکے۔ اس عشرے کی امریکی حکومت کے شریک کار، کرنل اُلیور نورز جیسے اسلحہ ڈیلر بھی شریک تھے جس کے کالے کرتوت بعد میں امریکی کانگریس میں آشکار ہوئے، اس کمیشن کی درخواست پر دو سال بعد امریکہ میں "ڈیموکریسی پراجیکٹ" اور اس کے بعد "قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی" بنایا گیا ہے۔ اور اس نے کام شروع کر دیا۔ ۱۹۸۲ء میں امریکہ کے صدر، ریگن نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں ایک تقریر کی؛ جس میں امریکہ کی خارجہ سیاست کے نئے دور کو ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کی ترویج بتایا۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ اسی سال کے جنوری میں ریگن نے امریکی سلامتی کونسل کے متعلق ایک میمورنڈم پر دستخط کیا جو N.S.D.D77 کے نام سے مشہور ہے، کہ جس میں امریکہ کی نفسیاتی جنگ کا پوری طرح نقشہ اور منصوبہ درج کیا گیا تھا۔ یہی وہ موقع تھا کہ جب امریکی پروپیگنڈا اور نفسیاتی جنگ کا اہم حصہ "قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی" کو سپرد کر دیا گیا۔ ۔ تین سال بعد جب امریکہ کی خارجہ سیاست میں یہ اسٹرٹیجیک تبدیلیاں آئیں تو نیویارک ٹائمز نے جون ۱۹۸۶ء کے پہلے شمارہ میں لکھا کہ:

"قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی" کا کام، عوام کی انفرادی، نفسیاتی صورت حال پر نظر رکھنا اور ان کی جاسوسی کرنا ہے جسے پچھلی دہائیوں (۱۹۵۰ سے ۱۹۷۰) تک C.I.A اور سلامتی کونسل انجام دیتے رہے تھے۔

C.I.A کے سابقہ سربراہ، ویلیم کوبی نے واشنگٹن پوسٹ کے مارچ ۱۹۸۲ء کے شمارے میں بیان کیا کہ:

"اس وقت ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنی سابقہ کارکردگیوں پر نظر ڈالیں۔ اس طرح بہت سے منصوبے کھلے طور پر نئے اداروں کے تحت اور بالکل عمومی طور پر اجرا کئے جاتے ہیں۔"

ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کے نام پر ان نئے اداروں کی موافقت اور امداد، امریکی منصوبوں سے اچھی طرح واضح ہوتی ہے اور اسی طرح وہ امداد جو افغانستان، نیکاراگوئے، ہائیٹی، چیلی اور فلپائن کے آزادی پسند جنگجوؤں کو کی گئی ہیں بہت زیادہ واضح ہے۔

امریکہ کی فیڈرل حکومت میں، قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی، ایک مستقل ادارے بلکہ غیر حکومتی ادارے کے عنوان سے درج ہے، لیکن خود اس ادارے کے بجٹ سے متعلق دستاویز کے مطابق اس کے ۹۹ فیصد اخراجات خود حکومت اور فیڈرل حکومت کے مختلف ادارے ادا کرتے ہیں۔ اس ادارے نے بہت کم مدت میں، حکومتی، قومی اور ثقافتی اداروں سے روابط بڑھانے کے ذریعے اپنا جال پھیلایا۔ جیسے "ڈیموکریٹک قومی انسٹیٹیوٹ برائے بین الاقوامی امور" اور اس کے ہمطراز ادارے، جیسے امریکہ کی جمہوریت پسند پارٹی "قومی جمہوری انسٹیٹیوٹ برائے بین الاقوامی امور" جس نے اپنا نام بدل کر "جمہوریت پسند عالمی انسٹیٹیوٹ" رکھ لیا ہے اور اسی طرح سے "خصوصی تاجروں کا بین الاقوامی مرکز" اور A.F.I اور C.E.O نامی امریکی مزدوروں کی بین الاقوامی یونین کا حصہ "انسٹیٹیوٹ آف یونین آف اوپن بزنس" یہ سب کے سب قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی سے ہماہنگ ہیں اور اس کے منصوبوں پر عمل کرتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ علمی ادارے بھی، یہاں تک کہ غیر حکومتی ادارے جیسے Y.M.C.A اور "فریڈم ہوم"، قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی کے ذریعہ امریکہ کی طرف سے ترقی پذیر ممالک کے لئے بنائے گئے منصوبوں میں شریک رہتے ہیں۔ آخری پندرہ سال میں ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کے متعلق امریکہ کے بہت بڑے پراجیکٹ امریکی یونیورسٹیوں کے حوالے کئے گئے ہیں۔ (۸۵)

قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی کے سربراہوں کی کمپنی پر اگر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو یہ پتہ چلے گا کہ کس طرح سے قومی اداروں کے رؤساء اور سربراہ یا دوسرے لفظوں میں غیر حکومتی اداروں کے سربراہ، حکومتی نمائندوں اور سربراہوں کے ہمطراز ہو کر، اس ادارے میں شرکت کرتے ہیں۔ اس ادارے کے سربراہوں کی کمیٹی درحقیقت ایک ایسا آئینہ ہے کہ جس میں حکومت کے نمائندے، بڑی بڑی کمپنیوں کے رؤساء، غیر حکومتی فاؤنڈیشن کے سربراہ اور یونیورسٹیوں کے چانسلر حضرات نظر آتے ہیں۔ اس موقع پر "سول سوسائٹی" خود امریکہ میں بھی وہ حکومت سے ہٹ کر ایک مستقل ادارہ ہونے کی بجائے درحقیقت وہ ایک ایسا حلقہ ہے جو حکومتی اور سول سوسائٹی کے ماہرین سے مل کر بنا ہے۔ ایک صدی سے حکومتی اور معاشی اداروں کی یہ کوشش رہی ہے کہ "سول سوسائٹی" کا پوری طرح سے کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیں اور یہ ایک ایسا طریقہ کار ہے کہ جسے امریکہ نے قانونی طور پر اپنی سیاست کا جز جانا ہے اور اس کی ترویج اور استحکام کے لئے دوسرے ممالک میں اصرار کرتا ہے۔ آج امریکہ کی حکومت اپنی مداخلت میں اور دوسرے ممالک

کے معاشی اور سیاسی سسٹم اور نظام کو بدلنے میں اکیلے کام نہیں کرتی، بلکہ نئے قومی، معاشی اور سیاسی اداروں کے ساتھ کہ جن کے اہداف امریکہ کی خارجہ سیاست سے ہماہنگ ہوں، مل جل کر اپنی سیاست کو جامۂ عمل پہناتی ہے۔ مثلاً نیکاراگوئے میں مداخلت اور اس کی حکومت بدلنے میں امریکہ کی حکومت نے وزارت خارجہ، وزارت دفاع، وزارت تجارت، C.I.A، سلامتی کونسل، امریکہ کا انفارمیشنل ادارہ، مواصلاتی ادارے یہاں تک کہ امریکی ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی یونین اور امریکہ کے کیتھولک پادریوں کی انجمنوں، ان سب کو اعتماد میں لیا تھا۔

قومی ادارہ برائے ڈیموکریسی کی بنیاد رکھنا، امریکہ کی خارجہ سیاست کا صرف اور صرف ایک پراجیکٹ ہے۔ بین الاقوامی روابط اور اطلاعات میں عمومی تبدیلیوں اور امریکہ کے عالمی کردار پر مشتمل ان آخری دو عشروں میں دوسرے بہت سے پراجیکٹ بھی موجود ہیں۔ مارچ ۱۹۸۳ء میں امریکہ کے صدر نے قومی سلامتی کونسل کے لئے ایک اور میمورنڈم پر دستخط کیا جو "میمورنڈم ۱۳۰" کے نام سے مشہور ہے۔ اس سند میں، قومی منافع اور سلامتی کے لئے "بین الاقوامی روابط" کو حیاتی اور بہت ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس میمورنڈم میں درج ہے کہ امریکہ اور قومی و حکومتی اداروں کے لئے ضروری ہے کہ مواصلاتی ذرائع بالخصوص ریڈیو اور ٹیلیویژن کی ترویج و توسیع کے ذریعہ امریکہ کے اہداف کو ساری دنیا بالخصوص ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ تک پہنچائیں۔ آج امریکی سفارتخانوں میں سیاسی، فوجی، سماجی اور معاشی اداروں سے وابستگیوں کے علاوہ ایسے افراد کو رکھا جاتا ہے جو ڈیموکریسی، ٹیکنولوجی اور اطلاعاتی پوسٹ اور عہدہ رکھتے ہوں اور ان کی اصلی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ مقامی حالات سے پوری طرح استفادہ کریں اور ضروری معلومات کا تجزیہ کریں۔ قلم نگاروں، خبرنگاروں، ناشروں، اساتذہ، طالب علموں اور ہنرمندوں سے تعلقات بڑھائیں اور "سول سوسائٹی" اور "ڈیموکریسی" کی توسیع میں مالی اور ٹیکنولوجیکل امداد کریں۔

"سول سوسائٹی اور ڈیموکریسی" میں توسیع کی کیفیت اور روش کو مغربی ممالک بالخصوص امریکہ نے آخری دہائیوں میں بالکل بدل دیا ہے۔ جس طرح سے امریکہ کی خارجہ سیاست کی اسٹرٹیجی کے مطابق، نئے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے ان سیاستوں کی ترویج کے لئے بنائے گئے ہیں، اسی طرح سے اس سے ملتے جلتے ادارے برطانیہ، فرانس، جرمنی، سوئڈن، ناروے، ڈنمارک اور ندرلنڈ نے بھی بنائے ہیں۔ ان میں سے کچھ پراجیکٹ یورپ کے پراجیکٹ بعض اداروں کے ذریعے جیسے یورپین یونین، یورپی کونسل و سلامتی

کونسل، انجام دیئے جاتے ہیں۔ اور امریکی اداروں کی برابری میں کام کرتے ہیں۔ سول سوسائٹی، ڈیموکریسی اور انسانی حقوق، یورپی یونین کی خارجہ سیاست کے پسندیدہ موضوعات میں سے ہیں۔ اور امریکہ کی دوسرے ممالک کے امور میں نئی سیاسی مداخلت، بالخصوص مرکزی ایشیا کے مسلمان ممالک میں اور اسی طرح مشرق وسطیٰ، افریقہ، مشرقی ایشیا اور لاطینی امریکہ کے سیاسی نظام میں، ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کے پرچم تلے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اس سے پہلے اس طرح کا منصوبہ سفارتخانوں، سیاسی، معاشی اور ثقافتی اداروں کے ذریعہ انجام دیا جاتا تھا، لیکن آج سب سے پہلے کسی بھی پراجیکٹ کے شروع کرنے سے پہلے فوجی، ہنری اور اخباری اور سیاحتی علمی کمیٹیاں بھیجی جاتی ہیں جن کی مالی امداد امریکہ کے فیڈرل حکومت کے مختلف وزارتخانوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ افراد اس ملک کی ڈیموکریسی نیٹ ورک بناتے ہیں۔ اور اہم اہم شخصیتوں سے ملاقاتوں اور اسی طرح معمولی افراد کے ذریعہ بھی وہاں کی سیاسی اور سماجی معلومات اکٹھا کرتے ہیں۔ ایسے وفد کی یہ کوشش رہتی ہے کہ ہر چیز سے زیادہ قومی شخصیات، مختلف گروہوں، پارٹیوں، کسانوں، کاریگروں، صحافیوں، جوانوں اور تاجروں سے گفتگو کریں اور سول سوسائٹی و ڈیموکریسی کے اجراء کے لئے وہاں کے حالات کا جائزہ لیں۔ ان غیر سرکاری گروہوں اور افراد کی رپورٹ کو، سفارتخانوں اور وزارتخانوں سے ملی ہوئی رپورٹ کے ساتھ ملاتے ہیں اور اسی طرح سے ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کا بیج بونے کا پہلا منصوبہ اور لائحہ عمل تیار ہوتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں اس کام سے وابستہ وزارت خانے، سول سوسائٹی اور ڈیموکریسی پراجیکٹ کے اجراء کے لئے ضروری بجٹ کا اعلان کرتے ہیں۔

ان منصوبوں کی مختلف جہات میں سے ایک جہت یہ ہے کہ سول سوسائٹی کی توسیع کی راہ میں سیاسی احزاب کو مضبوط بنایا جائے۔ پارٹی بنانا یا پارٹی بازی کرنا عام طور سے اس کام میں ماہر افراد اور اداروں کے حوالے کیا جاتا ہے۔ اور اس کے اجراء کے لیے ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ امریکہ کے مد نظر سیاسی پارٹیوں کی تأسیس اور انہیں مستحکم بنانا، امریکہ کے ڈیموکریسی پراجیکٹ کے ایک اصل معمار ویلیم ڈگلس کے بقول: یہ ایک ایسے آٹومیٹک کارخانے کی طرح ہے کہ جس کا انسٹالیشن سسٹم فراموش کیا جا چکا ہے۔ امریکہ کی خارجہ سیاست، ڈیموکریسی پراجیکٹ کے تحت اس وقت سیاسی پارٹیوں کی تأسیس یا ان کی تقویت کی منصوبہ بندی کر رہا ہے، جب یہ سیاسی پارٹیاں خود مغرب میں سالوں کے بعد سیاسی بحران میں پڑ گئی ہیں، اور لوگوں کا اعتماد کھو بیٹھی ہیں۔ لیکن امریکہ کے سیاست دانوں نے جو دوسرے ممالک کے بارے میں

اطلاعات اکٹھا کر رکھی ہوتی ہیں ان کے پیش نظر وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مد نظر ممالک کی برجستہ شخصیات کی اچھی خاصی تعداد سکولرزم اور مغرب کی طرف رجحان رکھتی ہے۔ اور سیاسی طور پر جیتنے اور ہارنے کے طریقہ کار کو مغرب سے سیکھا ہے اور طاقت پسندی کی طرف بے پناہ رجحان رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ سیاسی پارٹیاں بنانے میں کافی دلچسپی لیں گے۔ مغرب کا اولین ہدف سیاسی پارٹی کی کیفیت نہیں ہے، بلکہ اس کے وجود کو ترویج دینا ہے اور جب یہ مرحلہ عملی ہو جاتا ہے تب سیاسی پارٹیوں کے ذریعہ اپنے منصوبوں کو اجراء کرتے ہیں۔

کاریگروں کی یونین، لکھاری اور ہنر مند افراد امریکی عہدیداروں کا دوسرا ٹارگٹ ہوتے ہیں۔

گذشتہ دور میں بالخصوص سوویت یونین کے ساتھ سرد جنگ کے دوران، اس طرح کے اداروں کی براہ راست سفارتخانوں یا جاسوسی اداروں جیسے C.I.A کے ذریعہ حمایت ہوتی تھی، اس کی بہت مثالیں موجود ہیں۔ ۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی اٹلی، جاپان اور ہسپانیہ میں مداخلت کی تاریخ کا ایک الگ نمونہ ہے۔ لیکن آج اس طرح کی مداخلتیں قومی اور غیر سرکاری اداروں کے ذریعہ انجام پاتی ہیں۔ جس طرح مفہوم ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی ایک پسندیدہ اور محترم مفہوم ہے، اسی طرح سے امریکی مقاصد کو اجراء کرنے والے ادارے بھی ان اداروں کے ساتھ جو ان مفاہیم کے بارے میں کام کر چکے ہوتے ہیں مل کر اسے اجراء کرتے ہیں۔ اقتصادی گلوبلائزیشن ان منصوبوں کی نئی انسانی اور اداری بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں، غیر سرکاری ادارے، غیر ملکی روزنامے، سماجی اور ثقافتی احزاب کی عالمی سطح پر کارکردگیوں کے دعوے عام طور پر ایسے پراجیکٹ کے مجریوں کی نظر میں رہتے ہیں۔

روزناموں، مواصلاتی نظام، جوانوں اور خواتین کا احزاب میں شریک ہونا امریکہ کی ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کا اہم ٹارگٹ ہوتا ہے۔ خواتین کی نمائندگی اور جوان سوسائٹی، یہ سب ایسے مفاہیم ہیں کہ جنہیں امریکہ اور مغرب اپنے سیاسی حربے کے طور پر دوسرے ممالک میں استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کی ترویج بھی کرتے ہیں۔

جس طرح سے امریکہ کی عالمگیر ثقافتی صنعتیں آخری دہائیوں میں امریکہ کی قدرت اور اس کے نفوذ کے لئے ایک نیا موقع فراہم کرتی ہیں اسی طرح سے ٹیکنالوجی کا ترقی پانا اور حقوق نسواں کی حمایت کرنے والی

پارٹیوں کا اقتدار میں آنا بھی امریکہ کے لئے نئے حربے ہیں، تا کہ دوسرے ممالک کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام میں دخل اندازی کرسکے۔

۱۹۸۶ء میں C.I.A کی ایک رپورٹ میں آیا ہے کہ تیسری دنیا میں تبدیلی کی سب سے اہم وجہ جوان طبقہ ہے اور یہی طبقہ ہی امریکہ کے نفوذ کا بہترین وسیلہ اور ذریعہ بھی بن سکتا ہے اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ، جارج شولٹز نے ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کے اہداف کو پانچ موضوعات میں خلاصہ کیا:

۱۔ آئندہ کے رہبروں کی تعلیم وتربیت بالخصوص سماجی، سیاسی اور مواصلاتی نظام میں۔

۲۔ ڈیموکریسی، سول سوسائٹی اور اس کے ضروری اداروں کی مغربی مکاتب کے تئیں تعلیم وتربیت۔

۳۔ ڈیموکریٹک اداروں کو قوت و قدرت بخشنا جیسے بازار، انجمنیں، مؤلفین اور ہنرمند اور ان کی مالی اور فکری طور پر مدد کرنا۔

۴۔ پسندیدہ مفاہیم اور الفاظ کی نشر واشاعت جیسے ڈیموکریسی، شراکت، سول سوسائٹی، اوپن سوسائٹی وغیرہ ۔۔۔

۵۔ انفرادی اور ادارتی سطح پر تیسری دنیا کے ماہرین اور امریکہ کے لیے قابل قبول اداروں کے درمیان تعلقات میں گہرائی پیدا کرنا

درحقیقت شولٹز نے جن چیزوں کا خلاصہ کیا ہے وہ بتانا چاہتا ہے کہ گرامشی نے جو قدرت طلبی کے بارے میں لکھا وہی صحیح ہے۔

آخری دہائی میں حکومت امریکہ اور قومی پارٹیاں یا دوسرے لفظوں میں غیر حکومتی اداروں کی طرف سے دوسرے ممالک کی پارلیمنٹ اور صدارت کے الیکشن میں مداخلت کرنا، اور وہاں کے الیکشن کو مخصوص افراد جیسے سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے ذریعے صحیح قرار دینا اور اس کی تائید کرنا، یہ امریکہ کی سیاسی اور سماجی یلغار کا ایک نمونہ ہے جسے، ڈیموکریسی اور سول سوسائٹی کی حمایت سے جواز ملتا ہے۔ لیکن امریکہ اور یورپ کا بعض حکومتوں جیسے الجزائر، مصر، ترکی وغیرہ کی حمایت کرنا، اور عوامی نمائندگی کرنے والے گروہوں اور اداروں کو ختم کرنا یہ اس بنیادی اصول سے ٹکراتا ہے کہ کسی بھی حقیقت نہ رکھنے والی ڈیموکریسی یا سول سوسائٹی کے بارے میں گفتگو کرنا، دھیرے دھیرے تاریخ معاصر کے دوسرے سیاسی اور معاشی مفاہیم کی طرح اپنی حلاوت اور جذابیت کھودے گا۔

پانچواں باب

سول سوسائٹی اور عالمگیریت[1]

کیا عالمی سطح پر "سول سوسائٹی" کا وجود ممکن ہے؟ بیسویں صدی کے اختتام اور نئی صدی کے آغاز میں عالمی سطح پر انسانی روابط میں کچھ اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں۔ ماضی کی طرف نگاہ دوڑانے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بین الاقوامی نظام اور روابط سے مربوط بہت سارے موضوعات نے درحقیقت دوسری عالمی جنگ اور سرد جنگ کے بعد کے نظام سے سر اٹھایا ہے۔ سویت یونیں کے ٹوٹنے اور عالمی طاقتوں کے مابین سرد جنگ کے اختتام سے، مشرقی یورپ سے لیکر مشرق وسطی و ایشیا پسیفیک تک کے خطے میں اداروں اور تہذیبوں کی کشمکش اور قرار دادوں میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان امور کی اہمیت کے پیش نظر خاص طور پر تہذیبی، اور بین الاقوامی اقتصادی و سیاسی امور میں عوام کی براہ راست شرکت اور غیر سرکاری اداروں کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ بین الاقوامی روابط میں معاشروں کی فطرتی تبدیلیوں پر تجدید نظر کی جائے۔ اسی وجہ سے بین الاقوامی امور اور عالمی سیاست کے ماہرین، مصنفین اور حکومتی عہدہ داروں نے عالمی سول سوسائٹی کا موضوع پیش کیا ہے جس میں لوگ قومی، علاقائی اور بین الاقوامی، غیر سرکاری اداروں میں براہ راست اور مشترکہ طور پر سیاسی، اقتصادی، تہذیبی اور ماحولیاتی امور میں شرکت کر سکیں۔

مغرب میں سول سوسائٹی کے مسئلہ کی طرح، عالمی سول سوسائٹی کا مسئلہ بھی خاص طور پر لبرل طبقہ فکر میں انگلستان، ندرلینڈ اور جرمنی جیسے مغربی ممالک اور اسکینڈنیوین ممالک میں عام ہو چکا ہے۔ اور اس کا ہدف بین الاقوامی سرکاری فیصلوں کا مقابلہ کرنا اور آج کے سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی امور میں اظہار نفوذ کے لیے، ایسے غیر سرکاری اداروں اور گروہوں کا قیام ہے جو ایک مستقل فضا میں یہ کام کر سکیں۔ لیکن قومی و ملکی سطح پر اس طرح کے سول معاشرے کے قیام کی طرح عالمی سطح پر بھی اس کی تخلیق بہت دشوار ہے۔

1- Globalization

کس قسم کی سوسائٹی، کس جہان کے لیے، کن کے ہاتھوں، کون سے اہداف اور فلسفہ اور کیسے اجتماعی اور سیاسی افکار؟

پچھلے چند سالوں میں علمی اور سیاسی اجتماعات میں عالمگیریت یعنی "Globalization" کا لفظ بہت سننے میں آیا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ، اس لفظ کی بہت زیادہ تعاریف پیش کی گئیں، اور اسے سمجھنے میں مشکلات درپیش ہیں۔ جہاں تک اس کا سول سوسائٹی کے ساتھ تعلق ہے، ضروری ہے کہ اس عالمی موضوع کی وضاحت کی جائے۔ اور عالمی معاملات اور امور کو غیر عالمی امور سے علیحدہ کیا جائے۔ آجکل کی دنیا میں، ممالک کے درمیان تعلقات یعنی حکومتوں، برجستہ افراد اور سیاست مدار لوگوں کے درمیان دوطرفہ تعلقات کو صرف تعلقاتی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مطالعات کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ غیر سرکاری اداروں کا وجود میں آنا اور مروّجہ حکومتی رویہ کو ختم کرنے میں ان کے کردار نے، جو عالمی سطح پر انفرادی اور اقتصادی تعلقات میں ترقی اور ڈپلومیٹک صورت حال میں تبدیلیاں پیدا کی ہیں، یہ سب اِس سلسلہ میں بین الاقوامی سطح اور انسانی معاشروں میں تعلقات کو کلی طور پر بیان کرتے ہیں۔

اجتماعی تحریکوں، غیر سرکاری اداروں اور کمپنیوں میں گذشتہ دس سالوں میں ہونے والی ترقی کی وجہ سے حکومتی سطح پر قائم تعلقات اس سے بھی وسیع تر شکل اختیار کر چکے ہیں۔ انفرادی، سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے اجتماعی اور تعلقاتی پہلوؤں میں وسعت آئی ہے۔ جس سے جدید غیر سرکاری اور حکومت سے غیر وابستہ تحریکوں نے جنم لیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی اور سفری سہولیات کی وجہ سے سیاحت، ہجرت اور پیشہ وارانہ روابط میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

عالمی تجارت کے شعبوں میں ترقی کی وجہ سے، غیر سرکاری حاکمیت کی طرف اس حرکت کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ملٹی نیشنل کمپنیاں جن کا ہیڈ آفس کسی ایک ملک میں ہے اور اس کے شعبہ جات مختلف ممالک میں۔ یا بالکل کسی مرکز کے بغیر عالمی سطح پر مدیریت کے تشکیل پانے والی کمپنیاں۔

عالمی سطح پر اقوام متحدہ، انسانی حقوق اور عالمی تحفظ ماحولیات، ایسے بین الاقوامی ادارے، مختلف قوموں کے ساتھ حکومتی سطح پر اور علیحدہ روابط قائم کرتے ہیں تا کہ ایسے قوانین اور ادارے قائم کر سکیں جو حکومت سے بالاتر ہو کر کام کر سکیں۔ یہاں بین الاقوامی اصطلاح، جو اس جگہ صرف حکومتی اداروں پر زیادہ

مرکوز ہے، بہت محدود ہے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ عہد حاضر کے معاشروں کی عالمی کارکردگی کو اُجاگر کرنے کیلئے ان اصطلاحات پر تجدید نظر کی جائے۔

عالمی اور بین الاقوامی امور کے اس دور میں، جو چیز سب سے زیادہ اہم نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک، یا چھوٹی اقوام موجودہ عالمی ترقی کے عمل میں خاطر خواہ حصہ دار نہیں ہیں۔اور یوں تعلقات و روابط کا بعض جہات سے عالمی ہونا، بین الاقوامی تعلقات کے روایتی معنی میں ایک بنیادی تبدیلی کی غماز ہے۔ لیکن عالمی طور پر جدید معیاروں اور مرتبوں کی جانب توجہ کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ تعلقات و روابط میں کوئی حد بندی نہیں رہی۔

بین الاقوامی تعلقات عالمی تعلقات میں تبدیل ہو چکے ہیں جو عالمگیریت کی جہات کو شامل ہیں۔ یقیناً ممکن ہے جو چیز واقع ہو رہی ہے معاشروں کے باہمی روابط سے جدید تر مفہوم رکھتی ہو۔ جس کے بارے میں ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے لیکن جو بات واضح ہے وہ یہ کہ موجودہ عالمی نظام میں سیاسی، اقتصادی، مالیاتی، معاشرتی اور تہذیبی امور میں مصروف عمل اکثر غیر سرکاری ادارے یا تنظیمیں، مغربی ممالک خصوصاً امریکہ اور یورپی یونین کے زیر اثر ہیں۔ جس طرح ان ممالک کی حکومتیں بین الاقوامی روابط میں جکڑی ہوئی ہیں، اسی طرح مطلوبہ سول سوسائٹی بھی مغربی غیر سرکاری اداروں کی زیر نگرانی کام کرنے والے غیر سرکاری اداروں سے حاصل ہوگی۔ عالمگیریت "Globalization" کا مفہوم اور اس کا ماحصل اور کارکردگی مغرب کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے زیر اثر رہا ہے۔

عالمگیریت "Globalization" کیا ہے؟ اس کا ماحصل اور کارکردگی کیا ہے؟ کون یا کیا چیز اس کو چلا رہی ہے؟ اور اس سے کیا مراد ہے؟ آیا معلومات ، اقتصاد، کام اور سرمایے کو بین الاقوامی سطح پر لانا معاشروں کی کیفیت اور شکل میں تبدیلی اور نتیجتاً اجتماعی ڈھانچے میں تبدیلی کا موجب تو نہیں؟ ایک عالمی حکومت کی عدم موجودگی میں عالمی سطح کی سول سوسائٹی کونسی صورت اختیار کرے گی؟ اس قسم کے ڈھانچے میں موجود نئی اخلاقیات کیسی ہوں گی؟ کن لوگوں کے مفادات کو اس سے تحفظ ملے گا؟ روم کلب (Rome club) بیسویں صدی کے آخری عشروں میں ترقی و تبدیلی کے مسائل میں مغربی ممالک کو جدید سول سوسائٹی کی پیدائش کی ذمہ دار گلوبلائزیشن میں بنیادی طاقت سمجھتا ہے۔آسان تعبیر میں یوں کہیں گے کہ اس نظریہ کے مطابق سول سوسائٹی عالمی انقلاب یا گلوبلائزیشن کا آخری نتیجہ ہوگی۔

روم کلب کی رپورٹ کے مطابق:

"عالمی انقلاب، کسی بھی قسم کی آئیڈیالوجکل (نظریاتی) بنیاد یا اساس سے محروم ہے۔ ایک ایسی بے مثال ایجاد ہے جو اسٹریٹجیک زلزلوں اور معاشرتی، اقتصادی، ٹیکنالوجی، تہذیبی اور اخلاقی عوامل کے ساتھ مل کر تیار ہوئی ہے اور ان عوامل کا آمیزہ نامعلوم حالات پر ختم ہوگا۔ نقل وانتقال کے اس دور میں بشریت دو طرفہ جنگ کا مقابلہ کرے گی۔ اس طرح سے کہ ایک طرف سے جدید دنیا کی جانب اس کے تمام خفیہ پہلوؤں کے ساتھ اپنی راہوں کا تعین کرے گی، اور دوسری، عدم ذمہ داری کے اس غبار میں نئے جہان کے نظم وانسجام کو سیکھ کر اسے چلائے، نہ کہ یہ تازہ ادارتی نظام اس کو چلائے۔"

اس کے باوجود عالمگیریت "Globalization" اور عالمی سول سوسائٹی کے بارے میں "روم کلب" کی وضاحت بہت سطحی ہے۔ کیونکہ یہ وضاحت اس قسم کے حادثے کا باقاعدہ تجزیہ و تحلیل کرنے میں ہماری توانائیوں کو محدود کر دیتی ہیں عالمگیریت "Globalization" کو ایسے حادثے کے طور پر متعارف کرانا جو کسی بھی نظریے سے بالکل خالی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم اس کو بے سبب طاقت شمار کریں۔ اس کے بارے میں ناقابل قبول ہونے کی پیش بینی نہ کر پانا، یہ ایسی صفت ہے جس کا مطلب ہے کہ عالمگیریت "Globalization" نظریہ کے علاوہ، ڈھانچے سے بھی محروم ہے۔ گلوبلائزیشن کی بنیاد رکھنے کے لیے طویل مدت پالیسی "Long term policy" کے ساتھ روم کلب بھی بشریت اور عالمی سول سوسائٹی کی مدد کے لیے عدم ذمہ داری کے اس دور میں ثبات اور دوام کا تظاہر ہے، جو عالمگیریت کے عمل کے چاروں جوانب کی تحقیق، تحلیل اور تجزیہ کے بغیر ہے۔ یہ ممکن ہے اپنی بہترین صورت میں زیادہ حیران کر دینے کا باعث ہو، لیکن اپنی بدترین صورت میں، مخفی ادارک اور نظر کی اساس پر جو ضروری ہے کہ ایک عالمی معاشرے کو تشکیل دے۔ معاشرے کے ڈھانچے کی تشکیل میں کامیاب ہوگا۔ ٹیکنالوجی کی غیر منطقی اور محدود تحلیل و شناخت سب سے پہلے عالمی انقلاب میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اور نتیجتاً اطلاعات کی سول سوسائٹی کو بہت زیادہ بیان کئے جانے والے حادثے کے ہمراہ کر دیتی ہے۔ مغرب کے پوسٹ ماڈرن کا یہ ایک جائزہ ہے۔ ایک ایسا نظریہ جو صرف معاشرہ کے ڈھانچے کو ٹیکنالوجی اور خاص طور پر اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے پہلو سے جدیدیّت بخشے۔ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اس اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے تحت ایک تہذیب کو جنم دے سکے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس بنیاد پر کہ ٹیکنالوجی، ایک اوزاری توجیہ ہے اطلاعاتی ٹیکنالوجی پر تناقض آمیز تنقید کی جاتی ہے۔ اس قسم کی مداخلت میں اخلاقیات اور سببیت جیسے مفاہیم کے استعمال سے

غفلت برتی گئی ہے اس لیے اگر عالمی انقلاب کے لیے کسی قسم کے آئیڈیالوجیکل بنیاد کا خیال نہ رکھا جائے تو حیران ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔

مغربی دنیا کا ایک معاصر ماہر عمرانیات انٹونی گیڈنز، ماڈرن اور پوسٹ ماڈرن دور میں عالمی تبدیلیوں کی وضاحت اور تحلیل کرتا ہے کہ جن کی طرف اشارہ کرنے سے یورپی اور امریکی ذمہ داران کی بیان کردہ عالمی سول سوسائٹی کو سمجھنے میں مدد ملے گی(۸۶)۔ اس کے خیال میں ماڈرن ہونے کے ابتدائی نتائج میں سے ایک نتیجہ عالمگیریت "Globalization" ہے۔ اسی چیز کی وجہ سے مغربی دنیا نے پوری دنیا میں اپنے اداروں کو پھیلایا جو دوسری تہذیبوں کو روندنے پر منتہی ہوا، اس کے نتائج اس سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ عالمگیریت ایک ایسا ناہموار عمل ہے جو جوڑتا ہے اور توڑتا ہے۔ متقابل وابستگی کی ایسی شکلیں بناتا ہے جس میں "دوسروں" کی کوئی جگہ نہیں اس کے باوجود معروف مسلمان مصنف اور تجزیہ نگار "ضیاء الدین سردار" جس نے گیڈنز جیسے ماہر عمرانیات کے آثار کا ناقدانہ مطالعہ کیا ہے، اس کے بقول گیڈنز جیسے افراد کا استدلال فطری طور پر تناقض آمیز ہے۔ اگر عالمگیریت معاشروں کو ماڈرن کرنے کی اساس ہے اور اگر مغربی تہذیب کی عالمگیریت ایک ایسے مستقل اور جدید دنیا کو وجود میں لاتی ہے کہ جس میں "دوسروں کا وجود نہیں" تو کس طرح ممکن ہے کہ غیر مغربی تہذیبیں ماڈرن دور کی تخلیق میں کوئی اہم کردار ادا کر سکیں؟ اس کے علاوہ، جیسا کہ گیڈنز کا خیال ہے کہ ماڈرن ہونا "ذاتی طور پر مستقبل پسندی ہے" اور مستقبل کی پیش بینی دوران عمل کا ایک جز ہے۔ اور نتیجتاً مستقبل کی ترقی کے طریقہ کو منعکس کرتا ہے۔ یوں مستقبل ایک موثر کے طور پر مطلق مالکیت کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ ماڈرن ہونا نہ صرف مغرب کے موجودہ دور میں یقینی تسلط کی ضمانت دیتا ہے، بلکہ مستقبل میں بھی یہی کردار ادا کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں عالمگیریت سے حاصل شدہ سول سوسائٹی یورپ اور امریکہ کے ملکی سطح پر مغربی سول سوسائٹی کے تسلسل کے علاوہ کچھ نہیں۔

عالمی سطح پر سول سوسائٹی کا وجود میں آنا چند اسباب کی وجہ سے تامل کا باعث ہے۔ ایک یہ کہ مغرب میں خود سوسائٹی کا مفہوم زبان، نژاد، قومیت اور جغرافیہ سے مل کر پہچانا جاتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں ایک ایسا معنوی اور غیر مادی جذبہ جو ان معاشروں کو ان سے اعلیٰ تر مراحل کی طرف لے جائے، موجودہ عالمی نظام میں نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود عالمی سول سوسائٹی اور عالمگیریت سے مربوط تحریروں میں یہ

پیشکش موجود ہے کہ ہمیں علاقائی اصل کے مقابلے میں عالمی اصل کے مخالف نظریہ سے بالاتر ہو کر سوچنا اور کچھ کرنا ہوگا۔ علاقائی اصل جس کا دعوی ہے کہ عالمگیریت علاقائیت میں شامل بھی ہے اور اس کو مشمول بھی ہے اور اس طرح سے آپس میں تداخل رکھتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر علاقائیت کی اصطلاح ایک نسبتی امر ہے اور زمان و فضا جیسے مفاہیم کے ساتھ مربوط ہے تو پھر کس چیز نے اس کو تشکیل دیا ہے؟ اور کس طرح عالمگیریت جیسے مسئلے کے ساتھ مربوط ہوگا؟ وہ چیز جو اس بحث سے واضح ہوتی ہے وہ "آگاہی" کا مفہوم ہے، اس معنی میں کہ عالمگیر اور علاقائی کرنا ذہنیت اور ذہنیتوں کے تداخل سے مربوط ہیں۔ وہ طریقہ جس کے ذریعے ہم دوسروں کے ساتھ اپنے رابطہ اور تعلق کی تعریف کرتے ہیں یا خود کو اور دوسروں کو منظّم کرتے ہیں یہ سب ہماری عالمگیریت اور علاقائیت کی شرائط سے ہماری تفسیر کو شامل بھی ہے اور مشمول بھی۔ مغربی آثار میں یہ بحث بعض افراد کی آراء پر مشتمل ہے کہ جس کی بنیاد پر، گذشتہ اور حال کے آمیزہ سے حاصل شدہ نتائج صرف گذشتہ سے حاصل کردہ نتائج سے کہیں زیادہ مقدار میں موجود ہیں۔ کیا موجودہ عالمگیریت کا عمل ایک ایسے مفروضہ سے مشابہ ہے کہ جس میں یہ گمان کیا جائے کہ طباعت کی صنعت کی سرمایہ سالاری خیالی اجتماعات کی تخلیق پر اختتام پذیر ہوگی؟ زیر بحث آگاہی کی قسم کو مد نظر رکھتے ہوئے اطلاعات، روابط اور آج کی ٹیکنالوجی، علاقائی اور عالمی تفسیر میں کیا کردار ادا کریں گے؟

اگر انسانیت، عالمگیریت کے مرحلہ سے دور ہے تو عالمگیریت کی علامتیں کیا ہیں؟ یونیورسٹیوں اور عام تحریروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ عالمگیریت کے مفہوم میں ٹیکنالوجی، روابط، صنعت، اقتصاد، خوارک، انشورنس اور قانونی و مالی خدمات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ بطور خلاصہ وہ چیز جو عالمگیریت کے عمل میں پائی جاتی ہے وہ سروسز اور مصنوعات کی رَسد (Production)، تقسیم اور استعمال کرنے والی قوتیں ہیں۔ اس نکتہ کی طرف اشارہ بھی بہت اہم ہے کہ جس طرح کہ مغربی مصنوعات جیسے کوکا کولا، پیپسی، پیزا، یا ٹیلی ویژن کے پروگرام ہیں، اس طرح سروسز اور مصنوعات کا استعمال (یا ایسی ہی استعمال کی رفتار) بھی برابر ہونے کی علامت ہیں۔ لیکن یہ اس چیز پر دلالت نہیں کرتا کہ قیمت، وابستگی اور اخلاق بھی مساوی اور ایک جیسے ہوں۔ اقدار کو تبدیل کرنے کے لیے سلوک کے اصولوں میں تبدیلی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ طریقہ صارفین میں بنیادی تبدیلی لائے، ان کی زندگی میں ایسے طریقے کو جنم دے جو

مصنوعات اور سروسز کی نسبت صارف کی بیشتر ضرورت کو ظاہر کرے۔ تو بنیادی طور پر عالمگیریت کو ایسے ایک ڈھانچہ ساز عمل کے طور پر شمار کیا جائے جس میں متحرک عوامل مختلف زمانوں میں اجتماعی زندگی میں توڑ، جوڑ کا متقابل عمل کرتے ہیں تا کہ خواص کی حکومت میں ایک جہان کی تخلیق کر سکیں، جو ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہو۔ ممکن ہے عالمگیریت کے طریقوں میں متعدد پہلو ہوں۔ یعنی عمودی ادارے (فرد، قبیلہ، گروہ، ریاست، اور بین الاقوامی ترتیب سے) اور اسی طرح افقی (حقوق، اقتصاد، سیاست، تہذیب اور تعلیم و تربیت) بھی ہوں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ملٹی نیشنل کمپنیاں موجودہ عالمی نظام کے تحت معاشروں کو عالمگیریت کے عمل میں لانے کے لیے اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ درحقیقت ملٹی نیشنل کمپنیوں کا قیام، ترقی اور سرمایہ و طاقت (صرف ٹیکنالوجی نہیں) انسانی ضرورتوں اور چاہتوں کے ایک ایک پہلو میں نفوذ کر چکا ہے۔ اگرچہ ان الفاظ سے مراد یہ نہیں ہے کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں نے صرف مخالف قوتوں کے ساتھ مخالفت کیے بغیر حتی نئے جہان کی تخلیق کے لیے عمل کیا ہو بلکہ زیادہ تر سرمایہ کے پھیلاؤ اور اسٹاک مارکیٹ کی ہدایت کی وجہ سے، دباؤ مسلسل حرکت پر ختم ہوا ہے جس کا نتیجہ ہم عالمگیریت کے عمل میں ہونے والے "Demonstrations" کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں، یعنی وہی حاکم فکر اور سوچ جو لوگوں اداروں، تہذیبوں وغیرہ کے مابین بڑھنے والے روابط کی وجہ سے دنیا میں ایک یونٹ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ آسان اور سادہ بیان میں یہ کہ متحدہ قومی حکومتیں ایک جدید اور نئی سوچ اختیار کریں تا کہ عالمگیریت کے مقابلے میں سر تسلیم خم کرنے کی بجائے اختلاف و تنوع کو اپنے اندر ہی محفوظ بنانے کی کوشش کریں۔ اس لحاظ سے اقتصاد اور روابط کا جدید نظم اسی طرح بین الاقوامی سیاست کا جدید نظم اس خیال کے برخلاف ہے کہ جو اس کے بارے میں کیا جاتا ہے، اور جس طرح اس کتاب کے دوسرے ابواب میں گزرا ہے کہ مذکورہ بالا دو نظاموں کی "Adjusted" اقسام کو عالمگیریت کے عمل میں ترقی یافتہ ممالک میں ایک نئی زندگی میسر ہوئی ہے اور اسی طرح آئندہ آنے والے عشروں میں بھی ان ممالک میں باقی رہے گی۔

معاشرہ کی ایک جامع تعریف کے بغیر اور موجودہ دنیا کی عالمگیریت کی شرائط کے تحت سول سوسائٹی کی کسی بھی قسم کا خیال بے فائدہ اور بیہودہ ہے۔ عوام کے کسی بھی طرح کے باہمی روابط کا محکم ہونا من جملہ انسانوں سے محبت کی اقدار ہیں یہ روابط کو عالمگیریت کی شکل دیتی ہیں اور بین الاقوامی روابط کے نظریوں

میں ایک نظریہ اس کی تائید کرتا ہے۔ حق تعلق و ارتباط اور بیان کی آزادی جیسے اصول انسانی حقوق کے چارٹر کی عملی صورت ہے حتی تکنیکی اعتبار سے پبلک سسٹموں، جیسے پوسٹ یونین اور مواصلات کے سلسلے میں پبلک سروسز مہیا کرنے کا جذبہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ اس کے باوجود جو چیز عالمی ہے عوامی یا "Publical" نہیں اور ضرورت اس امر کی ہے کہ جان لیا جائے کہ عالمی سول سوسائٹی کا مطلب عوامی سول سوسائٹی نہیں۔ ہر چند اطلاعات اور مصنوعات کی تقسیم عالمی صورت میں سامنے آئی ہیں لیکن اس کی سمت "Indicate" راہنمائی کرنے والے اشارے صرف چند ایک ہی ہیں۔ پس جب اطلاعات کا حصول عوامی اور Publically ممکن ہے تب بھی پیغاموں کی ترسیل شدید محدود ہے۔ اس لیے پیش کردہ عالمی سول سوسائٹی ایک Consumed اور دریافتی سول سوسائٹی تو ہو سکتی ہے لیکن ایک خلاق، محرک اور عوامی نمائندگی کرنے والی سوسائٹی کبھی بھی نہیں بن سکتی۔

پچھلے کچھ عشروں سے سوسائٹی، تہذیب اور روابط سے مربوط ابحاث سول سوسائٹی کے بارے ہونے والی بحثوں اور گفتگو کا موضوع رہے ہیں (۸۷)۔ اگرچہ اس موضوع کے بارے ہونے والے بہت سارے مطالعات نسبتاً کلی اور بے نیاز کر دینے والے ہیں لیکن، اس کا تقابلی پہلو، خاص طور پر طلاب اور سوشیالوجی، فلسفہ اور ارتباطی نظریوں سے لگاؤ رکھنے والوں میں ابھی تک ناپروردہ باقی ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں تہذیب کا موضوع (صرف تہذیبی مصنوعات اور ان کا معاشرہ پر اثر) ایک ایسا موضوع ہے جس پر زیادہ تحقیق ہوئی ہے۔ جہاں تک اس موضوع کا معاشروں کے تہذیبی تعلقات اور سوابق کا تعلق ہے تو یہ صرف انفرادی اور گروہی مرتبے (خاص طور پر اجتماعی نفسیات میں) میں انجام پایا ہے اور عالمی و بین الاقوامی مسائل سے یوں الگ ہوا ہے گویا سیاسی، اقتصادی، ٹیکنالوجی اور مذہبی حد بندیوں سے آزاد جہان میں تہذیبوں اور معاشروں کے مابین ارتباط قائم ہوا ہے۔ اس مسامحت کے معین دلائل بھی موجود ہیں۔ جیسے مفاہیم میں ابہام، جمود نظمی اور شناخت شناسی (Epistemology)، زبان اور تہذیبی مطالعات میں مہارتوں کا فقدان، نسل پرستی کا عروج، تنگ نظری اور نہایتاً عقیدتی ہٹ دھرمیاں، نتیجہ یہ ہے کہ معاشروں اور ان کے مابین تعلقات اسی طرح تہذیبی اور اجتماعی نظاموں کے بارے میں ہمارا علم وسیع ہونے کی بجائے تنگ نظر ہوا ہے۔

پہلے بین الاقوامی روابط عالمی نظام کی حرکت شناسی کے لیے طاقت، حکومت، عوام اور سیاسی اقتصاد کو بنیادی امور کے عنوان سے دیکھتے تھے، لیکن اب یہ نگاہ تہذیب، قومیت اور مذہب کے میدان میں آنے کی وجہ سے بنیادی تبدیلی کا شکار ہے۔ اس سے قبل بین الاقوامی روابط کے مغربی و مشرقی دانشور عوامل کے کردار کو اصلًا اہمیت نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ حکومتی اختلافات کو طاقت و سیاست میں توازن، منطقی فیصلوں اور سیاسی اقتصاد کے ساتھ حل کرتے تھے۔ لیکن آج جس طرح سے حقیقت بین تجزیہ نگاروں، "Traditional Realists" اور ماہرین کے موقف میں تبدیلی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تہذیبی پہلو، بین الاقوامی سیاسی روابط کی پالیسی کو مرتب کر رہے ہیں۔ بطور مثال سیموئیل ہنٹنگٹون جسے مغرب سے لے کر مشرق تک مغرب پسند افراد میں اپنے آثار میں جدیدیّت اور سیاسی ترقی کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل ہوئی، ۱۹۹۳ء میں اپنی ایک تحریر میں یوں رقمطراز ہوتا ہے کہ تہذیبوں کے مابین کشمکش سے ایک جدید عالمی مرکز ثقل یعنی "بے نظمی" کا آغاز ہوگا۔ ایک اور مغربی تجزیہ نگار جان میر شایمر کا دعویٰ بھی قابل غور ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ قومیت پسندی "Nationalism" سرد جنگ کے بعد یورپ کے لیے ایک نیا خطرہ ہوگا اور یہ دعویٰ حکومت کی حقیقت ظاہر کرنے کے مترادف ہے۔ ایران کے اسلامی انقلاب، روس کے ٹکڑے ہونے اور دو بڑی طاقتوں کے درمیان جاری سرد جنگ کے خاتمے کے بعد، تجزیہ نگاروں کے ان نظریات کو تازہ موضوعات اور مطالب نصیب نہیں ہوئے لیکن کیونکہ سابقہ دو بڑی قوتیں منہدم ہو چکیں ہیں، سابقہ بین الاقوامی تعلقات کے علوم نے جس تہذیب اور معاشرے کو مکمل طور پر اپنے سے دور رکھا ہوا تھا اب ایسی مشکلات سے دچار ہوا جس سے کبھی بھی پالا نہ پڑا تھا۔ اس لیے مغرب میں صدیوں خاموشی کے بعد معاشرے، تہذیب، تعلقات اور تمدن کی طرف واپس پلٹنا رائج ہو چکا ہے اور اس سے اجتناب بھی ناممکن ہے۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں اسٹریٹجک دانشوروں کے گروہ کے درمیان سنجیدہ افکار نے جگہ لے لی تھی کہ جو صرف سیاسی۔ عسکری حالات اور اقتصاد اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بجائے زیادہ تر بین الاقوامی تعلقات اور معاشروں کے مابین روابط کا نتیجہ ہیں۔ سرد جنگ کے تجزیہ نگار تمدن کے تہذیبی اثرات کو اقتصادی اور جیوپولیٹیکل عوامل کے تابع مانتے ہیں اسی طرح اس دوران پائی جانے والی کشمکش کو بھی نظریاتی کشمکش تصور کرتے ہیں۔ جبکہ تہذیبی عوامل اور تناؤ ہمیشہ سے موجود رہے ہیں لیکن ایک بار پھر صاحب نظر افراد اور سیاستدانوں کی سرد رد کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں

تہذیبی تصادم اور ٹکراؤ کی وجہ کو یوگوسلاویہ کے ٹکڑے ہونے، پورے سابقہ سوویت یونین میں نسلی جھگڑوں اور اس کے علاوہ مغربی یورپ میں ہجرت کی مشکلات حتی مشرق اور مغرب میں تجارت کے تہذیبی لائحہ عمل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے ان جھگڑوں میں ان کے اصلی عوامل میں مذہب بھی شامل ہے۔ اسلام، عیسائیت، آرتھوڈوکس، یہودیت، شینونزم، کنفونسزم، پروٹیسٹنٹ ازم اور مغربی کیلونزم سب دوبارہ اپنی اصل شناخت کے اظہار کے لیے اٹھے ہیں۔

نمونہ کے طور پر اسلامی رنگ میں رنگی اقدار اور اجتماعی نظاموں سے مربوط ایک جائزہ پر توجہ کریں۔ سماجی نظام، درحقیقت افراد کے مابین عمل اور رد عمل کا سلسلہ ہے۔ سماجی نظام اپنے سے بڑے یونٹ یعنی "سماج" کے اندر ہوتا ہے جس کی ایک خصوصیت "تعلق" ہے جسے چودھویں صدی عیسوی کے اسلامی دانشور ابن خلدون نے تعصب یا عصبیت کے نام سے یاد کیا ہے۔ وہی اصطلاح جسے بعد میں فرانسیسی دانشور دورخایئم نے بھی استعمال کیا۔ جیسا کہ دو مغربی دانشوروں کروبر اور پارسونز نے اشارہ کیا ہے کہ اجتماعی نظام اقدار نہیں ہے بلکہ افراد کے کردار اور اقدار کا وہ نظام ہے جس میں وہ علامتی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ دوسری طرف اقدار تہذیبی جامعیت اور اجتماعی پیوستگی سے بچنے کے آلات ہیں جو خدمت سے ملموس کردار کی اشکال کو جواز بخشنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں، ہم یہاں تہذیبی اور اجتماعی نظاموں کے مسئلہ سے دوچار ہیں اور اس چیز سے کہ کس طرح سے سمجھانے، نظریہ پیش کرنے اور رابطہ واطلاعات کے ساتھ دو طرفہ رابطہ برقرار کیا جائے۔ سماج میں تہذیب کے ذمہ دار افراد اور معاشروں کی کارکردگی "out put" اور ان کے مابین روابط میں کیا اثر رکھتے ہیں؟ وہ کون سے نظریات ہیں جو تعلقات واجتماعی کارکردگی "out put" کو پروان چڑھاتے ہیں؟ ان کی نظر میں تمدن اور سول سوسائٹی کیا ہے؟ آیا موجودہ ممالک اور ان سے وابستہ معاشرے کہ جو قومی۔ حکومتی نظاموں کی بنیاد پر بنے ہیں آج کے بین الاقوامی نظام میں سما گئے ہیں؟ اور کیا موجودہ حالات میں "عالمی سوسائٹی" یا "سول سوسائٹی" کا عنوان قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟

اگر انسانی معاشروں کے حوالے سے سول سوسائٹی کے بارے میں گفتگو، تصویر کا ایک رُخ ہے تو تصویر کا دوسرا رُخ، تہذیبوں کے بارے میں گفتگو ہے۔ اگرچہ یہ دونوں موضوع پچھلے سالوں میں آزاد خیال افراد، تجزیہ نگاروں اور حکمرانوں کے لیے بہت زیادہ مشغولیت کا سبب بنے ہیں۔ اس کے باوجود ان دو الفاظ کی

عمومیت نے عام عوام کے ذہنوں کو پریشان کرکے رکھ دیا ہے، جیسا کہ سول سوسائٹی کے بارے میں پہلے ذکر ہوا ہے۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اپنے بارے میں آج کی اس گفتگو کا اصلی سرا کہاں ہے؟ گذشتہ سالوں میں یہ تمدن کا موضوع اور عنوان سول سوسائٹی کے ساتھ مساوی بین الاقوامی سطح پر حکمرانوں، تجزیہ نگاروں اور میڈیا میں کیوں عام ہوا ہے؟ اس حوالے سے مختلف دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن میری نظر میں تین اہم تبدیلیاں اس امر کا باعث بنی ہیں۔

سب سے پہلے ایران کا اسلامی انقلاب اور پوری دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی تحریکیں ہیں، اسلامی انقلاب اور مسلمانوں کی تحریکوں نے اسلامی تمدن کے متعلق دلچسپی اور اسلامی تمدن کا دوسری تہذیبوں بالخصوص مغربی تہذیبوں کے ساتھ ٹکراؤ کو اُجاگر کیا ہے۔

دوسرا سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں کیمونسٹ نظاموں کا زوال ہے جس نے سیاسی، اقتصادی، تاریخی اور تہذیبی گفتگو میں ایسے عناوین اور مفاہیم جو شکست سے دوچار تھے جیسے سوشیالزم اور کیپٹلزم، حکومت و عوام، پرولٹاریا اور علاقائیت، ڈیموکریسی، ماڈرن ازم وغیرہ، انہیں تہذیبوں کے مطالعہ اور ان کو سمجھنے اور دوسرے میدانوں میں تحقیق کی طرف مجبور کیا۔

تیسرا، "تجدد" کی آئیڈیالوجی یا مکتب فکر کا زوال اور اختتام ہے، جس نے خود مغرب کے جدید اقتصاد کے ماہرین کو شدت کے ساتھ جھنجوڑا ہے۔ ترقی کی چاہت کا پچھلی نصف صدی میں لبرل اور مارکسسٹ افراد کی جانب سے پرچار ہوتا رہا اور امریکہ اور سابق سوویت یونین جو اس کا نمونہ و علامت بھی رہے، اب ختم ہوچکی ہے۔ اس کی وجہ سے مختلف فکری اور ذہنی بحرانوں نے جنم لیا اور تمدن کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے مختلف جذبات اور تہذیبوں اور سماجوں کے مختلف پہلوؤں اور ان کی تطبیق کو عام کیا ہے جیسے چین، جاپان، یورپ اور اسلام کے تمدن کا جائزہ لیا گیا ہے۔

نصف صدی تک ماڈرن یا جدید معاشرہ کا نمونہ عمل سرد جنگ کے دوران مغرب میں علمی، اجتماعی اور انسانی مطالعات و تحققیات کا محور رہا ہے۔

گذشتہ عشروں میں مغرب میں علم اپسٹمولوجی اسی پر استوار ہوئی اور اپنا اور دوسروں جیسے آزادی، ڈیموکریسی اور معاشروں کا فلسفہ بھی کم و بیش انہیں دو مشنریوں کے تحت چلا اور نشوونما پائی۔ (۸۸) اس دور کے اختتام پر مغرب۔ ہمارا مطلب یہاں یونیورسٹیاں، حکومتیں اور آزاد خیال افراد سب ہیں۔ نئے

طریقوں اور خیالوں کی جستجو میں ہے۔ امریکہ میں عام طور پر تین قسم کے " مقولے " پیش ہوئے ہیں۔ پہلا جیسا کہ ہم جانتے ہیں اور بار بار تکرار بھی ہوا ہے۔ "امریکہ کے اداروں سے وابستہ) فرانسس فوکویاما کی "اختتام تاریخ کی بنیاد پر اور امریکہ کے ہی مورخ ماہر اقتصادیات رابرٹ ہیل برونر کے مطابق دونوں اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سابق سوویت یونین کے زوال سوشلزم اور کیپٹلزم کے درمیان گفتگو کا اختتام ہے۔ ہیگل کے فلسفہ میں لبرلزم اور اس کی کامیابی تاریخ یا اس بحث کا اختتام ہے۔ اس لیے اس کے بعد لبرلزم کی عالمگیریت اور مغربی طرز کی سول سوسائٹی کی ترقی وترویج کے بارے میں بات ہونی چاہئیے۔

امریکہ میں پیش ہونے والا دوسرا سناریو یا مقولہ (انارکی اور فساد کی ابتداء) کی بنیاد پر ہے جس کا نمونہ ایک مقالہ ہے جو چند سال پہلے ماہانہ جریدہ اٹلانٹک (Atlantic) کے مدیر اعلیٰ نے شائع کیا تھا۔ اس مکتب کا موقف ہے کہ سرد جنگ کے اختتام اور مختلف تبدیلیوں جیسے اسلامی بیداری سے بین الاقوامی نظام انارکی کے ایسے جدید دور میں داخل ہوگیا ہے جس میں حکومتوں کی طاقت اور اقتدار میں کمی آئی ہے۔ بڑھتی آبادی اور ماحولیاتی تبدیلیوں وغیرہ کی وجہ سے مزید خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس نظریہ کی اساس پر سعادت مندی کی دنیا کہ جس کے بارے میں فوکویاما اور اس کے ساتھی بات کرتے ہیں درحقیقت ایک قلعہ اور فوجی کیمپ ہے جس کا شورش برپا کرنے والوں نے محاصرہ کر رکھا ہے۔

امریکیوں کی طرف سے پیش ہونے والا تیسرا نظریہ جس کا میڈیا اور محفلوں میں خاصا چرچا ہے، ہارورڈ یونیورسٹی کے سیموئیل ہنٹنگٹن کا دعویٰ ہے جو سرد جنگ کے زمانے میں بھی ایک کٹر قسم کا نظریہ پرداز جانا جاتا تھا۔ ہنٹنگٹن جس نے مدتوں اسٹریٹیجک، اقتصادی اور سیاسی عوامل پر بھروسہ کیا، ایران کے اسلامی انقلاب اور سابق سوویت یونین کے زوال کے بعد تہذیبوں کے تصادم اور ان کی کشمکش کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اور اچانک تہذیبی مسائل پر گفتگو شروع کردیتا ہے۔ ہنٹنگٹن کے نظریے کے مطابق "اگر مستقبل میں عالمی جنگ رونما ہوئی تو یہ تہذیبوں کے مابین جنگ ہوگی" اور اصل کشمکش مغرب، اسلام اور کنفوشیس تمدن کے درمیان ہوگی۔ ہینٹنگٹن کی تحریروں میں کوئی نئی بات نہیں سوائے اس کے کہ اس نے سرد جنگ جس پر اس کا سالہا سال اعتقاد رہا اس کو تہذیبوں کے سانچے میں پیش کرتا ہے اور ابھی بھی عالمی نظام کو دو قطبی نظام شمار کرتا ہے۔ لیکن وہ چیز جو اہم ہے اور جس کی جانب توجہ از حد ضروری ہے وہ یہ کہ ہنٹنگٹن اور اس کی طرح کے دوسرے افراد نے پچھلے دو عشروں میں ہونے والے واقعات و تبدیلیوں اور اسلامی

تحریکوں کے ظہور کی وجہ سے اپنے موقف کو تبدیل کیا ہے اور بین الاقوامی امور میں تہذیب، معاشرہ اور اجتماعی نظام کا ایک اہم سبب کے طور پر اعتراف کیا ہے۔

یہ تین نظریات امریکیوں کی موجودہ دنیا کے بارے میں سوچ کا ایک گوشہ ہیں، البتہ یہ سارے نظریات تمام اہل مغرب یا یورپ کے لیے قابل قبول نہیں۔ یورپ میں اور بھی نظریات موجود ہیں جن میں سے ایک یورپی یونین میں فرانسیسی سفیر، جان میری کی ڈیموکریسی کے اختتام کے بارے میں لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ عالمگیریت اور گذشتہ عشرے میں ہونے والی تبدیلیوں سے حکومتوں کی طاقت میں کمی آئی ہے اور سیاست ایک منظّم انتظام "Organized Management" میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس کے بعد بیوروکریسی کے ہاتھوں میں اہم فیصلے، (کہ جن میں عوام اور حکومت کے منافع پر توجہ نہیں دی جاتی تھی) کی طاقت آچکی ہے اور یہ حالت درحقیقت اس ڈیموکریسی کا اختتام ہوگا جس کی صدیوں پہلے یورپ کے فکری ارتقا پر بنیاد رکھی گئی تھی۔ یورپ کا قدامت پسند "Conservative" طبقہ مغرب میں تہذیبوں کے تصادم اور ڈیموکریسی کے زوال کے نظریے کو ردّ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر سوئٹزرلینڈ کا قدامت پسند اخبار "زیوریچ" پچھلے سالوں اپنے چھپنے والے متعدد مقالوں میں اسلامی تحریکوں کو عرب اور اسلامی ممالک میں دولت کی غیر عادلانہ اور غیر مساوی تقسیم کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور اجتماعی اور اور اقتصادی مسائل پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے اس کے ساتھ یورپ کے بعض جدید لبرلسٹ افراد کے نظریات جن کا لندن میں شائع ہونے والے اکانومسٹ جریدہ میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

اکانومسٹ جو آج کے اقتصاد کی عالمگیریت پر بہت ایمان رکھتا ہے اور امریکی قارئین میں بھی خاصی شہرت حاصل کرچکا ہے گذشتہ سالوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو "اسلام میں ایک مطلق مکتب یا فرنٹ کے فقدان" کے مفروضہ میں دیکھتا ہے اور اس بات کا متعقد ہے کہ اسلامی تمدن کے سائے میں اسلامی دنیا کے مختلف فرقے اور گروہ تبدیل ہو سکتے ہیں اور اس بات کی پیش گوئی بھی کرتا ہے کہ آئندہ "اسلامی شدت پسندوں یا ریڈیکل افراد" اور "مغرب میں جدید بائیں بازو سے وابستہ افراد" کے مابین سیاسی اور فکری اتحاد بنیں گے۔ کیونکہ اس جریدہ کا عقیدہ ہے کہ یہ دونوں گروہ ایک قسم کے اقتصادی نظام کے اخلاقی اصولوں کے قائل ہیں یورپ اور امریکہ سے لی گئیں یہ چند مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ اولاً ابھی تک بہت سارے ذہنوں سے سرد جنگ اور دو قطبی نظریہ محو نہیں ہوا اور مختلف صورتوں میں جملہ تہذیبوں کے

تصادم کی صورت میں بخوبی نظر آتا ہے۔ ثانیاً گذشتہ عالمی تبدیلیوں کے بارے میں مغرب میں کوئی ایک نظریہ موجود نہیں۔ وہ تہذیبوں کے مابین گفتگو اور سول سوسائٹی کو اپنی آئیڈیالوجی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

سول سوسائٹی کا موضوع قدرتی طور پر تہذیبوں کی باہم نزدیکی و گفتگو یا ان کے درمیان موجود کشمکش کو بھی سامنے لاتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ آج کی تہذیبی فوقیت "Hegemony" کے حالات میں کیا گفتگو کے دروازے کھولے جاسکتے ہیں؟ کسی بھی چیز کے بارے میں گفتگو کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ گفتگو کرنے والے دونوں اطراف اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوں اور مناسب ماحول کی موجودگی کے ساتھ حسن نیت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ آج کا عالمی ماحول گفتگو کی نسبت دھونس جمانے کے لیے زیادہ سازگار ہو چکا ہے۔ عوامی سطح پر تہذیبوں کا میل امید کی ایک کرن ہے۔ تہذیبوں کا میل اپنا قدرتی سفر طے کرے گا لیکن دنیا میں جہاں حکومتیں عوام پر غلبہ رکھتی ہیں اور تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی ادارے ان حکومتوں کی مانند قدرت طلبی کے مراکز ہیں، زیادہ امیدیں وابستہ کر لینا بھی ایک آرزو سے زیادہ کچھ نہیں۔ ابن خلدون وہ شخص ہے جس نے ان مسائل کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے مقدمہ میں بیان کیا۔ حتی آرنلڈ توین بی جیسے مغربی مورخ بھی اس کے ہمفکر رہے۔ تہذیبوں کی تہذیبی یلغار ایک واقعیت ہے بالکل اسی طرح جس طرح تہذیبوں کے ملاپ اور ہمفکری نے تاریخ کے صفحات پر اپنی جگہ بنائی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ معنویات میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر مادیت اور ذخیرۂ مال کبھی بھی عظیم تہذیبوں میں موثر نہیں رہے اور (سول سوسائٹی کا عالمی ہونے) کے پرچم تلے آج کے مغربی تمدن کی جدیدیّت اور ماڈرنزم بھی سیکولر افکار کو قبول کرنے اور ان کی ترویج کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

"تہذیبوں کے مابین گفتگو" کی اصطلاح عالمی سول سوسائٹی کی تشکیل کی شرائط میں سے ایک ہے جو "تہذیبوں کے تصادم اور کشمکش" کے نظریہ کی طرح بہت کلی ہے اور جب تک اس کا طریقہ کار اور اس کی کارکردگی واضح طور پر سامنے نہ آئے اس میں بہت سارے ابہام پائے جاتے ہیں، کیونکہ تمدن حکومتیں، اسٹبلشمنٹ اور ادارے نہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھیں اور مذاکرات و گفتگو کریں۔ تمدن، ڈپلومیسی، تجارت، تعلیم اور حتی کہ تہذیب سے بھی وسیع تر ہے اور ہم افراد یا کسی گروہ کو ایک تمدن کی قیادت کے لیے نہ تو منصوب کر سکتے ہیں اور نہ ہی معزول، تمدن کوئی شربت نہیں جسے ایک بوتل میں رکھا جا سکے۔ تمدن تلاطم خیز اور متحرک سمندر کی طرح ہے۔ تہذیبوں کا آپس میں ملاپ جغرافیائی طریقے سے

نہیں ہوتا بلکہ تمدن آپس میں تہذیبی، سیاسی، اقتصادی، اجتماعی، ٹیکنالوجی کے اداروں اور عوام کے ذریعے ملتے ہیں۔ اور یہ ملاپ کبھی تو تصادم، اور کبھی ایک دوسرے کے ہمفکر ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہنٹنگٹن کے نظریے کے بعض کمزور نکات میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ وہ اور اس کی طرح کے دوسرے افراد نے تمدن کو مالکیت، جغرافیہ اور زمینی پہلوؤں کے ساتھ ملایا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقائد، آئیڈیا، فکر اور معنویات جیسے غیر محسوس منابع کی بجائے ملموس اور محسوس منابع اور طاقت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ فکری اور سافت ویر کی طاقت مادی منابع کے حصول کے ساتھ ممکن ہے۔ جبکہ یہ نکتہ نظر اور دید ہماری اس نگاہ سے جو ہم اسلامی معاشروں کے حوالے رکھتے ہیں بالکل مختلف ہے۔

تمدن وہ لفظ ہے کہ جس کے تحت معاشروں، تہذیبوں اور قوموں میں ہونے والی کلی تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تمدن قوموں، حکومتوں اور تہذیبوں سے ایک ایسا بالاتر مفہوم ہے جو انسانی سماج کی جہاں بینی، جہت، مشترک نکات اور حرکت کو بیان کرتا ہے۔ گذشتہ کچھ عشروں تک لفظ تمدن مغرب میں زیادہ تر آرٹس، ادبیات اور بالخصوص تاریخ انتھرویالوجی "Anthropology" اور لٹریچر میں استعمال ہوتا تھا لیکن پچھلے کچھ سالوں سے ماہرین سیاسیات، اقتصادیات اور عمرانیات بھی اس کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ پچھلی نصف صدی میں عالمی اور بین الاقوامی تبدیلیوں، حکوتی سیاست، بین الاقوامی اداروں، سیاسی اقتصاد، تجارت و مالی امور، تہذیبی روابط اور تبادل کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ رائے عامہ، پریس، میڈیا اور چند قومی اسٹبلشمنٹ کی تحلیل و تجزیہ بھی انجام پایا ہے۔ 1970 عیسوی کے اوائل میں امریکہ میں پروفیسیر امانویل والرشٹاین کی سربراہی میں ماہرین عمرانیات اور سیاسی وکلا کے ایک گروہ نے ایک ایسی عالمی نظام کی بحث چھیڑی جس کا مرکز امریکہ اور بہت سارے دوسرے ممالک اس کے اطراف میں قرار دیئے گئے۔ اس تھیوری کے مطابق یہ عالمی نظام جو سولہویں صدی عیسوی سے بننا شروع ہو چکا تھا آج کیپٹلزم یا سرمایہ دارانہ نظام کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ بین الاقوامی علوم کے تمام دانشور ماضی میں حتی کہ آج بھی کئی عالمی نظاموں کے بارے میں بات کرتے ہیں اور اپنے اپنے نظریات کو بیان کرتے وقت مختلف تہذیبوں کا نام لیتے ہوئے تاریخی اور تقابلی جائزہ لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر سیاسی اقتصاد کے استاد گونڈر فرینک اس بات کے قائل ہیں کہ گذشتہ صدیوں اور حتی کہ اس سے بھی قدیم زمانوں میں مالی اور اقتصادی نظام متعدد ہوا کرتے تھے۔

ایک اور ماہر عمرانیات پروفیسر جانٹ ابو القود کا ماننا ہے کہ عالمی اقتصاد اور سرمایہ دارانہ نظام کا تعلق پچھلی چار صدیوں یا مغربی ممالک کے ساتھ نہیں، بلکہ سولہویں صدی عیسوی سے پہلے کا نظام ایک عالمی تجارتی اور اقتصادی نظام تھا جو تیرہویں اور چودھویں صدی کے مابین وجود میں آیا جس کی وسعت یورپ سے لیکر چین تک تھی اور بحیرۂ روم اور مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک، اس کے مراکز رہے ہیں۔ "عالمی نظام" کے آثار پچھلے دو عشروں میں زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بین الاقوامی علوم کے ماہرین کی اچھی خاصی تعداد "مغرب کے ظہور" اور اس کے تمدن کو ایک خاص واقعہ یا سرمایہ داری کے سسٹم کی صورت میں نہیں دیکھتے بلکہ گذشتہ تہذیبوں کی قدرتی نشوونما بالخصوص اسلام کا ایک جز سمجھتے ہیں۔ ان افراد کے لیے تسلط پسند اور متحرک اقتصادی مراکز اور اس کے ساتھ خاموش، تسلط شدہ اور بے حس گوشہ و کنار میں دنیا کی تقسیم ایک تاریخی مسئلہ ہے جو پچھلے پانچ ہزار سال سے جاری ہے۔ والٹر شٹاین عالمی سرمایہ دارنہ نظام کو سرمایہ کی مسلسل جمع آوری کی صورت میں دیکھتا ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ اس عالمی نظام کی کوئی مشخص سرزمین یا سرحد نہیں ہے، بلکہ یہ صنعت، تجارت اور پیسے کی تبدیلی سے مربوط ہے۔ اس لیے اس کا پیش کردہ عالمی نظام زمان و مکان سے بے نیاز ایک مستقل نظام ہے جو دوسرے قومی اور ملّیتی نظاموں حتی بین الاقوامی نظام سے علیحدہ اپنی خصوصیات کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ کیپٹلزم عالمی نظام کے عنوان سے ایک عالمی تمدن بن چکا ہے۔

مغربی مفکرین اور دانشوروں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو تمدن کے مفہوم کو محتاط انداز میں دیکھتے یا اس لفظ سے تحقیقی استفادہ کرنے کو رد کرتے ہیں مثال کے طور پر اس صدی کے اوائل میں امریکہ میں رہنے والے روسی ماہر عمرانیات سوروکین(۸۹)، توین بی، شپینگلر اور نیکول ڈنیلوسکی کے مغرب میں پیش کئے جانے والے مفہومات کو قبول نہیں کرتا اور اپنے تحقیقاتی آثار میں مفصل تہذیب کے مفہوموں کی وسیع تر و عظیم شکل استعمال کرتا ہے۔ بعض مغربی محققین کا ماننا ہے کہ تمام تہذیبیں تو عالمی نظام ہیں، لیکن بعض عالمی نظام تہذیب نہیں ہیں۔ ڈیوڈ ولکنسن اور کرسٹوفر چیسٹڈن کی تحقیقات اور تحریریں بھی اسی نظریہ کو بیان کرتی ہیں۔ اس تھیوری کے مطابق تمدن ترقی پسند ہوتے ہیں اور زیادہ تر اقتصادی اور تعمیراتی ترقی کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ گروہ تہذیبوں کا، ترقی کی تھیوری کے زوایہ سے مطالعہ کرتے ہیں، ہماری نظر میں پروفیسر ویلیم مکنیل کی اپنی کتاب "ظہور غرب" پر تنقید جو تقریباً تین عشرے پہلے امریکہ میں چھپی

اور مغرب کی طرف سے تہذیبوں کو سمجھنے اور درک کرنے کے حوالے سے اس کی حقیقت گوئی اور اعترافات خاص طور پر اسلامی تمدن کے بارے میں اس کی تحلیل و تجزیہ بہت جاذب ہے اور اس مضمون کے طالب علموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں، وہ اپنی کتاب کے چھپنے کے پچیس سال بعد بیان کرتا ہے کہ کس طرح سرد جنگ اور خاص طور پر دوسری جنگ کے اینتھروپالوجسٹ افراد کی اپسٹمولوجی نے اس کے ذہن کو پریشان کر دیا اور اس کو چین اور اسلام کے تہذیبوں کے مطالعہ اور تحقیق سے روک دیا ہے۔ وہ مغرب کے ایک برجستہ نظریہ پرداز کے عنوان سے یہ بات واضح کرتا ہے کہ کس طرح پچھلی صدیوں میں اسلامی تمدن عہد حاضر کے مغربی تمدن کے مقابلے میں بہت زیادہ آزاد منش، تہذیبی اور حقیقی پلورلسٹ رہا ہے۔ اس کا علمی اور تحقیقی موضوع ہنٹنگٹن کے آج کے دعوؤں اور باتوں کی مکمل طور پر نفی کرتا ہے۔

آج چین میں تہذیبوں کے تصادم کا موضوع اور بحث بہت عام ہے۔ درحقیقت انیسویوں صدی سے جس وقت مغربی عسکری طاقتوں نے چین پر قبضہ کیا تو تہذیبوں کی بحث کا آغاز بھی اسی وقت ہو گیا ہے۔ اِس موقع پر خاص طور پر جس وقت جاپان میں جدیدیّت اور اصلاح پسندی میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، بہت سارے چینی یہ سوچتے تھے کہ اگر وہ اپنے حقیقی تمدن کی حفاظت میں کامیاب ہیں تو مغربی تمدن کو قبول کر سکتے ہیں جبکہ ایک کثیر تعداد کا ماننا تھا کہ یہ امر نا ممکن ہے۔ اور مغربی تمدن چین پر غلبہ اختیار کر لے گا۔ آج پلینگ یونیورسٹی کے پروفیسر لی شنزی اور تنگ یلجی اس نظریہ کو پیش کرتے ہیں کہ اگر چین اور مغرب کے درمیان اقتصادی تعلقات ایک مناسب ماحول میں انجام پائیں اور مغرب چینی تمدن کو سمجھنے پر راضی ہو تو یہ خود ایک جدید عالمی تمدن کے تفاہم، ہم فکر حتی اس کے ساتھ جوڑ پر منتہی ہوگا۔ دوسری طرف فودان یونیورسٹی کے استاد ژنگ رولون جیسے دوسرے چینی استادوں کا کہنا ہے کہ تہذیبوں کے آمیزش کی جو تھیوری اقتصادی ترقی پر مبنی ہے معمولاً ایک نمونہ کے طور پر زیر بحث آتی ہے، جبکہ پوری دنیا میں متعدد مذاہب اور رنگا رنگ اجتماعی نظام پائے جاتے ہیں اور آج کے روابط نے ہر تہذیب و تمدن میں تحرک اور تعلق کو پر رونق کیا ہے اور تہذیبی شناخت کی جستجو آج کی دنیا میں اس کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اقتصادی ترقی نے ایشیا میں قومی اور مقامی شناخت کی حس کو طاقت بخشی ہے۔ لیکن ایشیا اور مغرب دو مخالف اجتماعی جہتوں میں سوچتے ہیں۔ چینی اجتماعات، سماج، خاندان اور فطرت کے ساتھ محبت پر ایمان رکھتے ہیں

جبکہ مغرب ان موضوعات کے مخالف ہے۔ آئندہ آنے والے سالوں میں پتہ چلے گا چینی ان مشکلات، تناقضات اور معموں کو کیسے حل کریں گے۔

ایک حوالے سے تمدن ہر انسانی معاشرے کی سیاسی، اقتصادی، تہذیبی اور اجتماعی پیچیدگیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کی علم و ہنر میں ترقی کی حالت کا نام ہے۔ ایک تعریف میں تمدن کسی ایک تاریخی دور میں کسی بھی گروہ، ملت یا علاقے کی ترقی اور تہذیب یا معاشرے کی قسم کو کہتے ہیں۔ جیسے آج کا امریکہ جو نسبتاً ایک جوان معاشرہ اور جدید نظام ہے اپنے ابتدائی سالوں میں سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں کوئی مشخص یورپی تمدن نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ جسے امریکہ یا نئی دنیا کہا جاتا ہے وہ اِن یورپیوں کی مختلف تہذیبوں کا فطرتی گہوارہ ہے جنہوں نے اپنی ظالم حکومتوں سے فرار کیا اور ایک نئی اور بہتر زندگی کی تلاش میں اس سرزمین میں پناہ گزیں ہوئے۔ اس بناپر امریکہ کے ان ادوار کے مطالعے میں ہم صرف آرزوں، امیدوں، اقدار اور آئیڈیل اہداف کے بارے میں بات کر سکتے ہیں۔ نہ کہ امریکہ کے تمدن جیسی چیز کے بارے میں۔ ان ادوار میں امریکہ کا تمدن وہاں کے پہلے سے بسے لوگوں کا تمدن تھا جسے ان مہاجروں نے پامال کر دیا۔ امریکہ کا سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی نظام خود ابھی تشکیل کے مراحل میں تھا اور ابھی تک اپنی جڑیں پکڑ نہیں پایا تھا۔ حقیقی صورت میں امریکی تمدن آنی والی صدیوں میں تشکیل پایا اور مہاجرین کی ابتدائی قدریں اور اندرونی و بیرونی، سیاسی، ٹیکنالوجی، اقتصادی اور تہذیبی تبدیلیاں پچھلی دو صدیوں سے امریکہ کے موجودہ تمدن اور اس کے مختلف پہلوؤں کو تشکیل دے رہی ہیں۔

ہماری نظر میں "تہذیبوں کے مابین گفتگو" ایک ناقص اور ادھورا نظریہ ہے اور ہم دو یا دو سے زیادہ حکومتوں یا سماجوں کی گفتگو کی طرح تہذیبوں کی گفتگو کے بارے میں بات نہیں کر سکتے؛ حکومتوں، گروہوں حتی سوسائٹی کے مختلف طبقات اپنی اپنی نمائندگی میں ایک دوسرے سے بات چیت اور تبادلہ خیال کر سکتے ہیں اور چونکہ تمدن کا مفہوم سماج، تہذیب اور حکومت سے وسیع تر ہے تمدن سے ارتباط ایک اور مرحلہ طے کر رہے ہیں تمدن کی ہم کوئی حتمی تعریف نہیں کر سکتے۔ بعض افراد تمدن کو ابتدائی اور نچلی سطح کی زندگی سے شہری زندگی، سماج کی طرف منتقل ہونے کے عمل کو کہتے ہیں جو ایک پیچیدہ نظام ہے۔ حالانکہ دوسرے کسی خاص علاقے یا سماج میں ہونے والی خاص قسم کی مادی اور معنوی ترقی کو قرار دیتے ہیں۔ تہذیب کے مقابلے میں تمدن کا دائرہ کافی وسیع ہے اور "ترقی" کی سوچ نہ صرف مادی سطح بلکہ اخلاقی، فکری، ہنر اور علم

و دانش کی سطح پر بھی ذہن میں آتی ہے اور اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، اجتماعی اور عسکری صورتوں کو بھی شامل کرتی ہے۔ ایک تمدن کے اندر ممکن ہے متعدد سماج، مختلف قومیں اور تہذیبیں پائی جاتی ہوں۔ جس طرح ایک سرزمین یا ملک میں متعدد تہذیبوں کے آثار دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہماری نظر میں تمدن فی الواقع زندگی گزارنے، اس جہان کو سمجھنے اور اس سے برتاؤ کے راستے ہیں۔ کیا یہ موضوع آج فرانس اور امریکہ جیسے ممالک کے علمی اور تربیتی مسائل میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ کیا فرانس اور مغرب کا تمدن وہاں کی اسلامی طالبات کے حجاب پر قدغن لگاتا ہے؟ کیا امریکہ کا انیگلو سکسن تمدن، سیاہ فام اور لاطینی امریکیوں کی زبان و ادبیات کے مطالعہ اور تحقیق کے لیے مناسب ماحول پیش کرے گا؟ کونسا تمدن سب کی سرپرستی کرے گا؟ کیا اس طرح کے سوالات کہ کینیڈا جس میں انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں، اسی طرح سر اٹھائیں گے؟ کیا دنیا کے مختلف حصوں اور آج کے نظام میں علم و دانش اور ٹیکنالوجی یکطرفہ نہیں ہے؟ کون سے تہذیبوں کو طاقت کی برتری حاصل ہوئی ہے؟ کیوں اور کیسے؟ عصر حاضر میں تہذیبوں کے مابین تبادل کے ذرائع کیا ہیں؟ کیا تہذیبوں کی گفتگو اسلام کے بارے میں ایک صدی قبل مغربی اور فیٹلزم کے ڈھانچے میں اور مغربی یونیورسٹیوں اور علمی مراکز کے ساتھ مل کر عمل کرے گا؟ کیا اس قسم کی "گفتگو" ایک جدید تسلط پسندی پر منتہی تو نہیں ہو گی؟ سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا ممکن ہے کہ تہذیبوں اور تہذیبوں کی گفتگو کو سیاست اور اقتصاد سے جداگانہ طور پر پیش کیا جائے؟ اگر ہم تمدن کو جس معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے، اس سے وسیعتر استعمال کریں نہ کہ صرف علم و ہنر اور تہذیب کی ترقی کے معنی میں، تو ضروری ہوگا کہ سیاست اور اقتصاد کے بارے میں بھی بات کی جائے۔ سیاسی اور اقتصادی طریقہ کار اور ادارے گذشتہ اور آج کے تمدن کا ایک حصہ ہیں۔ آج کی دنیا اور زندگی کی مہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ لوگ روابط، اطلاعات، سفروں سے مختلف تہذیبوں میں غوطہ ور ہو چکے ہیں اور تہذیبوں کے اس مسلسل ملاپ کی وجہ افراد اور معاشروں میں بہت سارے تناقضات نے جنم لے لیا ہے، مثال کے طور پر ایک انگریز ماہر اقتصادیات پروفیسر سوزن سٹرنج "تجارت اور معاملات کا تمدن" کے بارے میں کہتی ہیں کہ یہ اقتصاد کے عالمی ہونے کی وجہ سے زیادہ شدت اختیار کر چکا ہے۔ علاقائی اور عالمی سطح پر کام کرنے والی تجارتی اور بین الاقوامی کمپنیوں کے ملازمین اور منیجروں نے اس قسم کے تجارتی اور مصرفی قسم کے تمدن اور اس کے اصول اور اس کے زندگی کے اصولوں کی طرف بہت زیادہ کشش پیدا کی ہے۔ اگرچہ یہ خود مختلف

تہذیبوں سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن اس قسم جدید اقتصادی تمدن نے ان کے اشتراکی ہونے میں ایک خاص تہہ "layer" ایجاد کردی ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ یہ جدید تمدن جو "تجارت اور معاملات کا تمدن" کے نام سے ایجاد ہوا۔ کیا ایک مستقل تمدن تھا یا مغرب تمدن کی طرف رجحان رکھتا ہے یا در حقیقت مغربی تمدن ہی اس کا اصل سرچشمہ ہے؟ کیا مغربی تمدن کو صنعتی تمدن جو "صنعتی انقلاب" کا نتیجہ تھا، اس سے جدا کرنا ممکن ہے؟ پچھلی صدی میں مغرب کے جدید تمدن جس کی وجہ سے عظیم صنعتی رَسد، تقسیم اور مصرف و خرچ دیکھنے میں ملا نا صرف سیاسی اور اقتصادی اداروں کے قالب اور طریقہ کار کو متاثر کیا، بلکہ تبدیل کردیا اور اسی طرح انسانی ماحولیات میں ایسے عظیم قسم کے ضرر رساں اثرات چھوڑے ہیں کہ آج کوئی بھی ان سے انکار نہیں کرسکتا۔ جدید سرمایہ دارانہ اقتصاد یا نیوکلاسک کیپٹلزم اکانومی خود ایک تسلط پسند اور مسلط شدہ آئیڈیالوجی ہے۔ اس سے انسان کے موجودہ تمدن کے مسائل کو اقتصادی و سیاسی فارمولے سے حل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کی جڑیں بہت گہری ہیں، اس لیے انفراسٹرکچر کو جابجا کرنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر یورپ کی نسبت امریکہ کا اقتصاد بہبود کی طرف جاتا ہے تو اس کی علت یہ ہے کہ کمپنیوں کے منافع میں بے پناہ اضافہ اور صارفین اور عوام کے منافع میں کمی ہے اور امریکہ جو سرد جنگ کے دوران اسلحہ سازی میں سرمایہ کاری کرتا تھا اور ویتنام جیسی جنگوں میں بھی نسبتاً کمی آئی ہے لیکن یورپی یونین میں بے روزگار افراد کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور اب یہ عدد ۸ سے ۱۲ فی صد تک پہنچ چکا ہے۔ جاپان سے لیکر اٹلی اور انگلینڈ سے لیکر امریکہ تک کے تمام صنعتی ممالک کی حکومتی اور قومی اسٹیبلشمنٹ میں رشوت اور بدعنوانی انتہائی خطرناک صورت حال اختیار کرچکی ہے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کے طریقہ کار، مشرقی یورپ اور مرکزی یورپ کے ممالک کی طرف منتقل ہونے سے یہ ممالک بھی جدید تمدن کی بیماریوں میں مبتلا ہوچکے ہیں۔ مشرقی ایشیا کے ممالک جیسے تھائی لینڈ، انڈونیشیا، جنوبی کوریا اور حتی ملائیشیا کہ جن حوالے سے یہ طے تھا کہ جدید مغربی تمدن کی عالمگیریت اور جدیدیّت کم از کم ان کا معیار زندگی اور رفاہ کو اوپر لے جائے گا لیکن انتہائی کم مدت میں ہی اقتصادی اور اجتماعی بحرانوں کا باعث بن جاتا ہے۔ صرف دو ماہ کے اندر انڈونیشیا کی کرنسی کی قدر میں ۸۰ فیصد کمی آگئی۔ تہذیبوں کے اندر ان کے مابین گفتگو کسی میز کے گرد بیٹھ کر نہیں ہوتی بلکہ یہ ایسے روابط اور تعلقات ہیں جو نامحسوس طور پر اور تدریجی طور پر اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی ماحول کو تبدیل کردیتے ہیں۔

تہذیبوں کے مابین ملاپ یا تصادم صرف مغرب، اسلام اور باقی دنیا میں ہی نہیں بلکہ خود مغرب میں تمدن ایک دوسرے سے رابطے پیدا کرتے ہیں۔ مغرب کی بہت ساری مشکلات خود مغرب میں تصادم اور کشمکش کی مشکلات ہیں۔ چار عشرے پہلے مغربی یورپ میں بے روزگار افراد کی تعداد دس ملین سے کم تھی جو ۱۹۸۰ میں ۲۵ ملین اور اب ۳۳ ملین تک پہنچ چکی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی میں مغربی صنعتی تمدن نے عظیم اثرات چھوڑے ہیں۔ ۱۶۵۰ عیسوی میں پوری دنیا کی آبادی ۵۰۰ ملین تھی اور یہ عدد اٹھارویں صدی میں صنعتی انقلاب سے پہلے بڑھ کر ۸۰۰ ملین تک پہنچ گیا لیکن انیسویں صدی میں صنعتی ترقی کی تیز رفتاری کی وجہ سے پوری دنیا کی آبادی ایک ارب اور چھ لاکھ ہو گئی۔ بیسویں صدی کے آغاز سے اور ایک صدی کے اندر اندر دنیا کی آباد تین برابر ہو گئی اور جو اس وقت ساڑھے پانچ ارب ہو چکی ہے۔ آج کی مختلف تہذیبوں میں ان تبدیلیوں کا کیا اثر ہے؟ آبادی میں بے پناہ اضافہ کئی سالوں سے کم صنعتی یا غیر صنعتی ممالک میں ہی ہو رہا ہے نہ کہ صنعتی یا انتہائی صنعتی ممالک میں۔ تمدن کے بارے میں دو مختلف قسم تفکر وجود میں آئے ہیں۔ ایک تمدن کو نسبتاً جامد اور معین صورت میں دیکھتا ہے جبکہ دوسرا تمدن کو ایک متحرک اور ڈاینامک واقعہ کی صورت میں دیکھتا ہے۔ وہ صورت جو تاریخی و اجتماعی قوتوں کا حاصل ہے اور ایک مخصوص اور مشخص حالت میں پایا جاتا ہے، مغرب اور بالخصوص کے مستشرقین (Orientalists) اسلام، چین اور ہندوستان پر سطحی اور ابتدائی نگاہ کرتے ہیں جبکہ اپنے تمدن کو فعال، متحرک اور خلاق جانتے ہیں۔ اسولڈ شنگلر اور فرناٹد بروڈل جیسے مفکرین بھی مغربی تمدن کو ایک استثنائی تمدن شمار نہیں کرتے۔ اسلامی دنیا کے عظیم دانشور ابن خلدون کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی تاریخ و تمدن کی گردش پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور جیسا کہ شپنگلر نے اپنی کتاب "مغرب کا زوال" میں لکھا ہے مغرب کا تمدن بھی پیدائش، ترقی اور زوال کے مراحل کو طے کرے گا۔ پہلی جنگ عظیم سے ٹھیک پہلے چھپنے والی اس کی کتاب اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مغرب اپنے زوال وانحطاط کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ مغرب، مقابل مشرقی تہذیبوں کے مقابل دفاعی اور مزاحمتی حالت اختیار کئے ہوئے ہے، اس کے برعکس اسلامی تمدن اپنی تمام ذاتی خصوصیات کے ساتھ دوسری تہذیبوں کو سمجھنے میں کسی قسم کا تعصب نہیں رکھتا۔ وہ اسلامی تمدن جو مشرق وسطی، ایشیا اور ہسپانیہ تک پھیلا اس بات کی دلیل ہے اور تیرہویں صدی تک دنیائے اسلام کی عظیم تہذیبی اور اقتصادی سسٹم چین، ہندوستان، افریقہ اور بحیرۂ روم کے کنارے رہنے والوں کے ساتھ، اس تحرک اور

آمیزش کو ظاہر بھی کرتا ہے۔ اسلام کے تمدن کا تحرک، توحید و وحدت پسند کی تھیوری، عالمی اور ایک امتی سوسائٹی اور مختلف ملتوں کے مابین تہذیبی روابط و تعلقات سے حاصل ہوا۔ اس کے برعکس مغرب کے تمدن کا آغاز اختلاف، تصادم، قومیت اور ملیت کی بنیادوں پر ہوا۔ مغربی تمدن انفرادیت، فردیت پر بھروسہ کئے ہوئے مادیات کی طرف رجحان رکھتا ہے جبکہ اسلامی تمدن اجتماع، سماج پر زور دیتا ہے اور معنویات کی طرف راغب کرتا ہے۔

اگر ہم پانچ صدی پہلے کی جنگوں، تنازعات اور اختلافات کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ٹکراؤ اور تصادم زیادہ تر مغربی ممالک اور ان کی تہذیبوں کے درمیان ہوئے ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم اور اسی طرح پچھلی نصف صدی میں جاری رہنے والی سرد جنگ در حقیقت مغربی تمدن کی اندرونی جنگیں تھیں اور ہمیشہ ان اختلافات کی آئیڈیالوجی کا محور "جدیدیّت" یا "ترقی یافتہ" ہونا ہے اور آج مغرب کے تمدن کا اسلام اور چین و ہندوستان کے جیسے دوسرے تہذیبوں پر دباؤ کی وجہ یہی اقتصادی و مادی عالمگیریت اور جدیدیّت پسندی ہی ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے اس ماڈرن دور کہ جس میں تجدد و ترقی تمام چیزوں کا محور بن چکی ہے، اس سے ما قبل تہذیبوں کے مابین رابطہ اور آمیزش اس سے کہیں زیادہ تھا اور قدرت کے خلاف بشر کی وہ جنگ جو آج جاری ہے اس حد تک کبھی بھی نہ تھی لیکن یہ سب اس وقت تبدیل ہوا جب مغرب نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ معاشروں کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ کیپٹلزم ڈیموکریسی اور جدید اقتصاد کی عالمگیریت کا راستہ ہے۔ اسلام اور مغربی تمدن کے مابین حقیقی گفتگو سنجیدہ اور کامیاب نہیں ہو سکی، اس وقت بھی مغرب میں بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ صرف ایک تمدن ہی دنیا میں باقی رہے گا اور وہ صرف مغربی تمدن ہے۔ وہ تمام تہذیبوں کے احیائے تفکر پر عقیدہ نہیں رکھتے۔ اس وقت کے مغربی تمدن کی خصوصیتوں میں سے ایک اس کی ٹیکنالوجی اور علمی و فنی ایجادات ہیں اور اہل مغرب کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ عالمی کردار صرف انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یہ خود مغربی تمدن کے عالمی ہونے کی دلیل ہے لیکن ہم یہ چیز بخوبی جانتے ہیں کہ بارود، قطب نما اور پرنٹنگ پریس مشین چینیوں اور ایشین افراد کی ایجاد ہیں نہ کہ مغربیوں کی۔ اور یوریپیوں کے علمی مطالعات کی روش و طریقہ اور اس براعظم میں نشاۃ ثانیہ کی بنیاد اسلامی تمدن کے دانشوروں، مفکروں، موجدین اور اسلامی جامعات نے ہی رکھی تھی۔ بیوروکریسی کا مفہوم، وظائف کا نظام اور وزراء کے وفود، یہ سب اسلامی تمدن کے ابتدائی صدیوں کے ساتھ

وابستہ ہیں اور تیرہویں و چودھویں صدی عیسوی میں مسلم ممالک اور اہل یورپ کے مسلمانوں کے ساتھ رابطے کے ذریعے مغرب میں منتقل ہوتے ہیں۔ "تیز رفتاری" کا موضوع و مفہوم آج کے مغربی تمدن کا ایک اور پہلو ہے۔ جسے کام میں تیزی، سفر میں سرعت، مال اکھٹا کرنے اور کھانا کھانے میں تیز رفتاری وغیرہ۔ حقیقی افہام و تفہیم اس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب دونوں اطراف حملے اور دفاع کی حالت میں نہ ہوں اور بلند اہداف ان کے مد نظر ہوں۔ یہ سب مل کر اس قسم کی گفتگو اور تبادلہ خیال کے ماحول کو سازگار بنا سکتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ معروف اینتھرو یالوجسٹ کلاوڈلوی استراوس نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا کہ :

"مجھے اب آکر پتہ چلا کہ کس طرح ہماری تہذیب نے تمام دوسری تہذیبوں پر حملے کئے اور ہم نے اس کا دفاع کیا۔ اب جبکہ صورتحال تبدیل ہو چکی ہے اور اب ہماری تہذیب دوسروں کے حملوں خاص طور پر اسلام کی زد میں ہے، میں پھر بھی اپنی تہذیب کا دفاع کروں گا"

یہ جملے دنیا کے موجودہ نظام کے تصادم اور اس کی تطبیق نہ ہونے کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں آئندہ ہونے والے تہذیبوں کے تصادم، خود مغرب اور اہل مغرب کے درمیان ہونگے۔ سابق سوویت یونین کے ٹکڑے ہوئے تقریباً سات سال گذر چکے ہیں لیکن آج اس جدید لیکن نا معلوم شروع ہونے والے عہد حاضر کے لیے مغرب میں فکری اختلاف کی وجہ سے کوئی نام مقرر نہیں ہو سکا۔ وسطی اور مشرقی یورپ نے مارکسزم اور لیننزم کے تمدن سے تو جان چھڑوالی لیکن اپنی قومی تہذیب کے احیاء کے لیے کوشش کرنے کی بجائے، امریکی تہذیب کی یلغار میں ایک نا معلوم سمت میں چل پڑے ہیں۔ فرانس اور یورپی یونین امریکی تمدن اور ایک قطبی تہذیبی اور اقتصادی جہات کی دنیا کو ایک سنجیدہ خطرہ قرار دے رہے ہیں اور یورپ اور شمالی امریکہ کے صنعتی ممالک میں سیاست اور قیادت کے بحران اقتدار طلبی اور خود پسندی کی اس دوڑ میں اس بے سکونی کی علامتیں ہیں۔ اس مسئلے میں بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ تمدن مورخوں کے ذہنوں کی تخلیق ہے اور ان کا کوئی خارجی وجود نہیں۔ کیا تمدن مغربی ڈائیلاگ کا ایک خاص لفظ ہے؟ تمدن اور اس کی خصوصیات کے بارے ہمارا اندازہ کیا ہے؟ اس مسئلے میں مختلف عقائد موجود ہیں لیکن سب سے پہلے ہم اس سطح پر سول سوسائٹی کے اداروں اور مشخصات کا مطالعہ کریں گے۔

بین الاقوامی سطح پر غیر سرکاری اداروں کی ترقی ایک سول سوسائٹی کے لیے عالمی سطح پر بنیاد نہیں بن سکتی۔ کیونکہ ان میں سے اکثر ادارے اپنے قومی اہداف اور اپنی تہذیب کی خاص خصوصیات کی ترویج کرتے ہیں اور ایک عالمی حکومت کی غیر موجودگی میں ایک مستقل عالمی فضا کی تخلیق سے بھی عاری ہیں۔ دوسری طرف بین الاقوامی سرکاری ادارے جیسے اقوام متحدہ اور اس سے وابستہ ادارے بھی وہ وحدت، قانونی حیثیت، حاکمیت، فیصلے کرنے کے وہ حقوق نہیں رکھتے جتنے قومی حکومتوں کے پاس ہوتے ہیں۔ معاشی اور اقتصادی سرگرمیوں میں مصروف بہت سے ملٹی نیشنل ادارے حکومتوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں تا کہ عالمی سطح پر زیادہ سے زیادہ اقتصادی فوائد حاصل کر سکیں۔ موجودہ نظام پر حاکم سرمایہ داری کا بلا واسطہ اقتصادی انفراسٹرکچر ایک ایسا سسٹم ہے جو جیت اور ہار کی بنیاد پر عمل کرتا ہے اور اس ہدف کے حصول کے لیے جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے سول سوسائٹی کے ادارے کو چاہے کام کا پہلو ہو یا سرمائے کا، اسے کنٹرول کرتے ہیں اور اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ ایک سوسائٹی میں حکومت کے مقابل ایک آرگنائزیشن کے عنوان والا بازار عالمی سطح کے بازار سے بالکل مختلف ہوتا ہے کیونکہ عالمی سطح کے بازاروں کے سیاسی اقتصاد کے اصول اور سرمایہ داری کے محور ایک ملک اور تہذیب کے بازار کی وحدت اور اجتماعی پہلو نہیں رکھتے۔ غیر سرکاری بین الاقوامی اداروں کے بارے میں گذشتہ چند سالوں میں ہونے والی تحقیقات اور مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے ان اداروں کو حکومتوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اور حکومتوں کے یا بین الاقوامی حکومتی اداروں کے فیصلوں کے مقابلے میں اتنی مالی طاقت نہیں رکھتے کہ وہ حکومتوں کے ساتھ طاقت میں ہمسری کر سکیں اور زیادہ تر یہ ادارے عمومی افکار سے آگاہی تک ہی منحصر ہیں۔ (۹۰)

۱۹۹۳ عیسوی میں سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے شوخ مزاجی میں ایک سنجیدہ بات کہی کہ:

"مجھے سرد جنگ بہت یاد آتی ہے کیونکہ فکری حوالے سے سرد جنگ ایک خاص کشش اور واضح موقعیت رکھتی تھی امریکی عوام کو اپنی توقعات کا علم تھا"

آج مغربی لبرل طبقہ سرد جنگ کا متمنی ہے کیونکہ سابق سوویت یونین کے زوال نے جس چیز کو سب سے زیادہ اُجاگر کیا ہے وہ یہ کہ عالمی نظام ایک باادب نظام اور سول سوسائٹی نہیں بلکہ ایک وحشت ناک جنگل ہے۔ موجودہ عالمی نظام کے لیے سوسائٹی کے لفظ کا استعمال ایک افسانے سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ مصلحت پسندی کبھی بھی ایک سوسائٹی کی بنیاد نہیں ٹھہر سکتی۔ تعاون کے وہ کونسے موارد ہیں جو امریکہ،

ایران، برازیل اور زمبابوے میں ممکن ہو سکتے ہیں؟ عالمی نظام ایک ایسا تدریجی نظام ہے جس میں نہ حکومت کا کوئی وجود ہے اور نہ سماج کا بلکہ ایک قسم کی انارکی اور بد نظمی ہے جو مورد توجہ ٹھہری ہے۔ اس وقت اقوام متحدہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایک فساد سے بھری وسیع بیورو کریسی، دوسری جنرل اسمبلی جو بڑی طاقتوں اور اتحادوں کی آواز اور ان کی تبلیغی بینڈ ہے، اور آخری سلامتی کونسل ہے جو دوسری جنگ عظیم کی فاتح طاقتوں کے نمائندوں سے تشکیل پاتی ہے اور یوں گذشتہ دو صدیوں کی یورپی سیاست پر عمل کر رہی ہے۔ اس بین الاقوامی قانون کے معیاروں میں سول سوسائٹی کے لیے کوئی جگہ نہیں بچتی۔ اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی سرکاری ادارے درحقیقت حکومتوں اور معاشروں کے مابین جنگوں کی روک تھام کے لیے وجود میں آئے ہیں۔ آج کے عالمی نظام کی قومی حکومتیں افراد نہیں بلکہ وہ کھلاڑی ہیں جو اپنی قدرتی اور نچلی سطح کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جس وقت امریکی فورسز نے ہیٹی کو مرکزی امریکہ کا جز بنانے کیلئے قبضے کا ارادہ کیا تو امریکی وزیر خارجہ سے سوال کیا گیا کہ:

یہ فیصلہ کس بنیاد پر لیا گیا ہے تو اس نے جواب دیا:

"اگر سرد جنگ جاری رہتی اور ہیٹی کمیونسٹوں کی جانب سے معرض خطر میں ہوتا تو آپ اس قسم کا سوال نہیں کرتے"

جس طرح مغرب میں ایک آئیڈیل سوسائٹی کے لیے ملکوں کی سطح پر کوششیں جاری ہیں اس طرح عالمی سطح پر ایک سول سوسائٹی کے حصول کی آرزو بھی موجود ہے۔ لیکن اس طرح کی سوسائٹی کی تشکیل بین الاقوامی نظام کی کیفیت میں تبدیلی ضروری ہے۔ دو قطبی دنیا کے خاتمے اور سرد جنگ کی نظریاتی تنازعات میں محوریت مکمل ہونے کے ساتھ بین الاقوامی نظام نے نئی راہیں پیدا کی ہیں۔ اس سلسلے میں دو مرکزی لیکن مخالف راستے دیکھنے میں آئے ہیں۔ قومیت وملیت جو دنیا کا پہیہ گھمانے کے لیے دوبارہ زندہ ہو کر دن بدن اپنے بڑھوتری کے عمل میں جاری ہیں۔

سابق یوگوسلاویہ میں صربوں، بوسنیاؤں اور کرائوں کے درمیان لڑائیاں اور بالکان کے دل میں کوسوو جیسے بحران، چیکوسلواکیہ کی جمہوریہ چک اور سلواک میں تقسیم، سوویت یونین کا زوال اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات، مرکزی ایشیا، براعظم افریقہ اور مشرقی ایشیا میں پھیلنے والی نسلی و قومی فسادات کی آگ اور حتی یورپ میں بسنے والی اکثر آبادی کی جن میں انگلینڈ، فرانس اور ناروے شامل ہیں، یورپی یونین اور

سوسائٹی میں سیاسی، اقتصادی اور عسکری وحدت کے معاہدوں پر دستخط کرنے سے کترانا، یہ سب قومی اور نسلی شناخت اور نیشنلزم کے ایک جدید دور کی طرف اشارہ ہیں۔ یورپ میں ہونے والے بہت سارے یہ تنازعات اس قدر شدت اختیار کر گئے کہ نتیجتاً سرد جنگ کا اختتام ہوا، سوویت یونین کو زوال آگیا۔

اس کے علاوہ سرد جنگ، بہت سارے اجتماعی دھڑوں جن کو اس نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا کے لیے نقطہ اختتام ٹھہری۔ اس اتحاد کا بہترین نمونہ مشرقی اور مغربی جرمنی کا دوبارہ ملاپ ہے۔ اس وقت مشرق و مغرب میں ایک دوسرے سے الگ ہونے والے سماج بڑے پیمانے، زیادہ آسانی اور تہمت کے کمتر امکانات کے ساتھ آپس میں جڑ سکتے ہیں۔ سپر طاقتوں کی آپسی لڑائی کے نتیجہ میں مذہبی، لسانی اور قومی گروہوں کے وہ باہمی تعلقات جو پارہ پارہ ہو گئے تھے اب دوبارہ قائم ہو سکتے ہیں۔ دیوار برلن تہذیبی اور آئیڈیالوجک حصار شمار ہوتی تھی جبکہ یورپی اتحاد نے قدیمی شناخت کی انواع اور اقسام کی پیدائش کے لیے راستے ہموار کئے ہیں لیکن دوسری طرف مغربی دنیا سے الگ ایک اسلامی وحدت اور اتحاد کے لیے ایک مخالف تحریک نے جنم لیا ہے۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے آغاز سے ہی ایک اسلامی امت کی تخلیق پر ایمان کو دوبارہ جلا ملی ہے۔ سابق یورپی یونین کے زوال مرکزی ایشیا میں تازہ آزاد شدہ ممالک کہ جن کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے، ان کی ناپایداری سے اس امید نے اور زور پکڑا ہے۔ ایک سوسائٹی، ایک اسلامی اُمت کے قیام یا اسلامی حیات کی تجدید کا جذبہ ہی ہے جس نے قومی اور ملکی سرحدوں کو ٹھکرا کر اپنا سفر جاری رکھا اس جذبے کو ہم ایران، مصر، مراکش، الجزائر، سوڈان، انڈونیشیا اور ملائیشیا میں موجود تحریکوں میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں جبکہ اسلامی سول سوسائٹی امت کے مفہوم میں ذاتاً ایک عالمی سوسائٹی ہے جو برادرانہ، عقیدتی، ایمانی اور توحیدی تعلقات کی بنیاد پر قائم ہے۔ سول سوسائٹی مغرب کی آرزو ہے جو عالمی سطح پو قومی اور ریاستی حکومتوں کے مدار پر چلتی ہے اور مختلف ممالک کی سول سوسائٹی ایک طرف حکومتوں اور فرمانبرداروں کے درمیان فضا اور دوسری طرف عوام اور اقتصادی سرگرمیوں کے درمیان ماحول کا نام ہے۔ (۹۱)

آئندہ کا ایک اہم عامل دو عملوں کا تقابلی رابطہ ہے۔ موجودہ صورتحال میں سابق یوگوسلاویہ جیسے ممالک میں نظاموں وغیرہ کو دیکھتے ہوئے کسی اطمینان بخش صورتحال کی خبر نہیں دی جا سکتی۔ جس طرح ایران میں آنے والا اسلامی انقلاب ترقی اور اجتماعی روابط جیسے نمونے جو ایک اسلامی ممالک میں ان کی پستی کا ایک

واضح نمونہ تھا۔ وہاں یورپ میں بوسنیا، ہرزگوینا اور کوسوو میں عوام کے قتل عام، براعظم افریقہ کے روینڈا اور الجزایر جیسے ملک میں ہونے والی قتل و غارت اور لاطینی امریکہ میں اغوا اور جلاؤ گھیراؤ نے گلوبل ولیج " Global Village" جیسے سپر نظریے پر خط بطلان کھینچ دیا۔ ایک طرف ہر روز عوام ٹیلی ویژن پر اس قسم کے قتل و غارت کے مناظر دیکھتے ہیں لیکن بڑے واضح طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ عالمی لیڈر جن کے پاس روپیہ، طاقت، ادارے اور فوج سب کچھ موجود ہے اس اجتماعی انحطاط اور نسل کشی کو روکنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بوسنیا، کوسوو اور روینڈا اب نازیوں کا جرمنی نہیں کہ دنیا اس درندگی سے بے خبری کا اظہار کرے۔ اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ سوویت یونین میں کیمونزم کا سقوط نہ ہی تاریخ کے اختتام کے معنی میں ہے، نہ ہی سرد جنگ کا اختتام اور نہ ہی عالمی سطح پر سول سوسائٹی کا آغاز، اگر دیوار برلن گری ہے تو ساتھ ہی نسلی دیواریں بھی بلند ہو رہی ہیں اور بنیادی کشمکش ویسے ہی عالمی روابط کو تشکیل دیں گی امریکہ اور روس کے مابین جاری سرد جنگ کا اختتام ہوا لیکن ہم ایک دوسری جنگ کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ ایک جنگ جو شروع ہو چکی ہے اور مصنف کے خیال کے مطابق جب تک موجودہ عالمی نظام اسی سیاسی اور اقتصادی نظام کی صورت میں دنیا پر چھایا رہے گا یہ جنگ تھمنے والی نہیں ہے۔ ہماری نظر میں حکومتوں اور معاشروں کے درمیان روابط اور تعلقات نے ایک جدید دور کا آغاز کر دیا ہے۔ ایک طرف جہاں بڑی طاقتوں کی چپقلشوں نے انسانی نسل کی ایٹمی نابودی کو سرفہرست لا کھڑا کیا ہے، وہاں حکومتوں اور نسلوں کے باہمی روابط پر زور نے عالمی اور بین الاقوامی روابط کی پیچیدگیوں میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔

مثال کے طور پر بین الاقوامی تجارت کے مختلف زاویوں پر اقتصادی راہنمائیوں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقائی تجارت کے نظاموں کی تشکیل پر زور دیتی ہیں۔ اس طرح یورپین سوسائٹی، شمالی امریکہ علاقائی آزادی تجارت کا معاہدہ "نیفٹا" اور پیسیفک ریجن کے اندورنی حالات و تبدیلیاں سب ہی علاقائی اقتصادی دھڑے بندیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ علاقائی اقتصادی اور مالی دھڑوں کی سمت یہ حرکت سرد جنگ کے دوران علاقائی جیوپولیٹکل اور عسکری دھڑوں کی جانشین بن گئی ہے۔ یہ رجحان زیادہ تر اقتصادی مرحلہ میں عمل کرتا ہے اور ان قومی جدائی طلب تحریکوں کے برخلاف جو زیادہ تر تہذیبی مرحلے سے تعلق رکھتی ہیں، حرکت کر رہا ہے اور اس کے مرکز میں بڑی بڑی ملٹی نیشنل اور انٹرنیشنل اقتصادی کمپنیوں نے علاقائی عسکری نظام اور معاہدوں کو مکمل طور پر تباہ نہیں کیا ہے۔ ورسا معاہدہ تو ختم ہو گیا لیکن نیٹو معاہدہ جو غیر

دفاعی اور تہاجمی پہلو رکھتا ہے زیادہ اوپر آیا ہے۔ بالکان کے خطے میں نیٹو کی مداخلت، بحیرۂ روم کے خطے میں امریکہ کی اسٹر ٹیجک اور عسکری سرگرمیاں جدید عالمی نظام کی برجستہ علامت ہیں جن میں علاقائی دفاعی معاہدے یورپی دھڑوں، امریکہ اور اقتصادی عالمگیریت کے معاملے کی حفاظت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان علاقوں میں بڑھتا ہوا علاقائی تعصب بیرونی عوامل سے مربوط خطروں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ صنعتی دنیا میں علاقائی تعصب کی اہمیت پر نظر رکھتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ لاطینی امریکہ، افریقہ، مشرق وسطیٰ اور مرکزی ایشیا کا کیا بنے گا؟ کیا یہ بھی علاقائی بلاک یا دھڑے بنانے پر قادر ہو پائیں گے؟ اس کے علاوہ اس گلوبلائزیشن اور علاقائی موجودیت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ کیا یہ ایک متحدہ جہان یا مطلوبہ سول سوسائٹی کی تخلیق و تشکیل کے لئے بنیاد بن سکتے ہیں یا تفرقہ بازی کے وہ اجزاء ہیں جو آئیڈیل سول سوسائٹی اور عالمگیریت کے عمل میں سدّ راہ ثابت ہوں گے۔

دوسری طرف علاقائی رجحانات کے ذیلی مفاہیم کو صنعتی دنیا میں دیکھا جاسکے اور کم ترقی یافتہ ممالک میں ان کے اثر کو محسوس کیا جاسکے۔ یہ احتمال ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ تہذیبی مشترکات پر مبنی مختلف سیاسی اور اقتصادی دلائل کی وجہ سے اقتصادی ٹیکنالوجیکل اور حتی کہ علاقائی اطلاعاتی نظاموں پر جدید نظریات دیکھنے کو ملیں۔ بطور مثال اسلامی دنیا میں موجودہ ڈھانچے کو چھوڑ کر ایک اسلامی علاقائی نظام کی تشکیل کا بہت زیادہ امکان اور صلاحیت موجود ہے خاص طور پر جب وسطی ایشیا میں جدید جمہوری ممالک اور ریاستیں قائم ہو چکی ہیں اور شمالی افریقہ و مشرق وسطیٰ میں اسلامی تحریکیں سر اُٹھا رہی ہیں۔ لیکن اس کی کامیابی کا دارومدار اسلامی معاشروں کے بابصیرت اور بہادر لیڈروں پر ہے کہ وہ کس طرح ماضی اور حال کی گمراہیوں سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں اور مغربی ریشہ دوانیوں اور نامعلوم مفاہیم سے مرعوب نہ ہوں اور اپنی فکری اور عملی آزادی کو اسلامی سوسائٹی کے پیرائے میں زندہ کریں۔ مغرب کے موجودہ حالات کے پیش نظر ایک اجتماعی وحدت پسندی اور سرمایہ دارانہ سیکولر دنیا کی عمرانیات کے نظریہ کی عدم موجودگی میں علاقائی تعصب کا عمل سیاسی اور تہذیبی دونوں سطح پر متعدد مشکلات اور مسائل سے دوچار ہے۔ مغربی قومی نظام اور مختلف سول سوسائٹیاں اقتصادی اور اجتماعی امتیاز حاصل کرنے کے لیے کس قدر اپنے سیاسی اور تہذیبی تسلط سے صرف نظر کریں گی؟ ڈنمارک جیسے چھوٹے ملک میں ۱۹۹۰ کے عشرے میں ماسٹریخٹ

معاہدے کی مخالفت میں یورپ کی سیاسی وحدت کا تجربہ ایک ایسے وقت میں قومی نظاموں کی حساسیت کو بیان کرتا ہے جہاں پہلے سے اقتصادی وحدت کا مسئلہ راستے میں کھڑا ہے۔

اہل کینیڈا و میکسیکو اپنے اوپر امریکی تہذیب کا تسلط کس حد تک محسوس کرتے ہیں، جیسا پہلے اس کا اظہار کرتے رہے ہیں؟ اسی طرح یہ بحث فرانس، جرمنی اور انگلینڈ کے درمیان تہذیبی اور نیشنلسٹ طبقے کے تنازعات کے بارے میں بھی کی جاسکتی ہے۔

اگر ہم عالمگیریت کی گذشتہ بیان کردہ تعریف کو قبول کرلیں تو اس وقت ہم اقتصادی دنیا اور بین الاقوامی روابط میں ہونے والی تبدیلیوں کی قدر و قیمت سمجھ سکتے ہیں جو طاقتور ممالک کی حکومتوں اور ان کے عوام کے لیے عمیق مضامین لیے ہوئے ہے اور مغربی ممالک میں سول سوسائٹی کی بنیادوں کو تشکیل دیتی ہے۔ آج کے متحدہ قومی حکومتوں کا جواز ان کے اس کردار پر منحصر ہے جو وہ اجتماعی ماحول اور قومی اقتصاد کی حفاظت میں ادا کرتی ہیں۔ حکومت وہی ہے جو ملک کی سرحدوں کی پاسداری کرتی ہے اپنے عوام کے لیے امن و امان فراہم کرتی ہے اور انہیں کی نمائندگی میں ان کی خواہشات کو دوسروں کے حوالے کرتی ہے لیکن سرمایہ داری کا مصرفی نظام تمام سرحدوں کو عبور کر کے جدید بین الاقوامی رسد و تقسیم کے واسطوں کے ذریعے ان حکومتوں کے لیے یہ مواقع فراہم کر رہا ہے کہ وہ آسانی سے اپنی روایتی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر سکیں۔ مثلاً انٹر نیشنل کمپنیاں اپنی توانائی روابط اور نقل و حمل کے جدید سسٹم سے استفادہ کر رہی ہیں اور قومی سرحدوں کے اندر نفوذ کو بڑھا رہی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ دن بدن متحدہ قومی حکومتوں کی عالمگیریت اور انٹر نیشنل نظاموں پر غلبہ کی توانائی میں کمی آرہی ہے۔ انٹر نیشنل کمپنیوں کی پیدائش اور تمام متحرک طبقوں کے مابین بین الاقوامی روابط کے طریقہ کار میں تبدیلی نے سول سوسائٹی میں حکومتوں کے روایتی کردار کو پھیکا یا تبدیل کر دیا ہے۔ قومی اقتدار کے خطرے میں پڑ جانے اور جدید متحدہ قومی حکومتوں کی اپنے عوام کی خدمت اور امن و امان فراہم کرنے میں ناکامی نے بے اعتمادی کے احساس کو جنم دیا ہے۔ تہذیبی شناخت کا حصول، نسلی دعوے اور قومیت کی طرف رغبت ایک ایسے مسئلے کی علامتیں ہیں جن کے لیے گہری سیاسی فکر درکار ہے۔ مغربی سول سوسائٹی کو ان جدید مسائل کی قدرت و طاقت کا سامنا ہوگا۔

اس قسم کے علاقائی اور قومی اجتماع اپنی تقسیم اور بکھرے جزیروں کی صورت میں ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی صورت میں ممالک کے ایک سمندر کے اندر چلے گئے ہیں۔ مزید یہ کہ کوئی بھی اس کے حوالے سے ذمہ

داری قبول کرنے یا ان کے اصلی تنازعات کو حل کرانے میں اپنا کردار ادا نہیں کر رہا۔ اقوام متحدہ جیسے بین الاقوامی اداروں نے مروّجہ حکومتوں کے باہمی روابط کی حدود کو پار کرتے ہوئے چھوٹے اور کمزور ممالک کے اندرونی معاملات میں ٹانگ اڑانا شروع کر دیا ہے۔

اقوام متحدہ امن کی محافظ تھی جو اب حکومتیں قائم کرنا شروع ہو گئی ہے۔ جبکہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور یورپ کی بڑی طاقتیں جو عالمی میدان کے اصلی کھلاڑی ہیں ان امور کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک اور متفقہ اور مستقل پالیسی اختیار کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے اہم ادارے اسی وقت تک بڑی طاقتوں کے لیے مفید ہیں جب تک سب کا اعتماد اور اتفاق ہو دوسری صورت میں جس طرح مغرب کے کوسوو جیسے بحران میں مداخلت کا تجربہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ سلامتی کونسل جیسے اداروں کے اجلاسوں کی ذمہ داری سیاسی اور مصلحتی وجوہات کی بنا پر نیٹو معاہدوں اور اجلاسوں میں تبدیل ہو کر رہ جائے گی۔ اور یوں شمالی اٹلینٹک کا فوجی معاہدہ (نیٹو) اقوام متحدہ کے سیاسی ذمہ داروں کے فیصلوں کی جگہ لے لے گا۔

اس وقت مشرقی یورپ میں سول سوسائٹی کا کردار ایک بیہودہ اور تمسخر آمیز مشق ہے۔ آج سابق سوویت یونین کی جمہوری ریاستیں اور مرکزی و مشرقی یورپی ممالک کی ٹھیک وہی حالت ہے جو ترقی پذیر ایشین، افریقی ممالک اور لاطینی امریکہ کی اپنی آزادی کے فوراً بعد کی حالت تھی۔ یہ ممالک سامراج کے دور کی میراث کو اپنے کندھوں پر اٹھائے اس جدید بین الاقوامی نظام میں داخل ہوتے ہیں اور پہلے سے معین شدہ روابطی پیرائے کے ساتھ عالمی طاقتوں کے مراکز کے حاشیہ نشین بنتے ہیں۔ موضوعات پر ملکی سطح سے علاقائی سطح پر سیاسی اور اقتصادی روابط کو آگے بڑھانے پر وسیع دلالت موجود ہے بالکل ویسے جیسے اجتماعی ترقی کا سول سوسائٹی کی دوبارہ تعریف اور قومی سطح پر تہذیبی شناخت اہمیت کی حامل بیان کی گئی ہے۔ بڑی تبدیلیوں کے وقوع پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی متحدہ قومی حکومتوں نے اپنے ذاتی اور علاقائی مسائل سے دوچار ہونے کے بعد اقتصاد و معاشرے کو قانونی شکل دینے کی ذمہ داری کو علاقائی، ملٹی نیشنل اور انٹر نیشنل اداروں کے سپرد کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ متحدہ قومی حکومتوں کی فرسودگی نے مغرب میں سول سوسائٹی کے ابتدائی نظریہ کو بہت سخت نقصان پہنچایا ہے۔ گذشتہ عشروں میں سرکاری اور غیر سرکاری بین الاقوامی اداروں کی ذمہ داریوں کو بہت منسجم شکل میں منظّم کیا گیا ہے۔ ممکن ہے حکومتوں کے نمائندے

ان میں سے ہر ایک ادارے میں ہوں، لیکن اس کے بعد ان کے لیے ان کے فیصلوں کے نتائج کو کنٹرول کرنا ناممکن ہے۔

بین الاقوامی اداروں کی سرگرمیوں کی نظارت اور بعض خطوں پر حکومتوں کے دوبارہ سیاسی - عسکری تسلط کے دعوے نے اقتدار کے مفہوم پر اثرات مرتب کئے ہیں۔ خاص طور پر سول سوسائٹی کے سلسلے میں ایک نکتے کی طرف خصوصی توجہ ہونی چاہئے کہ محصول پسند اداروں کے آپس میں اور حکومتوں کے مابین ارتباط کے حوالے سے کیا ذمہ داری ہے اسی طرح سیاسی اور اجتماعی میدان پر مسلط عوامل کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ایک ایسے وقت میں حکومتیں مکمل طور پر اپنی حاکمیت کے حقوق اپنے ہاتھ سے کھو رہی ہیں (بعض اوقات عین اس وقت پر جب ان حقوق کو اپنی آزادی کے حصول کے دوران حاصل کیا) ان میں سے بعض حکومتوں نے خواستہ یا ناخواستہ طور پر دوسرے ممالک کی حاکمیت پر دست درازی کی توانائی کو ابھی تک محفوظ کر رکھا ہے، جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ نے امن، ڈیموکریسی یا جو آج کل سول سوسائٹی کے نام سے موسوم ہے، منافع کے تحفظ کے لیے ہیٹی، صومالیہ اور حتی کہ روس کے امور میں مداخلت کی۔ بالکل اسی طرح امریکہ، خلیج فارس کی جنگ میں بھی کوداتا کہ کویت، سعودی عرب اور اسرائیل کے سیاسی نظم کو باقی رکھ سکے۔ یہاں ان ممالک کے اہم سیاستدانوں کی طرف سے امریکہ کو خوش آمدید بھی کہا گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی وابستگیوں کی تخلیق میں حکومتی سسٹم کتنا موثر ہوتا ہے۔ اس طرح حاکمیت کے مفہوم کو پامال کیا جاتا ہے اور یہیں سے دوگانگی شروع ہوتی ہے کہ کس طرح ہم دوسروں کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ ایک حکومت کے اقتدار کے تحفظ کے لیے سول سوسائٹی کے قیام کے بہانے لے کر ہماری قومی حاکمیت پر دست درازی کریں۔

جیسا کہ پہلے اشارہ ہوا ہے کہ امریکہ اور سابق سوویت یونین کے مابین سرد جنگ کے اختتام پر امریکی دانشوروں اور سیاستدانوں نے لبرلزم کی کامیابی کا ڈیموکریسی اور سرمایہ داری کے طریق سے اعلان کیا۔ سوشلسٹ نظام کے سقوط اور اس کی جگہ لینے والے دوسرے کم اہمیت نظاموں کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزاد اقتصاد پر مبنی جدید عالمی نظام سامنے آیا۔

گذشتہ موڑ اس وقت پیش آتا ہے جب دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں امریکہ اپنے کیپٹلسٹ اور ڈیموکریٹک منافع کو ایک مارشل سکیم کے مدد سے یورپ اور جاپان تک پہنچاتا ہے۔ ان دنوں کوئی بھی سول سوسائٹی اور اس کے احیاء کی بات نہیں کرتا تھا اور ڈیموکریسی کا لفظ ماڈرنزم اور جدیدیّت کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس اقتصادی امداد کے ساتھ ہی امریکہ کے ساختہ بین الاقومی ادارے پھلنے پھولنے لگے۔ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور برٹن ورلڈز سسٹم (جو سرمایہ داری کی توسیع و ترقی کو منظّم کرنے میں مدد دیتے ہیں) جیسے ادارے اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ترقی کا یہی آئین بعد میں تیسری دنیا کے ممالک تک پھیل گیا تا کہ سابق سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرسکے۔ اس کا نتیجہ جدیدیّت، مغربیت اور صنعت کاری کے نظریات پر حد سے زیادہ توجہ تھی، جو ترقی پر مسلط اصولوں کو تشکیل دیتے تھے۔ جبکہ ساٹھ اور ستر کے عشروں کے آخری سال ایک تھوڑی سی مہلت تھی تا کہ غیر وابستہ تحریک اور گروپ ۷۷ ہر ملک کے سیاسی اور اقتصادی حقوق کو بین الاقوامی نظام کے میدان میں برابری کی سطح پر ثابت کر سکیں۔ لیکن ۸۰ کے عشرے اور بیسویں صدی کے آخری سالوں میں یہ تحریکیں دم توڑنے لگیں۔ مسلط نظم کی پیدائش ایک حقیقی امر تھا اور اس کے زوال کے بارے میں دعوی کسی افسانے سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ سرد جنگ میں کامیابی سے حاصل ہونے والی خوشی کے ساتھ لبرلزم اور سرمایہ داری نے اقتصادی ترقی کے لیے دوبارہ بہترین اسٹریٹجی کا ڈھول بجانا شروع کردیا۔ لیکن اس مرتبہ دو اور موضوعات تسلط پسندی کی دوبارہ پیدائش کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ ایک اقتصادی عالمگیریت اور دوسرے مغرب کی من پسند سول سوسائٹی۔ میٹا انڈسٹریل اور اطلاعاتی سوسائٹی اور سول سوسائٹی پر ختم ہونے والے منصوبے کے بارے پر "پوسٹ ماڈرن" کے دوام کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو اس وقت بہت آزاد خیال افراد میں رائج ہو چکی ہے۔ مغرب کی مد نظر عالمی سول سوسائٹی کی شناخت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیادی اور اساسی حرکتوں اور اس کے اخلاقی، تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی دلالتوں کو سمجھا جائے۔ اس لیے اطلاعات اور ارتباط کی شاہراہوں اور ورلڈ انفارمیشن سسٹم کے بارے میں بحث کے لیے نئی جدیدیّت اور ماڈرنزم کے عقیدتی ابعاد کے بارے میں مناسب معلومات کا ہونا از حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صنعتی دور کے بعد والے دور کی مرکزیت بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے۔ سول سوسائٹی کے بارے میں ہونے والی ہر بحث عالمی تہذیب کے تنوع اور ایکولاجیک ارتباط کے وسیع میدان پر توجہ کے ساتھ ہونی چاہئے۔

کیا بین الاقوامی سطح پر جدید عالمی نظم کو متعارف کرنے سے ترقی پذیر ممالک میں اتحاد برقرار ہوسکے گا؟ کیا صنعتی انقلاب کی مدد سے دوسرے انقلابات کو قبول کیا جاسکتا ہے؟ جدیدیّت یا ماڈرنائزیشن کو ایک عالمی تحریک شمار کرنا مشکل لگتا ہے کیونکہ جدیدیت اور مغربیت کے سابق طریقوں کو ابھی تک بہت سی غیر مغربی تہذیبوں خاص طور پر اسلامی تہذیب کا سامنا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم تہذیبی تقابلی طریقہ کار کو انتخاب کرنے کے لیے ایک عالمی عام نگاہ "perspective" رکھتے ہوں جو خود اس حوالے سے شناخت شناسی اور میتھڈولوجی "Methodology" کا لازمہ ہے۔

جس طرح ہم نے اپنی دوسری تحریروں میں بھی اس چیز کی یاد دہانی کرائی ہے۔ "Real politic" کنزرویٹو مکتب جو قدرت طلبی کے محور پر بھروسہ کئے ہوئے ہے اور سیاسی فکری دنیا پر نصف صدی تک سایہ فگن سیاسی اور اقتصادی ریڈیکل نظریہ اپنی محدود نظر کی وجہ سے عالمی ترقی سے مربوط بہت سے سوالوں کی جواب دہی میں ناکام رہا ہے، (۹۲)۔ تحقیق کے میدان میں شناخت شناسی اور اپسٹمولوجی کے حوالے سے مغرب کی قدیم طریقہ کار جس میں مفاہیم اپنے مصادیق سے جدا شمار ہوتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے صرف مغربی علوم اور فلسفہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ ایسی دوگانگی بھی پیدا کرتی ہے، جو قابل عمل مفاہیم اور نظریوں کی تشکیل میں مانع بنتی ہے۔ روایتی طور پر سول سوسائٹی کے بارے میں تحقیق مغربی تحقیقات کی طریقوں میں سے دو علیحدہ موضوعات میں انجام پاتی تھی۔ ایک وہ طریقہ جو دوسری عالمی جنگ کے بعد کے زمانے میں رائج تھا جو عملی عمرانیات، سیاسی علوم اور سرکاری تحقیقات میں اجتماعی نفسیات (عوام اور مخاطبین کا تجزیہ اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں افسران بالا کے درمیان روابط) کے حوالے سے استعمال ہوتا تھا۔ اجتماعی تحقیقات میں استعمال ہونے والا دوسرا اکثریتی طریقہ ان کوششوں کا نتیجہ تھا جو اثباتیت کی توسیع کو روکنے کے لیے استعمال میں لایا گیا۔ فرینکفرٹ نامی معروف مکتب اسی تنقیدی طریقہ کی نمائندگی کرتا ہے جو ماکسزم کی گذشتہ اور موجودہ آرا سے استفادہ کرتا ہے۔ ایسے وقت میں جب معاشرے کی شناخت شناسی Epistemology اور نظریاتی انفراسٹرکچر کی توسیع کے لیے متعدد درخواستیں ہوئی ہیں مندرجہ بالا دو طریقے، اس حوالے سے غالب نظریاتی طریقے ہیں۔

بین الاقوامی عمرانیات نے حالیہ دنوں میں ایک اجتماعی مفہوم کے عنوان سے تہذیب کی اہمیت کو محسوس کیا ہے جبکہ اس علم کے ماہرین نے تہذیب کو نسلی محوریت کی شناخت شناسی کے زاویہ سے دیکھا ہے

ایک مکمل تہذیبی شناخت ایک ایسے نظریاتی طریقے جو دوسرے فکری مکاتب کی اہمیت کے قابل ہو، کو اختیار کئے بغیر میسر نہیں ہو سکی۔ اس لیے وقتی، دائمی اور شناخت شناسی کے مرحلے پر تہذیب اور بالخصوص معاشرے کی پہچان ضروری ہے۔ اگرچہ اس کتاب کا ہدف جیسا کہ شروع میں بیان ہو چکا ہے اسلامی سوسائٹی کی تعریف اور اسلامی معاشروں کی مختصر تاریخ یا تاریخچہ بیان کرنا نہیں۔ اس کے باوجود ضروری ہے کہ غیر مغربی خطوں پر پائے جانے والے مختلف سیاسی اور فلسفی نظاموں کا جائزہ لیا جائے جو ہمیں اس قدر علمی ذخائر پیش کرتے ہیں کہ جن سے استفادہ کر کے معاشروں کے تقابلی مطالعات کئے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی تفکر، عقل کو ہدف کے حصول کا ایک آلہ کے طور پر دیکھتا ہے۔ عقل مثبت قدر کی مدد سے شناخت نفس کے مشتاق افراد کی راہنمائی کرتی ہے جو شناخت و معرفت خدا پر منتہی ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں "نگاہ دل" میدان عمل میں وارد ہوتی ہے۔ خصوصاً اس میدان میں ہندوستانی تفکر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے تجربہ اور عقل، تخلیق کی خیالی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ واقعیت اور شناخت، واقعیت کے مابین رابطہ انسان کو حقیقت بیان کرنے کے لئے اوزار فراہم کرتا ہے۔ شناخت وہ عمیق اور گہرائی کی نظر ہے کہ جس سے نفس (اتمن ہندی فلسفہ میں) مطلق (برہمن ہندی فلسفہ میں) کے قریب ہوتا ہے۔ پھر عقل ایک ہدف تک پہنچنے کا وسیلہ بھی شمار نہیں ہوتی۔

الغرض، ہندوستانی فلسفہ ادراک کو چاہے محسوس ہو یا غیر محسوس علم و دانش کے مآخذ اور منبع کے عنوان سے جانتا ہے۔ چینی تفکر میں تجربہ اور عقل دونوں حقیقی ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں تائو کی تجلی شمار ہوتے ہیں۔ تائوئسٹ تفکر میں کبھی دل پر تاکید کی جاتی ہے۔ جبکہ کنفوشیس تفکر میں روایات کے احترام کو اہمیت دی جاتی ہے۔ دوسرا عامل جس کا ہمیں جائزہ لینا ہے، ہونے اور ہو جانے کے مابین رابطے کی شناخت کے طریقے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی نکتہ نگاہ میں علم جہان بینی کی نگاہ ماضی کی طرف ہوتی ہے نہ کے آنے والے کل پر۔ اس بناء پر مفروضہ اور آزمائش وقتی اقدار کے حامل ہیں۔ اسلامی طریقہ کار میں شناخت شناسی دو علوم پر مبنی ہے۔ ایک "عقلی" یا "علم ایجادی" دوسرا "نقلی" یا "علم نقلی"۔ انتقالی علوم میں ایک عمومی حالت پائی جاتی ہے۔ جبکہ ایجادی علم بعض خصوصیات کے ساتھ مختص ہوتا ہے اور لازم ہے کہ عقلی اور تجرباتی طریقوں سے سمجھا جائے۔ یہ دونوں اکٹھے پھلے پھولے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کے آغاز

اور "اسلام کے سنہری دور" کے افتتاح سے ایجادی اور انتقالی علوم میں پیدا ہونے والی مختلف طریقوں اور راستوں کی شناخت نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا۔

جبکہ علوم کی نظریہ پردازی، نظم اوران کو عمومیت دینے کے لیے اقدامات کئے گئے لیکن منظّم طریقے، تحقیق، طولانی مشاہدہ یہ سب اسلامی دور کی اطلاعات اور علم کے مرہون منت ہیں۔آج کا دور جسے علم نجوم، طب، طبیعیات، سیاسی اقتصاد و عمرانیات کے نام سے جانا جاتا ہے مسلمانوں کے رنسانس سے پہلے ادوار میں جدید تحقیق کرنے کے جذبے کا نتیجہ ہیں۔اسلام نے عقل اور تجربہ پر بھروسہ کیااور تاریخ و قدرت کو انسانی علوم کے مآخذ کے طور پر پیش کیا۔

اگر ہم شناخت شناسی اور میتھڈولوجی میں تجدید نظر کی ضرورت پر توجہ دیں، تو ہمیں پتہ چلے گا کہ اسلام میں مغربی تعریف و مفہوم والی سول سوسائٹی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اسلام میں اسلامی سوسائٹی ہے نہ کہ سول سوسائٹی۔ جس طرح اسلام میں معاشرے کا مفہوم مغرب میں پائے جانے والی معاشرے کے مفہوم سے جدا ہے، بالکل اسی طرح اسلام میں سولائزیشن اور سولائیزڈ ہونا بھی مغرب میں پائے جانے والے ان مفاہیم سے بالکل مختلف ہے۔ ہمیں اسلامی سوسائٹی کے پہلوؤں کا اسلامی عمرانیات سے مطالعہ کرنا ہوگا اور اسلامی عمرانیات کی بنیاد اسلامی امت ہے۔

چھٹا باب:

سول سوسائٹی تجربہ و عمل کے میدان میں

گذشتہ دو عشروں میں یورپ اور امریکہ اور ان سے مربوط اداروں میں سول سوسائٹی کی ایجاد پر ہونے والی بحثیں قومی سطح پر اجتماعی تحریکوں کے اداروں کی پیدائش اور افزائش کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ سول سوسائٹی سے مربوط بحث میں بہت سے ہم عصر مغربی اہل قلم ان قومی اجتماعی تحریکوں اور ان سے وابستہ اداروں کو خود سول سوسائٹی کے موضوع سے الگ رکھتے ہیں(۹۳)۔ دوسری طرف سول سوسائٹی کے بارے میں نظریہ پیش کرنے والے بعض افراد اس قسم کی قومی و اجتماعی سرگرمیوں کو اجتماعی دولت و سرمایہ گردانتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ماحولیات، حقوق نسواں اور مختلف مذہبی، تہذیبی اور اجتماعی قومی تحریکیں اور اختلافات اور شدت پسندی کے ساتھ مقابلہ اور اس طرح معاشرہ میں امن و امان کی ترویج آج کی سول سوسائٹی کو جدید ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں(۹۴)۔ سول سوسائٹی کی تحلیل میں اجتماعی تحریکوں کی طرف عدم توجہ کا سبب ان سرگرمیوں میں افراد اور شہریوں کے درمیان گہرے تعلقات کا نہ پایا جانا ہے اور دوسری طرف طاقت کے حصول کے لیے اور اپنی آرزوں کی تکمیل کے لیے سرگرم رہنا ہے نہ کہ معاشرے میں وحدت اور اتفاق کے لیے سرگرم عمل ہونا اور نہ ہی اقتصادی اور حکومتی نظام سے الگ ایک علیحدہ ماحول کے عنوان کے لیے کوشاں ہونا ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس قسم کے ادارے نہ صرف معاشرہ میں عمومی گفتگو کی وسعت کا باعث بنے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے اجتماعی مسائل کو معاشرہ میں خاصی اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ سول سوسائٹی کے دائرہ کار میں اس قسم کے اداروں کے حوالے سے دو بنیادی اعتراض سامنے آتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں قومی تحریکوں کے ادارے ایسی عمودی طرز کی تنظیمیں ہیں جو قومی امور میں فیصلے لینے میں حد درجہ شوق رکھتی ہیں اور اس طرح وہ ڈیموکریٹک اور عوامی نمائندہ جماعتیں نہیں رہتیں۔ دوسرا اس قسم کی تحریکوں کی قیادت سوسائٹی کے سرکردہ افراد یعنی سفید فام یورپی افراد کے ہاتھ ہوتی ہے جو اپنے تہذیبی اور معاشرتی نظریات میں مشترک اور خاص تعصّبات کے حامل ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے امریکہ میں سول سوسائٹی کے بارے میں چھپنے

والے مضامین کے مجموعہ میں قلم کاروں نے واضح کیا کہ گذشتہ کچھ سالوں سے مشہور ہونے والا سول سوسائٹی کا مفہوم گذشتہ صدیوں میں آزادی اور انقلاب کے سلسلے میں اٹھنے والی تحریکوں کے اہداف سے بالکل منفرد ہے۔ آج کی سول سوسائٹی کی تحریک مغرب میں ایک "محدود اور انقلابی" تحریک ہے جس کا ہدف معاشرے کی بنیاد اور ڈھانچے کو تبدیل کرنا نہیں بلکہ نیچے سے اُوپر کی طرف کچھ اصلاحات کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں "GeneralMobilization" کا اہتمام کرنا ہے۔ اس کا دوسرا ہدف معاشرے اور نظام کو ڈیموکریٹک بنانا ہے۔(۹۵) یہ قلم کار حضرات آج کی سول سوسائٹی اور اس کی کارکردگی کو "مارکس ازم سے بھی زیادہ عمومی" جانتے ہیں جو سوشلسٹ سسٹم میں موجود ضعف اور نتیجتاً کیمونسٹ معاشرے کے سقوط کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ معاصر جرمن فیلسوف اور مفکر یورگن ہابرماس کی تصنیفات کی اتباع کرتے ہوئے یہ افراد سول سوسائٹی کو اس کی معاشرتی نقادانہ تھیوری کے بارے میں نظریہ پردازی کا عکاس سمجھتے ہیں۔(۹۶) ان حالات میں سول سوسائٹی کی تحریک جدید آزاد خیالی کا احیا ہے جس کا اصل ہدف "پلورلزم" یا "ڈیموکریسی" اور اس سے مربوط اداروں میں کثرت اور تنوع ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغربی اعتقادات اور ڈیموکریسی، ھیومنزم "Humanism" یا "اصالۃ الانسان" کے مذہب پر مبنی ہیں اور انسان ہی تہذیب، سیاست، اقتصاد، قانونی اور اخلاقی اصولوں کا محور اور تمام اقدار کی بنیاد ہے تو کیا معاشرے میں افراد کے مابین تعلقات اور میل میلاپ کی کیفیت سول سوسائٹی کے مفہوم اور عمل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی؟ لبرلزم آزاد خیالی، آزادی اور تقدم کو فرد کا حق سمجھتی ہے۔ اور مغربی مادّیت پرست نظریات و عقائد میں اور خاص طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے تحت جہاں سب چیزیں سرمایہ اور منافع میں روز افزوں اضافہ کے گرد گھومتی ہیں، اور چونکہ کامیابی اور سعادت جسمانی اور محسوس لذتوں کی بدولت سمجھی جاتی ہے، اس لیے معاشرے میں ایک قسم کی خودپسندی جنم لیتی ہے جس سے انسانی تعلقات کو نقصان پہنچتا ہے۔ اپنے آغاز سے لیکر آج تک مغرب میں ہونے والی سول سوسائٹی کے بارے میں گفتگو قانون، عوام اور حکومت کے مابین رابطہ، معاشرے میں حکومت سے جداگانہ فضا، آزاد اقتصادی سرگرمیوں اور بیوروکریسی سے دور غیر حکومتی اداروں کو اہمیت جیسے اصولوں پر اعتماد کرتی رہی ہے۔(۹۷) لیکن کچھ ایسے معاشرے بھی موجود ہیں جہاں قانون تو موجود ہے لیکن تمدن نہیں، جہاں خصوصی ادارے تو موجود ہیں لیکن کنٹرول اور قبضہ ایک مخصوص گروپ کا ہے۔ اس لیے ہر چیز سے

زیادہ سول سوسائٹی کا سر و کار تمدن "Civilization" سے ہے اور تمدن کے مفہوم کا تعلق انسانی روابط کی کیفیت کے ساتھ۔ ہے، کیونکہ مغربی ڈیموکریسی ذاتی اغراض و مقاصد اور منافع کی حفاظت کے لیے وجود میں آئی ہے اس لیے اس سے مربوط معاشرتی قرار دادیں بھی انفرادی منافع کی حمایت کے لیے اوزار ایک وسیلہ کی خصوصیت کی حامل ہیں۔

امریکہ میں ہونے والے جدید مطالعات و تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے میں پائی جانے والی بہت ساری مشکلات جیسے غربت، قتل و غارت، نا امنی خاندانی اداروں، علاقائی انجمنوں، عبادتی مراکز، کلیساؤں اور ان جیسے دوسرے اجتماعی مراکز میں افراد کی عدم شرکت کے ساتھ مربوط ہے۔ خود عوام کی نظر میں ان مشکلات کی وجہ مادی نہیں بلکہ اخلاقی اور معنوی ہے۔ اس اجتماعی اور معاشرتی بیماری کی ایک اور علامت بھی ہے۔ وہ یہ کہ ان تحقیقات کے نتائج کے مطابق افراد کا ایک دوسرے پر سے اور سرکاری، غیر سرکاری اداروں پر سے اعتماد کم ہوا ہے(۹۸)۔ ۱۹۹۶ء میں امریکہ میں ہونے والے سروے کے مطابق صرف ۳۰ فیصد امریکیوں کا ماننا ہے کہ اپنے علاوہ دوسرے افراد پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ یہی تناسب ۱۹۶۴میں تقریباً ۵۶ فیصد تھا۔ پچھلے دس سالوں میں امریکہ میں سب سے زیادہ منافع حاصل کرنے والے جرائد اور کتب کے موضوعات "پرہیزگاری"، "تقوی"، "پاکدامنی"، "عفت"، "فضیلت" اور "پسندیدہ اخلاق" ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی صفات امریکہ کی سول سوسائٹی سے رفتہ رفتہ رخصت ہو رہی ہیں۔

۱۹۷۴ء سے لیکر ۱۹۹۴ء تک کے بیس سالوں میں امریکی معاشرے میں موجود اداروں اور انجمنوں میں عوام کی رکنیت میں دس فیصد کمی آئی ہے اور وہ افراد کسی بھی قسم کے ادارے میں رکنیت نہیں رکھتے ان کی تعداد میں پانچ فیصد اضافہ ہوا ہے۔

۱۸۳۰ء کو جب ڈوٹوکویل امریکہ آیا تو لوگوں کی علاقائی، ریاستی اور قومی غیر سرکاری اداروں میں شرکت سے بہت متاثر ہوا اور اس نے لوگوں کی اس قسم کی شرکت کو امریکی سول سوسائٹی اور ڈیموکریسی کی اساس قرار دیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں امریکہ ایک زرعی ملک تھا اور اس کی آبادی پچاس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ ڈوٹوکویل کے مرید اور پیروکاروں کا ماننا تھا کہ امریکہ میں عمومی زندگی اور اجتماعی اداروں کی ترقیاتی رپورٹ عوام کے اجتماعی چینل اور شرکت کے ساتھ براہ راست جڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف دوسری جنگ عظیم کے اختتام سے لیکر آج تک ہونے والے سیاسی اور اقتصادی ترقی کے بارے میں

مشاہدات بھی ہمیشہ آبادیاتی اور تعمیراتی منصوبوں میں افراد کی شرکت پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ بین الاقوامی تعلقات کے علوم کے استاد رابرٹ پوٹنام کے اٹلی کی مقامی حکومتوں کے متعلق بیس سالہ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کی مختلف مشاورتی کمیٹیوں کی حیات اور عوام کی منتخب حکومتوں کے دوام میں تمدن اور شہریت کا بہت گہرا اثر ہے اور اس قسم کی تمدنی شرکت عوام اور حکومت کے مابین تعلقات، تعلیمی امور میں ترقی، روزگار کے مواقع کی ترویج بلکہ مختصراً یہ کہ اقتصادی ترقی کے پروگراموں کی کامیابی اور مشکلات کے روک تھام میں مدد کرتی ہے لیکن ۱۹۹۵ میں " Bowling alone: America's Declining Social Capital" کے عنوان کے تحت چھپنے والی رپورٹ نے ڈوٹوکویل کی مدح سرائی کرنے والوں کے ضمیروں کو ہلا کر رکھ دیا۔ پوٹنام نے امریکہ کی گذشتہ کئی عشروں پر محیط اطلاعات اور اندازوں کے مطابق یہ ثابت کیا کہ امریکہ میں سول سوسائٹی تنزل کا شکار ہے اور امریکی عوام اپنے شہری امور میں شرکت اور مصروف رہنے کی بجائے صرف باؤلنگ "Bowling" کو ترجیح دیتے ہیں۔ پوٹنام کے تفصیلی مقالے کا آخری پیراگراف ان نتائج کو پیش کرتا ہے۔ (۹۹)

"امریکہ میں کم از کم ایسے دلائل موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ڈیموکریسی کے اندر توڑ پھوڑ کی وجہ پچھلے پچیس سالوں میں وسیع پیمانے پر ہونے والی شہری مصروفیتوں میں کمی کا ہاتھ ہے۔ ہمارا آج کا عالمانہ دستور یہ ہونا چاہیئے کہ کیا اس سے زیادہ ترقی یافتہ ڈیموکریسی اور دوسرے ماحول سے جڑی ڈیموکریسی اسی طرح دوسرے اداروں اور مختلف کرداروں میں بھی اس قسم کی توڑ پھوڑ اور تنزل جاری ہے۔ امریکہ کا آج کا سب سے اہم موضوع یہ ہونا چاہئے کہ اس اجتماعی رجحان کو کیسے روکا اور موڑا جائے اور یوں معاشرے کو شہری اعتماد اور مشغولیت واپس دلائی جاسکے"۔

امریکی ڈیموکریسی کے متعلق پوٹنام کی یہ رپورٹ ایسے وقت میں سامنے آئی تھے جب امریکی سربراہ اور سیاسی ماہرین مرکزی اور مشرقی یورپی ممالک کہ جو ابھی کمیونسٹ نظام کی قید سے آزاد ہوئے تھے ان میں اپنی طرز کی اصلاح طلبی کو نفوذ دے رہے تھے۔

پچھلے چالیس برس میں امریکہ میں شہری شراکت نے ایک نزولی قوس کو طے کیا ہے۔ (۱۰۰) امریکہ کے عام انتخابات میں شرکت کرنے والے افراد کی تعداد میں پچھلے چالیس سالوں میں ۲۵ فیصد کمی آئی ہے، شہر محلے اور سکولوں سے مربوط امور میں ہونے والی گفتگو، مذاکروں اور تقریروں میں حصہ لینے والے شہریوں تعداد میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۹۳ء تک ایک تہائی کمی آئی ہے۔ وہ امریکی جو واشنگٹن میں

مرکزی حکومت پر اعتماد نہیں کرتے تھے ان کی تعداد ۱۹۶۶ء میں ۳۰ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۹۲ء میں ۷۵ فیصد ہو چکی ہے۔ امریکی عمرانیات، عوام کی کلیسوں، دینی عباد تگاہوں مذہبی مراکز میں رکنیت اور شرکت کو سول سوسائٹی کی اہم علامات اور عنصر مانتے ہیں۔ اور امریکہ مغربی ممالک میں سب سے زیادہ عباد تگاہیں اور دینی مراکز رکھنے والا ملک ہے۔ پچھلے کچھ عشروں میں ہونے والے اندازوں کے مطابق ۱۹۵۰ء میں عبادت گاہوں اور کلیساؤں میں مذہبی رسومات میں شرکت کرنے والے ۴۸ فیصد افراد کی تعداد کم ہو کر ۱۹۷۱ء میں ۴۱ فیصد ہو گئی اور کمی کا یہ سلسلہ ۱۹۸۰ء تک جاری رہا۔ امریکہ میں بیسویں صدی کے اوائل میں مزدور یونینوں میں رکنیت اور شرکت اس کی اہم ترین اجتماعی اور معاشرتی سرگرمیوں میں سے شمار ہوتی تھی۔ لیکن اس قسم کی یونینوں میں شرکت میں ۵۰ فیصد کمی آئی ہے۔ حتی ۱۹۹۲ء میں صرف 15.8 فیصد مزدور اور کارکن اس طرح کی یونینوں کے رکن تھے۔ حالانکہ یہی نسبت ۱۹۵۳ء میں 32.5 تھی۔ طلباء کے والدین کی سکولوں اور دیگر سماجی انجمنوں اور تعلیمی اداروں میں شراکت میں حیرت انگیز طور پر کم ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر خواتین کی سوشل کلبوں میں شرکت میں ۱۹۶۴ سے اب تک ۵۹ فیصد اور "وومن تھیٹر" میں ان کی رکنیت میں ۱۹۶۹ سے اب تک ۴۲ فیصد کمی آئی ہے۔ پچھلے تین عشروں میں سکاؤٹنگ میں حصہ لینے والے افراد میں ۲۶ فیصد اور ریڈ کراس کے مراکز میں شمولیت اختیار کرنے والوں میں ۶۱ فیصد کمی دیکھنے کو ملی ہے اور "لیونز"، "ایلیکس"، "جیسی" اور "میسن" جیسے کلبوں میں سے اس کے ۲۰ سے ۴۰ فیصد ارکان نے اپنی رکنیت ختم کر لی ہے۔

افراد کے درمیان تعلقات کی بنیادی شرائط میں سے ایک اجتماعی سرگرمیاں ہیں اور ماہرین عمرانیات سول سوسائٹی کی تشکیل کے لیے انہیں کلیدی عامل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ گذشتہ چند عشروں میں ہونے والے مطالعات و تحقیقات اس چیز کے آئینہ دار ہیں کہ مغربی ممالک اور خاص طور پر امریکہ، کینیڈا اور دوسرے یورپی ممالک میں عوام کے آٹومیٹک مشینری کے استعمال اور انفرادیت پسندی کی جانب حد درجہ رجحان (کہ جس کی وجہ سے ان کا کمیونیکیشن کے ماڈرن وسائل سے سروکار بڑھ گیا ہے) کی وجہ سے ہر قسم کی اجتماعی سرگرمیوں میں کمی آئی ہے اور ایسے اداروں میں افراد کی رکنیت میں اضافہ ہوا ہے جہاں حاضری ضروری نہیں ہے۔ مثلاً اجتماعی ورزشوں میں شرکت کرنے والے افراد کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر کمی آئی ہے۔ جبکہ اس کی نسبت انفرادی شرکت کے کھیلوں میں شریک ہونے والے افراد کی تعداد میں اضافہ

پایا گیا ہے۔(۱۰۱) ۱۹۹۳ء میں تقریباً ۸۰ ملین امریکیوں نے سال میں ایک مرتبہ باؤلنگ میں حصہ لیا جبکہ اس کھیل میں شریک افراد کی تعداد میں ہر سال ۱۰ فیصد اضافہ ہوا ہے ہر چند وہ افراد جو اس کھیل میں گروپ کی صورت میں شرکت کرتے ہیں ان کی تعداد میں ۴۵ فیصد کمی آئی ہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں نجی اداروں اور کلبوں جیسے ریٹائرڈ افراد کے ادارے، ماحولیاتی آلودگی کے بچاؤ کا ادارہ، انجمن کتاب اور اسی طرح ویڈیو اور میوزک کے کلبوں میں افراد کی رکنیت میں اضافہ پایا گیا ہے جبکہ ان اداروں میں سرگرمیوں کی نوعیت انفرادی رہی ہے۔ افراد کا عمل دخل خط وکتابت اور مصرف کی اشیاء کی خریداری سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ امریکہ اور تمام مغربی ممالک میں سول سوسائٹی کے تنزل کے بارے میں تحقیقی تجربات اور نظریات ان لوگوں کی طرف سے پیش کئے گئے ہیں جو ماضی میں امریکہ اور یورپ میں لبرل اور کنزرویٹو نظریات کے ساتھ وہاں کی ڈیموکریسی کا دفاع کیا کرتے تھے۔ پروفیسر پوٹنام کی رپورٹ کے ساتھ چھپنے والی سیمور مارٹن لیپسٹ کی کتاب "امریکی انفرادیت پسندی: دو دھاری تلوار" انہیں تحقیقات میں سے ایک ہے۔ لیپسٹ جو امریکہ کی سیاسی عوام کی انجمن کا سابق صدر، اسی طرح امریکی ماہرین عمرانیات کی انجمن کا صدر رہ چکا ہے اور جو مدتوں امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض بھی انجام دے چکا ہے اور اس وقت ریاست ورجینیا کی جارج میسن یونیورسٹی کی علمی کمیٹی کا رکن بھی ہے، اپنی اس کتاب میں امریکہ میں بحث و گفتگو کی محدودیت سے بحث کرتا ہے(۱۰۲)۔ "معنوی پستی"، "اخلاق، جنایت اور کام"، ایک قانونی معاشرے میں لاقانونیت "سیکس اور خاندان" "انفرادیت پسندی، آگاہی اور اخلاق" "فرد اور سول سوسائٹی"، "شہری مصروفت میں کمی"، "بدگمانی میں اضافہ"، "ٹیلی ویژن میں بگڑی تصویر" اور "امریکی امنگوں کی نجات" اس کتاب کے ابواب وفصول کے وہ عناوین ہیں جو قاری کو امریکی سوسائٹی کی بحرانی کیفیت اور اس کے استثنائی ہونے کو سمجھاتے ہیں۔

وہ کون سے عوامل ہیں جو امریکہ میں سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کی محدودیت اور نتیجتاً سول سوسائٹی کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔ اس سوال کے مختلف اور متعدد جوابات ہیں لیکن ان میں اہم اور برجستہ ترین جوابات کچھ یوں ہیں۔

سیاسی پارٹیوں کے انحصار پر کنٹرول کے لیے سیاسی ترقی، کام اور مادی و اقتصادی سرگرمیوں میں مشغولیت کے نتیجہ میں شہریوں کے پاس وقت کا فقدان، خاندانی، اجتماعی، معنوی اور اخلاقی رشتوں میں

دراڑیں، ظاہری زندگی پر توجہ، مصروفیت اور قدروں میں عدم استحکام، خواتین کا کام کرنا، خاندان سے دوری اور اجتماعی اور محلّہ داری کے اُمور میں اُن کی توانائی میں کمی، تفریحی ٹیکنالوجی میں تبدیلی، ٹیلی ویژن، ویڈیو، انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور پروپیگنڈہ کے وسائل کے ساتھ بے حد وابستگی، حکومت اور حکومتی افراد پر عدم اعتماد اور قومی و سرکاری وسائل کا غلط استعمال۔

سول سوسائٹی کے آثار میں قانون اور اس کے احترام کو سول سوسائٹی کے اہم ستونوں میں سے شمار کیا گیا ہے۔ (۱۰۳) یورپ اور خاص طور پر امریکہ کی سرکاری رپورٹوں کے مطابق ان ممالک کے معاشروں میں لاقانونیت میں اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً پچھلے عشرے میں امریکہ میں مختلف جرائم کے سلسلے میں جیلوں میں جانے والے افراد کی تعداد دوگنا تھی۔ سنہ ۲۰۰۰ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی جیلوں میں قیدیوں کی تعداد دو میلین تک پہنچ چکی تھی۔ امریکہ کے ہر ڈیڑھ سو شہریوں میں سے ایک شہری اپنی زندگی جیل میں بسر کر رہا ہے۔ امریکی اقتصاد کا خصوصی حصہ جو اس ملک کی اکثر فضا کو گھیرے ہوئے ہے امیر اور غریب کے گروہوں میں بٹا ہوا ہے اور پچھلے دو عشروں میں یہ شگاف مزید گہرا ہوا ہے۔ پچھلے بیس سالوں میں امریکہ میں امیر لوگ، امیر تر اور غریب لوگ، مزید غریب تر ہوئے ہیں۔ ملکی درآمدات میں اضافے کے باوجود طبقاتی فاصلوں میں اضافہ ہوا ہے جبکہ امریکہ کی قومی اور بین الاقوامی کمپنیوں نے دوسری چھوٹی اور درمیانی کمپنیوں جو امریکی سول سوسائٹی کی حمایت کر رہی تھیں کو اپنے اندر مدغم کرلیا ہے۔ ۱۹۷۹ کی مالیاتی رپورٹ کے مطابق ۱۳ ہزار سے زائد امریکیوں کی آمدنی ایک ملین ڈالر تھی جبکہ ۱۹۹۲ میں یہ تعداد بڑھ کر بتیس لاکھ افراد تک پہنچ گئی۔ اور ۲۰۰۰ء میں یہ تعداد ساٹھ لاکھ ہوچکی تھی۔ ان کے مقابلے میں ان افراد کی تعداد جن کی سالانہ آمدنی بیس ہزار ڈالر سے کم ہے ان کی تعداد دس کروڑ یعنی امریکہ کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ہوچکی ہے۔ ۲۰۰۰ء میں امریکہ کے ایک خاندان کی اوسطاً آمدنی ۳۲ ہزار ڈالر بتائی گئی لیکن تقریباً پانچ فیصد امریکی ایسے ہیں جو ملک کی ۸۰ فیصد دولت کے مالک ہیں۔ پینتالیس فیصد امریکیوں نے اپنی آمدنی کا اضافی حصہ ملکی اور بین الاقوامی شیئر بازاروں میں لگا رکھا ہے اور عالمی اقتصادی اور معاشرتی حالات میں اتار چڑھاؤ کی وجہ سے افراد اور خاندانوں کے اضطراب میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

کیا ۲۰۰۰ء میں امریکہ میں ہونے والے صدارتی انتخابات کا معاملہ جو تقریباً دو ماہ تک بحرانی صورتحال کا شکار رہا ایک اتفاقی اور استثنائی حادثہ تھا یا ایک ایسا سیاسی واقعہ تھا کہ جس کی طرف امریکی اور عالمی توجہ رہی

اور یہی امریکی سول سوسائٹی کے زوال کا طویل اور عمیق سبب تھا۔ ایسا معاملہ جو ملک کی اعلیٰ بیورو کریسی کے حتمی فیصلے کے نتیجے میں جمہوریت خواہ پارٹی کہ جو اکثریت حاصل کرنے میں ناکام ہو چکی تھی کے سربراہ جارج ڈبلیو بش کے حق میں ختم ہوا۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ امریکہ میں ہونے والے انتخابات اور ان کے نتیجہ میں ہونے والی بدنامی دراصل امریکی نظام میں مرئی اور نامرئی بحرانوں کی علامت اور پچھلے پچاس سال یا شاید اس سے زیادہ عرصے سے ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ تھا۔ امریکی سینٹ میں بل کلنٹن کے اُوپر چلنے والے مقدمے سے لیکر انتخابات میں ہونے والی بے قاعدگیوں کے خلاف مظاہروں تک، امریکہ نئے دَور کی ابتدا میں متعدد اور جدید مشکلات کا شکار ہے۔ ایسی مشکلات کہ جن کے اسباب کو اس نظام کے پچھلے کچھ عشروں میں ہونے والی داخلی اور خارجی تبدیلیوں میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔

بلاشک و تردید امریکی صدر، امریکی صدارتی ادارہ، امریکی بیورو کریسی، سیاسی پارٹیاں اور ان سے وابستہ عدالتیں جو انتخابات کے اس بحران میں شریک تھے، اس کے اثرات سے بچ نہیں سکتے۔ امریکہ کے بہت سے شہری اب اس احترام اور جواز کے قائل نہیں جو اِن کے تئیں صدر، کانگریس، عدلیہ، سیاسی پارٹیوں اور میڈیا کے لیے تھا اور پچھلے کچھ عشروں سے سول سوسائٹی کے نظام اور اداروں پر بد اعتمادی اور بدگمانی میں اضافہ ہوا ہے۔ امریکی نظام کی نسبت یہ بدگمانی اور بد اعتمادی امریکی نائب صدر یعنی ایلگور کے بیانات سے واضح نظر آتی ہے۔ ایلگور جو ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے صدارتی امیدوار تھا اور اکثریت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو چکا تھا۔ جس وقت فلوریڈا ریاست کے انتخابات کے نتائج کا اعلان ریاست کے حکومتی افراد نے جارج ڈبلیو بش کے حق میں کیا اس کے ٹھیک دو دن بعد ایلگور نے تمام امریکیوں کے لیے ٹیلی ویژن پر ایک پیغام دیا۔:

"اوباشوں کے مظاہروں کی وجہ سے فلوریڈا کی عوام کے ہزاروں ووٹ گنے نہیں جاسکے اور بہت ساری امریکی عوام اپنے صدر کے انتخاب کے لیے شرکت نہیں کرپائی"۔

امریکہ میں سول سوسائٹی کے بڑے مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ سیاسی ذمہ داروں یا کلی طور پر اس ملک کا سیاسی سسٹم "طاقت" کے بارے میں اپنے روایتی اور قدیمی مفہوم میں تجدید نظر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اگرچہ آج کے سیاسی کھلاڑی مکیاولی کی روش اور طاقت پسندی کی تقلید اور اتباع کرتے ہیں لیکن گذشتہ چند عشروں میں طاقت کے نظریاتی مفہوم اور عملی معنی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی

ہے۔ مغرب کے قرون وسطی، کلاسیکل اور دوران معاصر کے مفکرین کے دعوی کے باوجود "طاقت" میں سیاست کا مرکز ثقل اپنے قدیمی معنی میں نہیں بلکہ سیاست کلی طور پر ایک تہذیبی سرگرمی ہے اور آج کی طاقت کے اصل منابع کچھ یوں ہیں۔ غیر ملموس انفراسٹرکچر (ایمان، اعتقادات، ارادہ، انسانی تعلقات اور معنوی اقتدار) اور ملموس منابع اور انفراسٹرکچر (نظام، اقتصاد، توانائی اور آبادی)۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں امریکہ میں طاقت کے غیر ملموس منابع کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ جنہوں نے وہاں کی حکومتی فرمانروائی کے توازن کو بگاڑ دیا ہے۔

سابق سوویت یونین کے سقوط کے تین سال قبل امریکہ کی ییل یونیورسٹی کے پروفیسر پال کینیڈی نے ایک کتاب "بڑی طاقتوں کا ظہور اور سقوط: ۱۵۰۰ء سے ۲۰۰۰ء تک کی فوجی کشمکشیں اور اقتصادی تبدیلیاں" لکھی جو بہت جلد تاریخی کتابوں کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں شمار ہونے لگی۔ اس امریکی مورخ نے جہاں صرف اقتصادی اور عسکری عوامل کو بیان کیا وہاں سوویت یونین کے ممکنہ سقوط پر اشارہ تک کرنے سے غفلت برتی اور اپنے زیادہ تر تجزیوں کا رُخ ہسپانوی، برطانوی، اور تمام یورپی سلطنتوں کی طرف رکھا۔ لیکن پروفیسر کینیڈی کی کتاب کا آخری پیراگراف جہاں وہ اپنی کتاب کے آخری باب کو "بیسمارک" کے بیان کے ساتھ ختم کرتا ہے، توجہ طلب ہے۔ کینیڈی انیسویں صدی میں جرمنی کے صدر اعظم کے اس بیان کہ "تمام طاقتیں وقت کے ساتھ چلتی ہیں نہ کہ اس کو تخلیق یا کنٹرول کرتی ہیں اور صرف اپنے فنون اور مہارت کے ساتھ ملک چلاتی ہیں" سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ان بڑی قوتوں کا مستقبل واشنگٹن، ماسکو، ٹوکیو اور بیجنگ میں موجود حکومتوں کی دانائی، حکمت اور بصیرت سے وابستہ ہے۔ کینیڈی اس حکمت اور بصیرت کے ابعاد اور علائم کی تشریح نہیں کرتا لیکن اپنی کتاب میں یہ ضروری یاد دہانی ذکر کرتا ہے کہ امریکہ کو اپنے زوال سے بچنے کے لیے چاہئے کہ دوسری بڑی حکومتوں اور سلطنتوں کی طرح دنیا میں اپنی وسعت پسندی سے بچے۔ اس امریکی مورخ کی نصیحت اگرچہ پسندیدہ ہے لیکن اس نے خود نظام اور سوسائٹی کے اندر امریکہ کی بڑی مشکلات پر توجہ نہیں دی۔

تاریخ گواہ ہے کہ عظیم سلطنتیں اپنی شکست و زوال میں سب سے بڑی دشمن خود آپ ہوتی ہیں۔ حکومت روم، ایران، بنو امیہ، عباسی، صفوی، عثمانی، آسٹریا، جارجیا، سزاری اور کمیونسٹ روس، برطانیہ، فرانس اور ہسپانیہ سب نظام کے اندر سے ہی اور بدعنوانی، تکبر اور بے ثباتی کی وجہ سے سقوط کا شکار ہوئیں۔

اگر عباسی خلفاء کا نظام کجرو، منحرف اور سست نہ ہوتا تو کبھی بھی مغل حملہ آوروں کے ہاتھ نہ لگتا اور اسلامی تمدن صدیوں زوال اور کمزوری کا شکار نہ ہوتے۔ امریکن ایمپائر اپنی عسکری برتری کے باوجود ویتنام کی جنگ ہار گئی اور ایران میں پہلوی حکومت امریکہ کی ہر قسم کی حمایت کے باوجود اسلامی انقلابیوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی۔ ۱۹۹۰ء کے اوائل میں صومالی عوام کی مسلح جدوجہد نے امریکیوں کو ذلیل کر کے ملک سے بھگایا اور فلسطین اور لبنان کے مسلمانوں کی بیچتی ، جانبازی اور مقابلے نے ان چند عشروں میں امریکی اور صہیونی خارجہ سیاست کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔

امریکی نظام اور معاشرے کی کمزوری کے اسباب کا ان عوامل میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ملکی صدارت کے احترام اور جواز میں کمی

۲۔ ڈیموکریٹک اور ری پبلکن پارٹی میں انحصار

۳۔ مقنّنہ، مجریہ اور عدلیہ، تینوں اداروں کے فرائض میں تفکیک کے نظریہ میں کمزوری اور سیاسی دھڑے بازیاں۔

۴۔ لوگوں کی روزمرہ زندگی کو بڑی مالی، تجارتی اور تبلیغاتی کمپنیوں کے ذریعے کنٹرول کرنا

۵۔ عمومی افکار کو انفارمیشنل اور کمیونیکیشنل میڈیا سے کنٹرول کرنا

۶۔ گلوبلائزیشن میں امریکیوں کی قومیت پسندی اور اس سے حاصل ہونے والے تناقضات

۷۔ خاندان اور معاشرے میں بگاڑ اور طبقاتی فاصلے میں اضافہ

۸۔ لہو و لعب اور غیر اخلاقی سرگرمیوں میں اضافہ

۹۔ گذشتہ غلطیوں کے باوجود نظام اور سرکردہ افراد کا تکبر اور ہٹ دھرمی

۱۰۔ داخلی اور خارجی معاملات و مشکلات کے حل کے لیے مادیات اور ٹیکنالوجی کی پرستش۔

سالہا سال فردی آزادی، غیر محدود قدرتی وسائل و منابع سے استفادہ، امن و سکون اور دوسرے براعظموں کی پہنچ سے دور رہ کر زندگی بسر کرنا، امریکی نظام کی اہم خصوصیات رہے ہیں لیکن پچھلی نصف صدی میں خاص طور پر گذشتہ چند سالوں میں آبادی میں اضافہ، اجتماعی اور طبیعی ماحول کی آلودگی، زندگی کا مشینی بن جانا، امریکہ کے زیر نفوذ علاقوں سے لوگوں کی عظیم ہجرت، شہروں اور دیہاتوں میں بڑھتی ہوئی ناامنی اور جرائم، مالی اور نسلی تبعیض "Discrimination" اور غیر محفوظ دنیا اور اس سے خوف، یہ سب وہ

عوامل ہیں جنہوں نے امریکہ میں موجود معاشرے کی فکری آسائش اور امن کو غارت کر دیا ہے۔ اس وقت تمام مغربی ممالک سے زیادہ امریکہ میں افراد کی نجی زندگی حکومت کے معلوماتی نظام اور ٹیکنالوجی انفراسٹرکچر کی زد میں ہے۔ ایک ایسا نظام جہاں قومی و ملی دین موجود نہیں۔ سیاست اور اقتصاد سے معنویات کو جدا کر دیا گیا ہو وہاں کے لوگوں کا ملی مذہب "مصرفیت" بن چکا ہے۔

امریکہ میں حکومت اور مارکیٹ ایک سہ پایہ کرسی کے دو پائے بن چکے ہیں لیکن اس کرسی کا تیسرا پایہ جو سول سوسائٹی ہے، اس کے بغیر اس کا استحکام ممکن نہیں ہے اور اسی طرح حکومت اور مارکیٹ (سول سوسائٹی کے بغیر) ایک متحرک اور زندہ امریکہ اور اس کے نظام کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ امریکہ کی جہان کشائی اور اس کا حکومتی نظام امریکہ میں موجود سول سوسائٹی کی کیفیت سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔

جنگ اور اس کے نتیجے میں دوسرے ممالک پر قبضہ امریکی تاریخ اور اس کی قومی خصوصیت رہے ہیں۔ (۱۰۴) اور جس کا قومی اتحاد اور آمادگی میں بھرپور کردار رہا ہے۔ امریکہ کسی بھی دوسرے ملک کی نسبت زیادہ جنگوں اور فوجی مشقوں میں شریک رہا ہے۔ جبکہ تحقیقات اور رپورٹس کے مطابق اس سلسلے میں دوسرا نمبر اسرائیل کا ہے۔ سفید فام امریکیوں کا سیاہ فام کے اوپر برطانیہ اور فرانس کے تسلط کے خلاف جنگ، مرکزی امریکہ میں واقع علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے ہسپانیہ اور مکسیکو کے خلاف جنگ، کیلی فورنیا اور ٹیگزس کی ریاستوں کا شمالی امریکہ کے ساتھ الحاق، امریکہ کی اندرونی جنگیں جن میں ساٹھ لاکھ سے زائد جانیں ضائع ہوئیں، پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں امریکی مداخلت، کوریا، ویتنام جنگ، خلیج فارس جنگ اور اس کے علاوہ یورپ سے ایشیا اور افریقہ سے لیکر لاطینی امریکہ تک دسیوں جنگیں، اسی زمرے میں آتی ہیں اور کیونکہ جنگ بغیر کسی دشمن کے تصور نہیں کی جاسکتی اس لیے امریکہ ہمیشہ کسی نہ کسی دشمن کی جستجو میں رہا ہے اور کسی حد تک اس چیز نے پچھلی صدی میں امریکہ کی نفسیاتی شخصیت کو تشکیل دیا ہے۔ سابق سوویت یونین کے سقوط تک امریکہ کی سب سے بڑی جاری رہنے والی جنگ "سرد جنگ" تھی اور اس کا اصلی دشمن سوویت یونین کا کمیونسٹ نظام تھا۔ سرد جنگ اور کیمونزم امریکی نظام اور اس کی قیادت کے اتحاد کا سب سے بڑا عامل اور امریکہ کے اندر "Motivation" اور رائے عامہ کو کنٹرول کرنے کا بہترین ہتھیار تھے۔ کیمونزم کا عامل سبب بنا کہ عالمی جنگ کے بعد کے عشروں میں ہونے والی امریکہ کے اندر بہت ساری بدعنوانیاں اور جرائم مخفی رہیں۔ ایک ایسا عشرہ جس میں اصلی دشمن کا خاتمہ ہو چکا اور ابھی تک اسلام بھی

اس دشمن کی مکمل طور پر جگہ نہیں لے سکا۔ امریکہ کی اندرونی رقابتیں، دشمنیاں اور اختلافات پہلے سے کہیں زیادہ کھل کر سامنے آئے ہیں۔ پچھلے کچھ سالوں میں جو قدرت طلبی اور سیاسی جماعتوں کا دنگل خاص طور پر کلنٹن کا ٹرائل "Trial" اور 2000ء میں صدارتی انتخابات کا بحران دیکھنے کو ملا ہے، "سرد جنگ" اور سوویت یونین جیسے دشمن کی موجودگی میں ناممکن تھا۔

امریکی سیاست اور تاریخ میں صدر سے زیادہ کوئی بھی عہدہ بلند اور حتی کہ اتنا "مقدس" بھی نہیں۔ کیونکہ ایک قومی، معنوی، دینی جماعت کی غیر موجودگی میں صدر اور اس کا ادارہ قومی قیادت کا ذمہ دار اور مجریہ "Executive" کی صدارت کے عہدہ دار ہوتا ہے۔ مثلاً آئین کے مطابق امریکی صدر، امریکی فوج کا سربراہ اور امریکہ کی خارجہ سیاست کو چلانے والا، کابینہ کا سربراہ اور قومی اسمبلی اور سینٹ میں ہونے والے تمام فیصلوں کے خلاف ویٹو کا حق رکھتا ہے۔ اس لیے وہ امریکی نظام میں بہت اہم کردار کا حامل ہے۔ امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کے صدارتی حلف سے کچھ دیر پہلے امریکی آئین پر دستخط کرنے والوں میں سے ایک فرد تھامس جیفرسن نے امریکہ کی اہم شخصیت جیمز میڈیسن (جو دونوں بعد میں امریکی صدر بنے) کو لکھا کہ مقننہ "legislative" (امریکی کانگریس) کا استبداد ایک ایسا حقیقی اور بڑا خطرہ ہے جس سے ہمیں ڈرنا چاہئے لیکن اپنی باری آنے پر مجریہ "Executive" بھی اس مقام تک پہنچ جائے گی۔

> آئندہ سال آنے والی حکومت میں جیفرسن کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی اور امریکی صدارت طاقت اور استبداد کے جدید دور میں داخل ہو چکی تھی۔ آرتھر سلزینگر مشہور امریکی مورخ اور سابق امریکی مقتول صدر جان، ایف کینیڈی کے مشیر نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اور سرد جنگ کے دوران امریکی صدر کو ایک ایمپائر کے صدر کے نام سے یاد کیا۔

ایمپائر کی صدارت در حقیقت روزویلٹ، ٹرومین، اور آیزنھاور کے ادوار میں امریکی ایمپائر کی وسعت گیری کا نتیجہ تھی۔ لیکن اسی اہم مقام و منزلت نے کینڈی کا قتل، کیوبا پر قبضہ کرنے میں امریکی ناکامی اور اس کے جانشین جانسن کی ویتنام جنگ میں شکست کے بعد استعفی، اور رفتہ رفتہ لیکن مسلسل "واٹر گیٹ" کے نام سے معروف سیاسی جماعتوں کی بدعنوانیاں کہ جن کے نتیجہ میں نیکسن کو استعفی دینا پڑا اور بالآخر کارٹر، فورڈ، ریگن، بش اور کلنٹن جیسے افراد کی سیاسی بدنامیاں اور ایک عظیم شکست دیکھی۔ اسی طرح اس عہدے کو عمومی افکار میں عدم اعتماد سے دوچار ہونا پڑا۔ نومبر ۲۰۰۰ء کے انتخابات میں صدر کی نامزدگی کا طریقہ اور ان کے انتخابات میں مقابلے کی کیفیت اور اس کے ساتھ ساتھ عوام کی رائے کے حصول میں جو بے

قاعدگیاں اور بدنامی کے واقعات سامنے آئے، انہوں نے صدر کے مقام اور اس کی حیثیت کو اور بھی گرا دیا۔ کئی مہینوں تک دونوں صدارتی امیدواروں نے ایک دوسرے سے کوئی بات تک نہیں کی اور کسی بھی باقاعدہ ملاقات سے کتراتے رہے۔ جو گفتگو ہر ڈیموکریسی کے انسانی تعلقات کی اساس ہوا کرتی ہے (صدارتی جنگ) "وائٹ ہاؤس جنگ" میں تبدیل ہو گئی، اور میڈیا نے خاص طور پر ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ان کے اصلی چینلوں نے ان دو گروہوں میں نفسیاتی جنگ کے لیے راستے ہموار کئے۔

بحران ہمیشہ نظام کے اصلی چہرے سے پردہ اُٹھاتے ہیں اور انسانی اور اجتماعی روابط کو برملا کر کے ان کے استحکام کے لیے چیلنج بن جاتے ہیں۔ مغرب میں مطبوعات اور میڈیا سول سوسائٹی کے مہم ترین اداروں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی کارکردگی ہمیشہ سول سوسائٹی کی کیفیت کا نمونہ اور علامت ہوتی ہے۔ فروری ۲۰۰۱ء میں جارج ڈبلیو بش کے حلف لینے اور انتخاباتی جنجال کے ختم ہونے کے بعد مطبوعات، ٹیلی ویژن اور ملک کی نیوز ایجنسیوں کے سربراہوں کو اس سلسلے میں قائم ہونے والے خصوصی کمیشن میں کانگریس کے نمائندوں کے سوالات کے جواب دینے کے لیے دعوت دی گئی تا کہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ میڈیا کی یہ گمراہ کن کوریج انتخابات اور اس میں ہونے والی خلاف ورزیوں میں کتنی موثر رہی ہے۔ ان نشستوں میں مورد بحث اہم مسائل رائے عامہ کو کنٹرول کرنے میں مطبوعات اور میڈیا کا کردار، عمومی افکار کی سنجش کی روش سے حاصل نقصانات، سیاسی اور اقتصادی دھڑوں کے درمیان ناجائز رقابتیں اور کلی طور پر اساسی اصلاحات امریکی میڈیا اور انفارمیشن سسٹم کا لازمہ تھے۔ امریکی جو ہمیشہ دوسروں کو اصلاح طلبی کے نسخے لکھ لکھ کر دیتے ہیں، اپنی سیاسی اور اقتصادی اقدار کو "ڈیموکریسی"، "سول سوسائٹی" اور "پریس کی آزادی" کے سائے تلے دوسروں کے لیے تجویز کرتے ہیں، اس کردار کے ساتھ جو صدارتی انتخابات میں رکھتے ہیں امریکہ پر مسلط میڈیا کے نظام کے آگے سوالیہ نشان ہے۔ دوسرے لفظوں میں جیسا کہ امریکن کانگریس کے اس کمیشن کے مذاکرات سے سننے میں آیا ہے کہ لبرلزم اور ڈیموکریسی کے بغیر جن کی امریکی میڈیا اور پریس نمائندگی کرتے ہیں، ایک انتہائی گہرے اور عمیق بحران کا شکار ہیں اور خود "بنیادی" اصلاحات کے محتاج ہیں۔ امریکہ میں کانگریس یعنی سینیٹ اور قومی اسمبلی کے ارکان جو ملک کی مقنّنہ طاقت کو تشکیل دیتے ہیں، میڈیا اور پریس سے مربوط امور میں کم تر مداخلت کرتے ہیں، میڈیا اور پریس کے اصل مالک امرا، با نفوذ گروہ اور بڑی بڑی کمپنیاں ہوتی ہیں اور بہت سے ارکان کانگریس میڈیا کے مالک یا شراکت دار ہوتے

ہیں لیکن صدارتی انتخابات کے جنجال نے امریکہ کی سول سوسائٹی اور اس کے اداروں پر کاری ضرب لگائی تھی اور بہت سے غیر مرئی اور نیم پنہاں بحرانوں کو آشکار کر دیا تھا۔

امریکی میڈیا اور پریس کا اصلی ہدف سوداگری ہے اور پریس کمپنیاں، براڈکاسٹنگ ایجنسیاں، میڈیا اور تہذیبی صنعتیں اپنی پیداوار کو ایک مصرفی چیز کے عنوان سے دیکھتی ہیں، لیکن اس ہدف کے حصول کے لیے امریکی میڈیا اور پریس سوسائٹی میں تین بنیادی سماجی کام کیے جاتے ہیں:

۱۔ نظام اور اقدار کی ترویج اور اس کا دفاع۔

۲۔ مصرفی اور اقتصادی سرمایہ داری کے امور سے عوام کو معلومات فراہم کرنا، اور انھیں تیار رکھنا۔

۳۔ مذکورہ بالا دو اہداف کے حصول کے لیے لوگوں کے وقت کو زیادہ سے زیادہ اپنے پروگراموں اور مواد میں مشغول رکھنا۔

غیر شفاف، سیاسی بدعنوانیاں اور میڈیا و پریس کی اس جنجال کی غیر مناسب کوریج نے عوام و میڈیا، عوام و نظام اور اسی طرح میڈیا اور نظام کے مابین قائم توازن کو خراب کر دیا ہے۔ امریکی میڈیا اور پریس اپنے ناظرین و سامعین اور قارئین کے روزانہ کے اوقات کو حاصل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ جتنا زیادہ وقت حاصل کریں گے اتنا زیادہ پیسہ کمائیں گے۔ اس کے علاوہ "تفریحی" اور "مصروف رکھنے" والے پروگراموں سے میڈیا اور پریس، سیاسی اور اقتصادی قیادت کے ذریعے سوسائٹی کے سماجی سیاسی نظم کو محفوظ کرتے ہیں۔ امریکی سوسائٹی میں اکثر لوگوں کی روزانہ سرگرمیوں کی اہم علامت ان کو اس قسم کے پروگراموں میں مصروف مشغول رکھنا ہے جو سماجی اتار چڑھاؤ کی شماریات کے ایک حصے کو تشکیل دیتے ہیں۔

امریکہ کے پریس اور میڈیا کے نظام کا ظہور، زوال اور استحکام، اقتصادی اور سیاسی وابستگی کے موڑ سے گزر رہا ہے۔ مثال کے طور پر، ٹیلی ویژن پر سے عوام کا اعتماد کا اٹھنا اور گروہی چینلز کی نسبت اُن کی بدگمانی سے سامعین، ناظرین اور قارئین کی تعداد میں کمی آئی ہے اور عوام کی اکثر تعداد کی توجہ ان دوسرے وسائل کی طرف بڑھ گئی ہے جن کا کنٹرول کمتر ہے اور یہ خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔ مخاطبین کی تعداد اور ان کی زمانی اور اجتماعی کیفیت، اشتہار دینے والی کمپنیوں اور مالی اقتصادی ایجنسیوں اور مصنوعات کی نسبت آشنائی کی تنہا علامت ہے کہ یہ کمپنیاں اور ایجنسیاں امریکہ میں موجود تمام چینلوں کی ۹۹ فیصد کمائی اور منفعت کو تشکیل دیتی ہیں۔ دوسری طرف پریس کی طرح، ٹیلی ویژن کی بااثر شخصیات عوام تک اپنی رسائی

اور افکار و نظریات پر کنٹرول کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اور کانگریس کے اراکین، سیاسی دلال اور کھلاڑی ٹیلی ویژن چینلز اور پریس و میڈیا کی بااثر شخصیات کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اپنی سیاسی اور انتخاباتی ساکھ بناتے ہیں۔ امریکی انتخابات کی کوریج کے حوالے سے تشکیل دیے جانے والے کمیشن کے محرک کو انہیں کے تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ اس پر تعجب بھی نہیں کہ اس کمیشن کی ابتدائی چند نشستوں جن میں میڈیا اور پریس کے مدیر حضرات بھی موجود تھے، کمیشن کے ارکان اپنے گناہوں کے اعتراف اور ملک کے سیاسی معاملات اور میڈیا میں "اصلاحات" مجبور ہوگئے۔ انہوں نے عوام کے اعتماد کو حاصل کرنے اور نامساعد حالات کو تبدیل کرنے کے لیے مشترکہ طور پر اپنی پالیسیوں، تعصّبات، انتخابات کے متعلق خبروں اور اس کی نامناسب کوریج پر افسوس کا اظہار کیا۔

ٹیلی ویژن چینلز اور میڈیا کے سربراہ حضرات کا کانگریس کمیشن کی ان نشستوں میں اظہار خیال کا جائزہ بہت سبق آموز ہے۔ مثال کے طور پر اس سوال کے جواب میں کہ امریکی صدارتی انتخابات کے نتائج کی میڈیا کوریج کو آپ کس طرح سے دیکھتے ہیں؟ اس کے جواب میں نشست کے جنرل سیکریٹری اور امریکہ کے تین بڑے ٹیلی ویژن چینلز میں سے ایک کے مالک نے بلاتامل جواب دیا: "گند پھیلانا"! کانگریس کمیشن کو رپورٹ پیش کرتے ہوئے ایک دوسرے چینل کے نیوز ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ نے کچھ یوں اظہار خیال کیا؛

> "صدارتی انتخابات سے مربوط خبریں تیار کرنے کے حوالے سے ہمارا گناہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے جتنا یہاں بیان کیا جارہا ہے۔ ہم نے امریکی عوام کو ووٹنگ مشینوں کے نقائص اور انتخابات میں شرکت کے موانع سے باخبر نہیں کیا اور نہ ہی اس پر کوئی توجہ کی۔ سب جانتے ہیں کہ انتخابات میں شرکت کے لیے سب کو برابر حقوق حاصل نہیں اور اس میں اقتصادی، نژادی قومی اور طبقاتی عوامل دخیل ہیں۔ انتخابات کے لیے صرف نام درج کر دینا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس شخص کو انتخابات میں شرکت اور حق رائے دہی بھی دے دیا گیا ہے۔"

عوام کے اعتماد کو حاصل کرنے کے لیے کانگریس اور ان اداروں کے پبلک ریلیشن ایکسپرٹس کی جانب سے انتہائی دقت کے ساتھ پریس و میڈیا کے اعترافات اور اپنی غلطیوں پر عذر خواہیوں کا یہ پروگرام تیار کیا گیا تا کہ عمومی افکار کو رام کیا جا سکے اور دوسری طرف یہ چیز بھی ہلا دینے والی ہے کہ امریکی پریس اور میڈیا اپنے تمام سیاسی اور اقتصادی تعصّبات کے ساتھ نیوز کوریج کی خودسر سیاست کو انٹرنیشل ریلیشنز اور تمام ممالک کے حوالے سے تکرار کر رہا ہے. بجائے اس کے کہ اس کے مقابل عمومی افکار کے جوابدہ ہو۔

آج امریکی نظام ایک ایسے معتبر اور مستقل قومی مقام سے خالی ہے جو معنوی اور سیاسی حیثیت رکھتا ہو اور گروہوں اور پارٹیوں کے درمیان اختلافات اور جھگڑوں میں ثالثی کرسکے، اور یہ وہ قیمت ہے جو امریکی سول سوسائٹی اور تمام سیکولر اور معروف معاصر نظاموں نے ادا کی ہے اور اس کا یہی حق بنتا ہے۔ نیکسن اور کلنٹن کے دور میں امریکی انتخابات کا بحران اور وائٹ ہاؤس سیکنڈل میں بنیادی طور پر دو گروپ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے پروگراموں میں کم تر نظر آئے۔ ایک مذہبی رہنماؤں کا گروپ، کیونکہ وہ امریکی نظام میں کوئی واضح اثر ورسوخ نہیں رکھتے اور دوسرا بڑے بڑے سرمایہ داروں اور بڑی بڑی مالی اور تجارتی کمپنیوں کے مالکوں کا گروپ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو اصل طاقت رکھتے ہیں اور سیاسی کھلاڑی اور دلال انہیں کی حمایت اور رہنمائی سے سیاست کی آغوش میں پناہ لیتے ہیں۔

امریکی ڈیموکریسی میں مجریہ، مقنّنہ اور عدلیہ میں جدائی اور استقلال حکومت اور نظام کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے لیکن عملاً ان تین ستونوں پر دو منحصر پارٹیوں نے مل کر قبضہ کیا ہوا ہے اس طرح سے کہ فیڈرل گورنمنٹ سے لیکر اسٹیٹ گورنمنٹ اور سنٹرل گورنمنٹ تک، صدارت اور وزارت خانوں سے لے کر کانگریس (سینٹ اور قومی اسمبلی) تک ڈیموکریٹک پارٹی اور ری پبلکن پارٹی نے امریکی بیوروکریسی کے نوے فیصد عہدوں کو اپنے اختیار میں لے رکھا ہے۔

ان دو پارٹیوں سے ہٹ کر مجریہ، مقنّنہ اور عدلیہ میں کسی بھی قسم کی سرگرمی، شرکت اور فیصلہ سازی بہت مشکل اور کم پائی جاتی ہے۔ امریکی نظام میں ان دو پارٹیوں کی آئیڈیالوجی کے دائرے سے باہر کسی بھی قسم کی سرگرمی اور طاقت کا اظہار ایک قسم کا سیاسی ارتداد شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں ایڈلی اسٹیونسن (ڈیموکریٹک پارٹی کے مفکر) کی ناکامی ہو یا اسی پارٹی کے مگ گاروین کی ۱۹۶۰ء میں شکست اور برطرفی، ری پبلکن پارٹی کے قومی اسمبلی میں رہنما گینگریچ کا بل کلنٹن کی صدارت کے ابتدائی ایام میں استعفا ہو یا نیکسن کے سابق مشیر ٹورڈ بوکنن کا اس سال کے صدارتی انتخابات سے پیچھے ہٹنا، یہ سب امریکی پارٹی نظام کے آئیڈیالوجیکل کمزوریوں کی مثالیں ہیں۔ امریکہ کے سیاسی سسٹم میں کبھی سوشلسٹ، کیمونسٹ، ترقی پسند اور یورپی طریقہ رکھنے والے لبرلسٹ حکومت اور اقتدار تک نہیں پہنچ سکتے۔ امریکی عدلیہ ریاستی (مقامی) اور فیڈرل (مرکزی) ہے۔ ریاستی اور مقامی عدالتوں کے جج اس ریاست کے آئینی، انتخابات کے ذریعے اور بہت سے مقامات پر اس ریاست کے گورنر کے توسط سے تعینات ہوتے ہیں اور عام طور پرً

امریکہ کی ان دو پارٹیوں میں سے ایک کے رکن ہوتے ہیں۔ فیڈرل گورنمنٹ میں تمام عدالتوں، من جملہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کو امریکی صدر متعین کرتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جج امریکی سینٹ کی حمایت بھی حاصل کریں۔ اس طرح سیاسی پارٹیوں نے عدلیہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر حکومت کے اس رکن کو استقلال کے کم ترین درجے تک پہنچادیا ہے۔ صدارتی الیکشن میں ووٹوں کی دوبارہ گنتی کا جائزہ لینے والی سپریم کورٹ کے نو ججوں میں سے سات جج (جارج ڈبلیو بش کو صدارتی امیدوار نامزد کرنے والی) ری پبلکن پارٹی کے صدور نے اور دو جج ڈیمو کریٹک پارٹی کے صدور نے متعین کئے تھے۔ فلوریڈا ریاست کی ہائی کورٹ کے جج جنہوں نے ایلگور کے حق میں اور چند ریاستوں میں ووٹوں کی دوبارہ گنتی کا حکم صادر کیا تھا ایک جج کے علاوہ باقی سب کو ڈیمو کریٹک پارٹی نے متعین کیا تھا۔ حالانکہ فلوریڈا ریاست کے گورنر اور وزیر داخلہ نے جارج ڈبلیو بش کو فاتح قرار دیا، یہ دونوں جمہوری پسند پارٹی کے رکن تھے۔ (فیڈرل) سپریم کورٹ کے جج امریکی نظام میں عدلیہ کے سب سے بلند عہدہ اور مقام کے حامل ہوتے ہیں اور سیکولر سسٹم کے ماہرین کی حیثیت سے آئین، کانگریس کے مصوّبات، قوانین اور ملکی عدالتی اختلافات کی تفسیر اور ان میں تغییر و تبدیلی کا حق رکھتے ہیں۔ ان کی رائے کو تمام ریاستی ہائی کورٹوں پر ترجیح دی جاتی ہے اور ان کی رائے کو حرف آخر کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک امریکہ کے عرفی سسٹم کا تعلق ہے، کیونکہ آئین سے اوپر کوئی مرجع یا شرعی اصول موجود نہیں اور تمام قوانین سیاست اور معاشرے سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد کے بنائے ہوئے ہیں، لہٰذا "فیڈرل" سپریم کورٹ ہی تمام عام قانونی اقدار کی مجتہد اور تعیین کنندہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "Racial Discrimination" یا نسلی جانبداری، ملکی سپریم کورٹ کے فیصلے سے ۱۹۵۴ء میں قانون کی شکل اختیار کر گئی۔ آزادی اور اجتماعی مسائل کا قانونی یا غیر قانونی ہونا جیسے حمل گرانا "Abortion"، جوا، الکوحل ملے مشروبات، اسی طرح امریکہ میں انفرادی آزادی اور معاشرتی یا اجتماعی مساوات وقت اور جگہ کے حساب سے تبدیل ہوتے ہیں اور یہ سب امریکی صدر کے من پسند، تعیین کردہ ججوں کے رجحانات اور اختیارات میں ہوتا ہے۔ امریکہ میں یہ دونوں پارٹیاں کیپٹلزم (سرمایہ دارانہ نظام) کی عامل اور نمائندہ ہیں۔ اور ملک کی با اثر اور سرمایہ دار سیاسی اور تہذیبی شخصیتوں اور بڑی بڑی تجارتی، صنعتی اور اطلاعاتی کمپنیوں کی زیر اثر ہیں۔ دونوں پارٹیاں سیاسی دلالوں کے ایک محدود اور مخصوص گروپ کے توسط سے چلتی ہیں۔ اور ۹۹ فیصد عوام ان دو پارٹیوں کے ساتھ ظاہری لگاؤ کے علاوہ ان کی

پروگرامنگ، کارکردگی اور سیاسی شراکت میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کرتے۔ یہ پارٹیاں کسی کو رکنیت کا کارڈ جاری نہیں کرتیں اور کوئی فرد بھی ممبر شپ فیس ادا نہیں کرتا۔ ان پارٹیوں کا انتخابات کے ایام کے علاوہ، کوئی دفتر یا عمارت نہیں۔ امریکہ کی عوام یہ بھی نہیں جانتی کہ اس کا جنرل سیکریٹری کون ہے؟ اس کی ادارتی کونسل اور خصوصی کمیٹیوں کے ارکان کون ہیں؟ امریکی عوام کے لیے یہ دونوں پارٹیاں دو ایسے سیاسی معاملے ہیں جو ذاتاً نامرئی اور ناقابل دید ہیں لیکن ظاہراً سرگرم ہیں اور عام انتخابات عمومی افکار کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف اپنے جھکاؤ کا اظہار کریں ورنہ ووٹ کاسٹ کرنے سے باز رہیں۔ پچھلے پچاس سال سے امریکی عوام اپنے آپ کو ان دونوں سے جدا "یعنی مستقل" ہونے کا راگ الاپ رہے ہیں لیکن عملی طور پر ان کے لیے ان دو پارٹیوں میں کسی ایک کے امیدوار کو منتخب کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ ان دونوں پارٹیوں میں کوئی واضح فرق موجود نہیں اگرچہ دونوں پارٹیوں میں "لبرل"، "معتدل" اور "کنزرویٹو" دھڑے موجود ہیں۔ امریکی خارجہ سیاست میں دونوں متحد ہیں۔ صرف داخلی اور بالخصوص تعلیم، ہنر، صحت، ٹیکس اور سوشل سیکیورٹی کے معاملات میں ریاستی اور فیڈرل حکومتوں میں اختلاف رائے رکھتی ہیں۔ گذشتہ چند عشروں میں امریکی عوام اس انحصار اور پارٹیوں کی بدعنوانیوں کی وجہ سے ان دونوں پارٹیوں سے بدگمان ہو چکی ہے اور پچھلے کچھ سالوں میں ایک نئی پارٹی یا موجودہ نظریاتی ماحول سے خارج کسی تیسری پارٹی کی تشکیل کے لیے کوششیں بڑھی ہیں۔ لیکن وہاں کا سیاسی سسٹم اس قسم کی جدوجہد کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے اور سیاسی آزادی کی ہر کوشش کو شکست سے دوچار کیا گیا ہے۔ دو سال قبل عوام کی ان دو پارٹیوں سے ناراضگی اپنے عروج تک جا پہنچی یہاں تک کہ عوام نے مینوسوٹا ریاست کے گورنر کے انتخابات کے لیے "مستقل" امیدوار جو ایک پروفیشنل ریسلر ہونے کے علاوہ ٹیلی ویژن میں کرتب بھی دکھاتا تھا، اکثریتی رائے کے ساتھ چار سال کی مدت کے لیے اسے منتخب کیا۔

خود مغرب میں سیاسی پارٹیاں جو نسبتاً ایک جدید دریافت تھیں، ان کی تاریخ بہت مختصر ہے۔ ہینری سینٹ جان اور ریسکونٹ باولنگ بروک جیسے برطانوی مفکرین کے نزدیک سیاسی پارٹیاں ایک "سیاسی شیطنت" ہیں۔ ان کے نزدیک آرگنائزیشن آزادی اور ڈیموکریسی کو تباہ کر دیتی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے صرف ایک مغربی مفکر ایڈمونڈ بورک (۱۷۹۷ء-۱۷۲۹ء) سیاسی پارٹیوں کی تنظیم کو ڈیموکریسی کا لازمہ جانتا تھا اور کئی سال گزر جانے کے بعد لوگ اس کے عقائد سے آشنا ہوئے (۱۰۵)۔ ہماری نظر میں

مغرب میں سیاسی جماعتوں کا قیام عمومی افکار کو کنٹرول کرنے، آبادی کے بڑھنے اور شہروں کے صنعتی ہونے اور سیاسی سرکردہ افراد کی حکومت کے لیے عمل میں آیا ہے نہ کہ ڈیموکریسی یا عوامی نمائندگی کے لیے۔ امریکہ میں جہاں سب سے پہلے سیاسی پارٹیوں کی نشوونما ہوئی ہے وہاں کے آئین لکھنے والوں نے ان پارٹیوں کا نام تک نہیں لکھا۔ امریکی سیاست کے معمار جارج واشنگٹن نے ۱۷۹۶ء میں سیاست سے کنارہ کشی کی الوداعی تقریب میں امریکی عوام کو خبردار کیا کہ "جہاں تک ممکن ہوسکے سیاسی پارٹیوں کے اثرات کا ڈٹ کا مقابلہ کریں"۔ امریکہ کے ابتدائی صدور میں سے تھامس جیفرسن جو درحقیقت ریپبلکن پارٹی (جو بعد میں ڈیموکریسی کی جماعت بن گئی) کا معمار تھا، شروع شروع میں سیاسی پارٹیوں کے پھیلاؤ کا مخالف تھا۔ آج اسلامی ممالک من جملہ اسلامی جمہوری ایران میں بغیر سوچے سمجھے سیاسی پارٹیوں کی تشکیل کی باتیں ہورہی ہیں اس قسم کے سسٹمز کی حمایت ہورہی ہے۔ بہتر ہے پہلے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھیں کہ سیاسی آرگنائزیشن بنانے کیلئے خاص طور پر ایک اسلامی تہذیب رکھنے والے معاشرے میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا عاقلانہ اور مضبوط طریقہ موجود نہیں؟

امریکی آبادی کے اجتماعی اور اقتصادی انفراسٹرکچر میں پچھلے دس سالوں میں بہت واضح تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ امریکہ بہت سے غیر ملکیوں، سرمایہ داروں اور دوسرے افراد کی کثیر دولت کے ذخیرہ کا ایک خیالی قلعہ بن چکا ہے۔ جاپانی، عرب، ایرانی، یورپی، لاطینی امریکہ، افریقہ اور بیسیوں دوسرے گروہ جن میں بعض گرین کارڈ اور بعض بغیر گرین کارڈ کے اس سرزمین کی ظاہری چکاچوند سے متاثر ہوچکے ہیں، ان سب کی امریکہ سے وفاداری کی واحد وجہ کسی بھی غیر متوقع آنے والے دن کے لیے ہیں۔ کئی ملین کی تعداد میں کیوبن، ویتنامی، کورین، چینی، فلپائنی، حبشی، ایرانی، لاطینی امریکی، میکزکن، افریقی، روسی، ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی، مشرقی اور جنوبی یورپی باشندے امریکہ کی ان کے ممالک میں فوجی مداخلت یا ان ممالک میں امریکہ کے منظور نظر سسٹم کی شکست کے بعد امریکہ میں ساکن ہوئے ہیں۔ ان کو ظاہری اور مالی زندگی کے علاوہ، اس نظام کے حوالے سے کوئی گہری ذمہ داری اور وفاداری نہیں ہے۔ یہ درحقیقت ماڈرن سیاسی اور اقتصادی گلوبلائزیشن کا حصہ ہیں جو گذشتہ نسلوں اور مہاجروں میں موجود نہیں تھا۔ اس وقت امریکہ میں علمی، صنعتی، اطلاعاتی اور انجنیرنگ کے ڈپارٹمنٹس میں تکنیکی طور پر کام کرنے والے پندرہ فیصد لوگ مہاجرین ہیں جو پیدا تو کسی دوسرے ملک میں ہوئے لیکن یہاں آکر ساکن ہوگئے۔ امریکہ

کے ۲۰ فیصد ڈاکٹر، ۱۵ فیصد انجینئر۔ ۱۲ فیصد نرسیں، ۲۰ فیصد ریاضی دان، ۱۶ فیصد فزکس کے محقق اور دانشور اور ۱۸ فیصد استاد غیر ملکی افراد ہیں۔ خود مسلمانوں کی تعداد گذشتہ عشرے میں دوگنی ہو چکی ہے اور تقریباً ۱۰ ملین مسلمان امریکہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور آمدنی، تعلیم اور تکنیکی شعبوں میں متوسط امریکیوں سے زیادہ ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ سلطنتی نظام کی آبادی ہمیشہ مختلف قوموں اور تہذیبوں سے ہی تشکیل پاتی ہے۔ اور امریکہ کا موجودہ سسٹم بھی اس سے الگ نہیں لیکن وہ چیز جو ایک سلطنت میں تہذیبوں کے مابین باہمی مفاہمت اور ارتباط کا باعث بنتی ہے اس ایمپائر کی بقا کے لیے بہت مہم ہوتی ہے۔ روم، مشرقی روم، سپین، بنی امیہ، بنی عباس اور سلطنت عثمانی جیسی سابق سلطنتوں کے مشترک عوامل میں سے ان کا مذہب اور عقائد تھے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی سلطنتوں میں قومیت، آئیڈیالوجی، زبان اور نسل جیسے عوامل سب سے زیادہ ظاہر ہوئے۔ امریکی سلطنت کا اصلی عامل اور مشترک مورد اس کا مکمل طور پر مادی، اقتصادی، مالی اور تکنیکی ہونا ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ یہ مادی، تکنیکی اور عسکری انفراسٹرکچر کس قدر اس سلطنت کی بنیادوں کو مستحکم کر سکتا ہے؟ وفاداری اور ایثار جیسے جذبے اس قسم کے نظام میں کس جہت، کس کیفیت اور کن شرائط کے تحت تبدیل ہوتے ہیں؟ خلاصہ یہ کہ امریکہ کی جدید سول سوسائٹی اکیسویں صدی میں کس طرح تشکیل پائے گی اور سول سوسائٹی کے اداروں میں ہونے والی تبدیلیاں کن نئے مسائل اور تبدیلیوں پر منتہی ہوں گی؟

آج کی مغربی "اطلاعاتی" اور "سول" سوسائٹیوں میں پائے جانے والے اندرونی بحرانوں اور تناقضات کا نسلی، مذہبی اور قومی گروہوں کی بغاوتوں اور مظاہروں اور "اکثریت" کے عکس العمل کے نتیجے میں کچھ عرصہ قبل پیش آنے والی معاشرتی تبدیلیوں میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء میں واشنگٹن میں گذشتہ کئی عشروں کی نسبت سب سے بڑے مذہبی اور سماجی اجتماعوں کا شاہد ہے۔ کئی لاکھ افراد اور واشنگٹن پوسٹ کے اندازے کے مطابق امریکہ کی مختلف ریاستوں سے مختلف عیسائی مکاتب سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں افراد، پانچ لاکھ مرد (نہ عورتیں) امریکہ کے دار الخلافہ میں اکٹھے ہوئے تا کہ اس معاشرے کو درپیش اجتماعی ادروں کے بحرانوں اور خاندانوں کے درمیان ٹوٹ پھوٹ کا اعلان و اعتراف کر سکیں۔ اپنے گناہوں سے توبہ اور احیاء معنویت کے لیے حضرت عیسیٰ مسیح سے مدد طلب کر سکیں۔ اجتماع میں شرکت

کرنے والوں کی اکثریت امریکی سفید فام اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی تھی جو زیادہ تر کنزرویٹو تھے، امریکہ میں عظیم مادیت پرستی اور معاشرتی بگاڑ اور اس کے علاوہ امریکہ میں موجود مختلف اجتماعی گروہوں میں ہونے والی تبدیلیوں سے نالاں تھے اور وہ خاندانی استقلال، اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے کانگریس کی عمارت کے سامنے ایک وسیع علاقے میں جمع ہوئے تھے۔

یہ اجتماع کئی جہات سے دلچسپ ہے۔ گذشتہ عشروں میں واشنگٹن متعدد بڑے بڑے قومی، سیاسی حتی تفریحی اور تفننی جلوسوں کا عینی شاہد رہا ہے لیکن یہ اجتماع گذشتہ دو سالوں میں ہونے والا دوسرا بڑا مذہبی اور پچھلے چالیس سالوں میں ہونے والا تیسرا سب سے بڑا دینی و سیاسی اجتماع تھا۔ اس سے دو سال قبل (۱۹۹۵ء) میں امریکہ کے سیاہ فام مسلمان آبادی کے راہنما لولیس فراخان نے اپنے "ملین مارچ" کی واشنگٹن میں کال دی۔ چند عشرے قبل امریکہ کے سیاہ فام افراد کی تحریک کے سربراہ اور عیسائی روحانی پیشوا مارٹن لوٹر کنگ نے اپنے ہم نژاد افراد کی آزادی اور حقوق کے لیے واشنگٹن میں عظیم مذہبی و سیاسی مظاہروں کا انعقاد کیا۔ تینوں مظاہروں کا ہدف ایک عادلانہ اور معنوی معاشرے کے قیام کی جستجو تھا۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ۱۹۹۷ء میں ہونے والے اجلاس میں اس کے قائدین کی طرف سے صرف مردوں کی شمولیت کو ضروری قرار دیا گیا تھا؛ تا کہ امریکی معاشرے میں آج کے مرد کی خاندانی ذمہ داریوں کو روشن و واضح کیا جائے۔ تینوں مظاہرے ایک سالم معاشرے کی بات کرتے تھے۔ امریکی نظام میں ایک ایسے معاشرے کہ جہاں دین کا سیاست سے دور رہنا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ گذشتہ کچھ سالوں میں مذہبی قائدین اور کلیسا کے روحانی پیشواؤں کی سیاست میں مداخلت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جس کی اس صدی میں مثال نہیں ملتی اس مداخلت کے ساتھ ساتھ انہوں نے حکومتی پالیسیوں کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا ہے۔ مختلف مذہبی اور غیر دینی طاقتوں کا سماجی مسائل میں اختلاف نظر حتی بعض مقامات پر باہمی تنازع تک نوبت پہنچ چکی ہے۔ امریکی سول و انفارمیٹو سوسائٹی جہاں انسانی قوانین اور انٹرنیٹ اور الیکٹرانک کیمونیکشن کے لیے ضروری تھا کہ وہ انسانی، انفرادی، گروہی اور حکومتی بنیاد بنتے، ان دنوں وہاں روایت اور معنویت کی طرف لوٹنے کی بات ہو رہی ہے۔ لیکن اہم چیز یہ ہے کہ اس روایت اور معنویت کا منبع اور اس کی نوعیت کا سرچشمہ کیا ہے؟ اور اس کی آبیاری کہاں سے ہو رہی ہے؟ ۱۹۹۷ء میں واشنگٹن میں سفید فام عیسائیوں کا مظاہرے میں آنا

اور اسی طرح سیاہ فام کے ملین مارچ کا جواب دینے کے لیے اور امریکی سیاسی اور اجتماعی میدان میں بھرپور توجہ کے اظہار کے لیے تھا۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں پلورلزم اور مذہبی تنوع معمول اور ایک سیاسی منشور ہے وہاں گذشتہ سالوں میں مختلف ادیان سے تعلق رکھنے والے مہاجرین کی تعداد میں اضافے نے امریکی معاشرے (کہ جس میں اکثریت عیسائیوں کی ہے) میں جدید مسائل کو جنم دیا۔ دوسری طرف مادیت پرستی کی روز افزونی، "آزادی نسواں" کے حامیوں کی بڑھتی سرگرمیوں اور مختلف فرقوں اور مذاہب کی کثرت نے امریکی معاشرے کے توازن کو خراب کر دیا ہے اور جدید نفسیاتی اور اجتماعی تناقضات کو جنم دیا ہے۔ یہ بات باعث تعجب نہیں کہ گذشتہ کچھ سالوں میں بعض امریکی اہل قلم و اہل سخن کا ہدف امریکی معاشرے کو معنوی بنانا بن چکا ہے۔ ۱۹۹۷ء کی سب سے زیادہ فروخت ہونی والی کتابوں میں سے ایک کتاب "امریکہ کی شفا" جو موجودہ معاشرتی صورت حال پر تنقید کرتی ہے، اس قسم کے معاشرے کے لیے معنویت ہی کو تجویز کرتی ہے۔ یہ پر امن مذہبی اور اجتماعی تحریکیں ایک ایسے وقت امریکی میں معاشرے میں تشکیل پا رہی ہیں جب امریکہ کے اکثر حکومتی اور بااثر افراد اپنی بدعنوانیوں، قانونی شکنیوں کی وجہ سے عدالتوں، کانگریس، میڈیا اور عوام کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔

امریکہ کی موجودہ آبادی میں مسلمانوں کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ، ایک اہم مسئلہ ہے۔ امریکہ کے سرکاری اور قومی اندازے کے مطابق اسلام دوسرے مذاہب کی نسبت سب سے زیادہ تیز رفتاری سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں مسلمانوں کی تعداد میں ۸۰ فیصد اضافہ ہوا اور اس وقت تقریباً ۱۰ ملین امریکی مسلمان ہیں۔ معاشی سطح پر مسلمان متوسط و بالا طبقے میں ہیں اور امریکہ میں جدید اقلیتوں کی نسبت اکثر مسلمان کام اور آمدنی کے لحاظ سے تکنیکی، صنعتی، تجارتی کاموں اور ملازمت کرنے والے طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔ مساجد اور مسلمانوں کے تعلیمی اداروں نے گذشتہ چند سالوں میں حیران کن اور موثر ترقی کی ہے۔ ۲۰۰۱ء میں پورے امریکہ میں مسلمانوں کی چودہ سو سے زائد مساجد اور سماجی و تہذیبی مراکز موجود تھے۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی امریکی معاشرے میں ہونے والی موجود اور آئندہ تبدیلیوں میں ضرور موثر ہوگی۔ (امریکہ اور کینیڈا) سے تعلق رکھنے والی مسلمانوں کی مختلف تنظیموں کے سالانہ اجلاس میں گذشتہ چند سالوں میں تیس ہزار سے زائد افراد نے شرکت کی۔ امریکہ میں ہونے والی مختلف علمی اور تخصصی کانفرنسوں اور علمی نشستوں میں

شرکت کرنے والے افراد کی تعداد معمولاً ایک سے دس ہزار ہوتی ہے اور اسلامی نشستوں اور کانفرنسوں میں شرکت کرنے والے ان افراد کی تعداد دوسرے گروہوں سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

یورپی ممالک میں مسلمانوں کی آبادی، شمالی امریکہ سے کئی گنا زیادہ مفکر ہے، کیونکہ فرانس، انگلینڈ، ہالینڈ اور جرمنی میں رہنے والے پیروان اسلام مسیحیت کے بعد دوسرے سب سے بڑے مذہبی گروہ مانے جاتے ہیں۔ اور اگر تمام یورپین مسلمانوں اور مشرقی اور مرکزی یورپ کے علاقوں کے مختلف اسلامی معاشروں اور خاص طور پر بیلکان کو بھی شامل کیا جائے تو اس وقت "یورپی معاشرے" یا "یورپی یونین" کے مقابلے میں ایک اسلامی سوسائٹی یا معاشرے کو زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔ لیکن امریکہ اور یورپ میں سول سوسائٹی کے مستقبل میں مسلمانوں کا کردار ان کے سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی اتحاد اور فارمیشن "Formation" پر منحصر ہے۔ پلورلزم اور سماجی شراکت کے حوالے سے مغربی دعوؤں کے باوجود مغربی سول سوسائٹیاں ان کے سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی نظاموں کی طرح عیسائیت اور یہودیت کے تسلط میں ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے باوجود ان کا ان دونوں براعظموں کے مقنّنہ، مجریہ اور عدلیہ میں کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ مثال کے طور پر امریکی کانگریس (سینٹ اور قومی اسمبلی) میں ۷۰ فیصد پروٹسٹنٹ اور کیتھولک عیسائی ہیں اور ۲۵ فیصد یہودی۔ اور باقی پانچ فیصد کوئی خاص دینی یا مذہبی شناخت نہیں رکھتے۔ امریکہ میں کوئی بھی مسلمان، بدھ یا دوسرے موجود مذاہب سے تعلق رکھنے والا آج تک مقنّنہ میں منتخب نہیں ہوا۔ ۱۹۶۰ء یعنی جان ایف کینڈی کے امریکی صدر منتخب ہونے تک تمام کے تمام امریکی صدر پروٹسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور امریکہ میں کسی کیتھولک صدر کے انتخاب کے حوالے سے بہت زیادہ تعصب پایا جاتا ہے۔

اگر امور مملکت اور سیاست سے آگاہی اور عام انتخابات میں شرکت کو ایک سول سوسائٹی کے اہم موثر عوامل میں شمار کیا جائے تو مغرب میں ان عوامل میں کوئی واضح ترقی نہیں ہوئی۔ ۲۰۰۰ء میں امریکہ میں ہونے والی ایک نیشنل پولنگ نے ظاہر کیا کہ ۱۶ سے ۲۲ سال تک عمر کے ایک تہائی امریکی جوان اس وقت کے صدارتی امیدوار کے نام اور شناخت سے ناواقف ہیں اور اس عمر کے ۷۵ فیصد امریکی جوان اس بات سے کہ کوئی امریکی نائب صدر کے لیے امیدوار ہے مکمل طور پر نا بلد ہیں۔ امریکہ کے سرکاری ذرائع کے مطابق گذشتہ انتخابات سب سے کم شرکت کرنے والے افراد یہی ۱۸ سے ۲۵ سال تک کی عمر کے نوجوان تھے نو مبر

۲۰۰۰ء کے صدارتی انتخابات میں شرکت کرنے کے ۵۰ فیصد اہل افراد نے اپنے حق رائے دہی کو استعمال نہیں کیا۔ ریپلکن پارٹی کے نامزد امیدوار جارج ڈبلیو بش اور ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار الگور، دونوں ۲۳ فیصد عوام کے ووٹ حاصل نہ کرسکے۔

۱۹۹۶ کے صدارتی انتخابات میں صرف ۴۷ فیصد افراد نے انتخابات میں شرکت کی اور صدر بل کلنٹن صرف ۲۹ فیصد کے ووٹوں سے امریکی صدر منتخب ہوئے امریکی کانگریس کے حالیہ انتخابات میں ووٹ دینے والے افراد میں ۳۶ فیصد کمی آئی ہے۔ انتخابات میں عوام کی شرکت کے حوالے سے امریکہ مغربی ممالک میں بہت نیچے ہے۔ پچھلے بیس سال میں یورپی ممالک ووٹ دینے کے اہل افراد کی شرکت اوسط ۶۰ فیصد، ایران میں تقریباً ۷۰ فیصد اور جنوبی اور مشرقی ایشیا اور جنوبی امریکہ میں یہ اوسط ۵۰ سے ۶۵ فیصد تک تبدیل ہوتی رہی ہے۔

۱۹۵۰ء کے عشرے میں امریکی لوگ سیاسی پارٹیوں کو اپنی عبادت گاہوں کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان دو میں سے کسی ایک پارٹی سے وابستگی یا وفاداری ایک قسم کی مذہبی اور قبائلی وفاداری ہوا کرتی تھی۔ جنرل آیزن ہاور سے لیکر جارج ڈبلیو بش تک نو صدور کے عام انتخابات کے چالیس سال سے زیادہ کے دور کا ہم نے واشنگٹن کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ سب سے پہلا امریکی سیاستدان جس سے ہم نے گفتگو کی، ریاست کیلی فورنیا کی گورنری کے لیے ڈیموکریٹک پارٹی کے نامزد امیدوار ایڈمند براؤن تھے۔ یہ ۱۹۵۸ء میں صدر آیزنہار کا دور تھا۔

براون کا کہنا تھا:

"امریکی ڈیموکریسی دو پارٹیوں کی باہمی رقابت میں نظر آتی ہے اور ان میں سے ہر ایک پارٹی امریکیوں کے لیے ایک سیاسی عبادت گاہ ہے۔"

ایک دہائی کے بعد ویتنام جنگ کے تلاطم اور سیاسی و سماجی اعتراضات کے طوفان نے امریکی سوسائٹی کو اپنی زد میں لیا جس سے اس ڈھانچے کی بت پرستی کو بہت بڑا نقصان پہنچا، سیاہ فام افراد کا اپنے شہری حقوق کے حصول کے لیے قیام کرنا، اس وقت کے صدر جان ایف کینیڈی، اس کے بعد کے صدارتی امیدوار اور اس کے بھائی رابرٹ کینیڈی کا سیاسی قتل اور سیاہ فام افراد کے رہبر اور مبارز عیسائی راہنما مارٹن لوٹر کنگ کے

قتل نے ۱۹۶۸ء میں امریکہ میں ہونے والے عام اور صدارتی انتخابات کو امریکی تاریخ کے اس دور کو نا امن ترین اور خونی ترین دور بنادیا تھا۔

۱۹۷۰کے اوائل میں امریکی ڈیموکریسی اور خود صدر کی حیثیت اور وائٹ ہاؤس کو شدید جھٹکا لگا جب امریکی صدر ریچرڈ نیکسن کی "واٹر گیٹ" کے نام سے معروف بدعنوانیوں کا راز فاش ہوا، جس کی وجہ سے اُسے استعفا دینا پڑا۔ اس سال امریکی سیاست میں بڑی واضح تبدیلی آئی اور سیاسی گفتگو کا رُخ ۱۸۰ ڈگری درجے تبدیل ہوگیا۔

اور عین یہی وقت تھا جب کیلی فورنیا کے سابق گورنر ایڈمنڈ براؤن کا بیٹا جیرالڈ براؤن اپنے باپ اور جمہوریت پسند اور ڈیموکریٹ قیادت کے خلاف اعتراض اور شورش کی وجہ سے اس ریاست کا گورنر منتخب ہوا۔ اس دھائی میں جمی کارٹر کی حکومت عمومی افکار میں اعتماد پیدا کرنے اور نیکسن دور میں ہونے والی سیاسی اور اخلاقی شکست کے زخموں کے مندمل کرنے میں مصروف تھی کہ ایران کے اسلامی انقلاب نے امریکہ کی بین الاقوامی اور داخلی حیثیت پر ایک کاری ضرب لگائی۔

۱۹۸۰ء کی دھائی میں امریکی ایلیٹ کلاس نے کوشش کی کہ رونلڈ ریگن کو ابتداء میں کیلی فورنیا کا گورنر اور پھر امریکی صدر منتخب کر کے ملک کے شدت پسند کنزرویٹو طبقے کی تقویت کرسکے اور اس وقت کے سیاسی بحران اور حکومتی اداروں پر سے اٹھتے ہوئے عوامی اعتماد کا بھی سدّ باب کیا جاسکے۔ ریگن کا تعلق ہالی ووڈ سے تھا کہ جسے ریپبلکن پارٹی کے سرکردہ افراد نے اغواکاروں کے معاملے کو دبانے اور جمی کارٹر کی شکست خوردہ پالیسیوں کے خلاف کھڑا کیا اور عمومی افکار کے جذبات سے استفادہ کرتے ہوئے وائٹ ہاؤس کی طرف روانہ کیا۔ لیکن ریگن اور وائٹ ہاؤس میں اس کے بعد والا جانشین صدر یعنی جارج بش (جارج ڈبلیو بش کا والد) کے بجٹ اور مالی و اقتصادی پالیسیوں نے امریکی اقتصاد کو بحرانی کیفیت سے دوچار کردیا اور ملک میں طبقاتی فاصلوں کو عمیق تر کردیا۔ یہ اقتصادی بحران اور بڑھتی بیروزگاری ہی تھی کہ جس نے بل کلنٹن کو ۱۹۹۷ میں عام انتخابات میں کامیابی اور حکومت دلائی۔ سابق سوویت یونین کا سقوط، عسکری سرمایہکاری میں تبدیلی کرکے، اس کو عالمگیریت یا گلوبلائزیشن میں منتقل کرنا، گذشتہ عشرے میں امریکی اقتصاد کی ترقی اور ۱۹۹۶کے صدارتی انتخابات میں بل کلنٹن کی دوبارہ کامیابی کی اصل دلیل ہے۔ لیکن گذشتہ کچھ سالوں سے یہ ظاہری اقتصادی استحکام امریکہ میں عوامی نمائندگی کے جذبے کی بہبودی کا باعث نہیں بن سکا

اور آج امریکی نظام خاص طور پر چینلوں اور ٹیکنالوجی اور اداروں کے جدید انفراسٹرکچر کے تحت سب سے زیادہ غیر عادل اور انحصاری نظام ہے۔ امریکہ کا ڈیموکریسی اور سیاست کا نظام، اٹھارہویں صدی کے اواخر میں آزادی کی جنگ سے لیکر آج تک مختلف قسموں کی تبعیض پرستی "Discriminations" اور انحصار پر مبنی رہا ہے۔ (۱۰۶) انیسویں صدی کے وسط یعنی ۱۸۵۰ء تک (ایران میں ناصر الدین شاہ قاجار کے زمانے میں، امیر کبیر کی وزارت عظمیٰ کا دور) امریکی فیڈرل اور ریاستی انتخابات میں شرکت کے لیے ضروری ہوا کرتا تھا کہ جاگیر دار اور زمیندار ہو۔ اور یوں امریکہ کے بہت سے شہری (جن میں نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اور سیاہ فام غلام) حق رائے دہی سے محروم تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک امریکہ کی خواتین ووٹ ڈالنے یا خود منتخب ہونے کے حق سے بھی محروم تھیں۔ انہیں یہ حق ۱۹۲۰ء میں آئین کی انیسویں ترمیم سے ملا۔ ۱۹۶۰ء تک یعنی چالیس سال پہلے تک بہت سی امریکی ریاستوں میں انتخابات میں شرکت کا حق صرف ٹیکس دہندگان اور ۲۱ سال سے اُوپر کے افراد کو حاصل تھا اور یوں جوان اور ملک کا بیروزگار طبقہ عام انتخابات میں شرکت سے محروم رہتا تھا۔ ۱۹۶۰ میں شہری حقوق کے حصول کی تحریک اور سیاہ فام افراد کی شورش سے یہ قانونی رکاوٹ دور ہوئی اور ووٹ ڈالنے کے لیے ۱۸ سال کی عمر کو شرط قرار دیا گیا۔

۱۸۳۲ء تک جب اینڈریو جیکسن دوسری بار امریکی صدر منتخب ہوا، یہ عہدہ عوام کے لیے کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ امریکہ کے اس وقت کے آئین کے مطابق امریکی صدر حکومتی ریاست کے ارکان کی اکثریت سے منتخب ہوتا تھا۔ امریکی آئین میں ہونے والی اصلاحات کے ساتھ اس مجلس خبرگان جو بعد میں صدر کے "الیکٹرول کالج" کے نام سے معروف ہوئی کے ہر ریاست کے نمائندوں کا انتصابی ہونا انتخابی طریقے اور میتھڈ میں تبدیل ہو کر عوامی آراء کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آج اگر چہ امریکی عوام ہر ریاست میں، صدر اور نائب صدر کے امیدواروں کو براہ راست ووٹ دیتے ہیں لیکن ہر ریاست کا "الیکٹرول کالج" میں حصہ جو کسی ایک امیدوار اور اس کے نائب کی کامیابی پر منتہی ہوتا ہے، اس ریاست کی آبادی کے ساتھ مربوط ہے۔ امریکہ کی کیلی فورنیا، نیویارک، میشیگن، اوھایو اور ایلی نویز جیسی زیادہ آبادی والی ریاستیں امریکی صدر کے انتخاب میں زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ امریکی صدر کے انتخاب میں ہمیشہ

یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ صدر "الیکٹرول کالج" میں اکثریت حاصل کرے اور وائٹ ہاؤس میں براجمان ہو۔ چاہے اسے صدارتی انتخابات میں پورے ملک میں اکثریت حاصل نہ بھی ہو۔

اس وقت بھی امریکی صدر کے انتخابات کے لیے ان دونوں سیاسی پارٹیوں "ریپبلکن اور ڈیمو کریٹک پارٹی" کو مکمل کنٹرول اور اختیار حاصل ہے، اور پچھلی دو صدیوں میں کوئی بھی آزاد امیدوار حکومت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں امریکہ کے صدارتی انتخابات کے لیے نئی بننے والی جماعت "سبز" کے امیدوار رلف نیڈر کو ٹیلی ویژن پر معمولاً صدارتی امیدواروں کے مابین ہونے والے مناظروں میں شرکت کی اجازت تک بھی نہیں دی گئی۔

لیکن اس کے حامی اور طرفدار اپنی پوری تیاری اور انتخابات میں شرکت سے ان دو پارٹیوں میں سے ایک کا پلڑا بھاری کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

امریکہ میں جہاں عام انتخابات میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کم ہے۔ وہاں انتخابات میں شرکت کے لیے ہر نئی پارٹی یا گروپ ان دو پارٹیوں کے امیدواروں کے تعیّن اور ان کی پالیسیوں میں خاصے موثر اور پر نفوذ ہو سکتے ہیں۔ امریکی صہیونیوں اور یہودیوں نے کئی سالوں سے اس روش سے استفادہ کیا ہے۔ کیوبن مہاجرین، ہسپانوی زبان اور سیاہ فام گروہوں نے ان ریاستی اور مرکزی (فیڈرل) انتخابات میں اپنی وحدت و اتحاد کا مظاہرہ کیا لیکن امریکہ پر مسلط دونوں پارٹیوں نے یہ کوشش کی کہ ان اقلیتوں اور گروہوں کو اپنی آرگنائزیشن میں مدغم کرلیں۔ امریکی عوام کی ملکی انتخابات میں شرکت نہ کرنے کی ایک بنیادی وجہ ان دونوں پارٹیوں کا ملک پر قبضہ اور ایک دوسرے سے حد درجہ شباہت ہے۔ جس نظام میں کسانوں، مزدور یونینوں، تجارتی یونینوں اور مقامی اور ٹیکنکل انجمنوں کی طاقت، سرمایہ داروں اور بڑی بڑی کمپنیوں کے اندر کھپ گئی ہو، وہاں سیاسی تنوع اور علاقائی و ریاستی ذوق جو کبھی امریکہ کے مشرق و مغرب و شمال و جنوب کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتا تھا، ختم ہوگیا ہے اور امریکی عوام، سیاسی بازیگروں کو ایک ہی تھان کا کپڑا سمجھتے ہیں اور سیاسی حوالے سے اپنا کوئی کردار نہیں دیکھتے۔ ۱۸۹۶ء سے لیکر ۱۹۹۶ء کے ایک سو سال میں امریکہ کے عام انتخابات میں شرکت کرنے والوں کی اوسط مقدار ۸۰ فیصد سے کم ہو کر پچاس فیصد سے بھی کم ہو چکی ہے۔ اور اس نامناسب حالت اور کیفیت سے ان دو بڑی پارٹیوں کو نہ کوئی فکر ہے اور نہ ہی کوئی گلہ۔ کیونکہ اُن کو اس بات کا ڈر ہے کہ اس سسٹم کی موجودگی کے باوجود عوام کی بڑے پیمانے پر انتخابات میں

شرکت ان کے لیے غیر موزوں ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ گذشتہ کچھ دہائیوں سے امریکی صدر کے نامزد امیدواروں کی کیفیت اور صلاحیت دونوں میں گراوٹ آ رہی ہے۔

امریکی میڈیا اور پریس میں سینسر اور کنٹرول سب سے زیادہ جذبات و ادراکات کے اندرونی اور بیرونی کنٹرول کے طریقوں سے ہوتا ہے۔ (جن کی وضاحت پہلے کی جاچکی ہے) درحقیقت اس قسم کا سینسر اور کنٹرول سرمایہ داری اور لبرلزم کے معیاروں کے اندر امریکہ اور یورپ کے پریس اور میڈیا کی بنیادی علامت ہے۔ یہ سینسر اور کنٹرول اکثر غیر سرکاری افراد یا اداروں اور سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی با اثر شخصیات کے ہاتھوں سے انجام پاتا ہے اور اس میں حکومت براہ راست مداخلت نہیں کرتی۔ یہ جذبات کا کنٹرول یا ادراکی کنٹرول عام عوام اور امریکی سسٹم کے بارے میں مکمل آشنائی نہ رکھنے والوں کے لیے نامعلوم اور مجہول رہ جاتے ہیں۔ آج کے معاشروں میں اس قسم کے سینسر اور کنٹرول گذشتہ نصف صدی میں عصر جدیدیت یا ماڈرنزم کے خطرناک معاملات ہیں۔

امریکی آئین کا آرٹیکل نمبر ایک، آزادی صحافت اور آزادی رائے میں حکومت کی کسی بھی براہ راست مداخلت اور قانون سازی کو ممنوع قرار دیتا ہے، جبکہ میڈیا اور پریس کے سینسر یا اس کو غیر سرکاری افرد یا گروہوں یا اداروں کے ذریعے کنٹرول کرنے کے حوالے سے بالکل چپ ہے اور کچھ بھی نہیں بولتا۔ تعجب نہیں، امریکہ کا پریس اور میڈیا کا نظام اور خاص طور پر اس ملک کے اصلی اور مسلط چینل عالمی انفارمیشن سسٹموں میں سب سے زیادہ تنگ، بند اور انحصاری ترین نظام میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ایک ایسا نظام جو حتی کہ مغربی معیاروں سے موازنے میں انگلینڈ، فرانس، اٹلی، جاپان بلکہ پوری دنیا کے سرمایہ داری نظام کے ہمفکر افراد کی جانب سے تنقید کا سامنا کر رہا ہے۔ اس طرح امریکہ کے اصل سینسر کرنے والے وہاں کے ناشرین، مصنفین، پروڈیوسر، صحافی اور امریکہ کے اصلی تفریحی میڈیا کے رپورٹر ہیں جن کی سیاسی اور اقتصادی نظام کی اقدار اور مسائل کے بارے میں امریکی حاکم طبقے کے ساتھ ادراکی موافقت نے ایک غیر ناقدانہ، محدود اور بند ماحول پیدا کر دیا ہے۔ البتہ امریکہ میں ایسا میڈیا اور پریس بھی موجود ہے جو سسٹم کی پالیسیوں کو چیلنج کرتا ہے، لیکن اس قسم کے میڈیا کی پروڈکشن بہت محدود اور عوام تک رسائی اور پروپیگنڈے میں یہ بہت پیچھے رکھے جاتے ہیں اور وہ فائدے "Benefit" جو اصل تجارتی چینلوں اور ان کو سپورٹ کرنے والی بڑی بڑی کمپنیوں کو حاصل ہوتے ہیں، وہ ان کے نصیب میں نہیں ہوتے۔

مغرب اور خاص طور پر امریکہ میں جس وقت میڈیا اور پریس کا کنٹرول اور سینسر حکومت کے ہاتھ سے خارج ہوا، اس کے تھوڑے سے عرصے کے بعد ہی یہ کنٹرول اور سینسر سرمایہ داروں اور کمپنیوں کے ہاتھ آگیا۔ پریس کی حکومت سے آزادی کے ساتھ ساتھ اس کی سرمایہ داروں، کمپنیوں اور مخصوص فکری اور مالی افراد سے آزادی بھی ضروری تھی تا کہ افراد اور قوم کی آزادی، عمل میں لائی جا سکتی۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے تحت آزادی رائے اور آزادی عقائد کا مفہوم مسخ ہوگیا۔ آج امریکہ میں سیاسی پارٹیاں اور کمپنیاں حکومت کے اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی امور میں مداخلت کی مخالف ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ حکومتی بیوروکریسی اور نظریات کی مخالف ہیں، بلکہ یہ چاہتی ہیں کہ مالکیت، سوداگری، سودجوئی، تقسیم دولت اور تہذیبی مصنوعات کی پیداوار اور تقسیم مخصوص حکام کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ ان کا ماننا ہے کہ نظام کی پالیسیوں کے زیادہ دوام کے لیے سینسر اور کنٹرول، با اثر افراد اور تجارتی طبقے کے ہاتھوں میں زیادہ بہتر ہے اور ایسا لگتا ہے کہ حکومت کی براہ راست مداخلت کی بجائے سینسر کی ذمہ داری بااثر افراد کے حوالے کرنا زیادہ پسندیدہ اور آزاد ہوگا کیونکہ امریکہ میں حکومتیں مخصوص سرمایہ داروں کے توسط سے ہی تشکیل پاتی ہیں۔

امریکہ میں حکومت اور خود تجارتی کمپنیاں اور سرمایہ دار، ٹیکس اور بیت المال سے استفادہ کرنے اور عوام کے پرائیوٹ اور مستقل اداروں کی تاسیس کے مخالف ہیں۔ حکومت کی طرف سے ان پرائیویٹ چینلوں، میڈیا اور پریس کو کسی بھی قسم کا مالی تعاون منع ہے۔ جبکہ گذشتہ چند دہائیوں میں امریکی کانگریس اسلحہ، طیارہ، کمپیوٹر، سیٹلائٹ اور گاڑیاں بنانے والے کارخانوں کے لیے امداد کے عنوان سے اربوں ڈالر کے متعدد بل منظور یا براہ راست امریکی صدر سے آرڈر پاس کروا چکی ہے۔ گذشتہ تیس سال میں امریکہ کی گاڑیاں بنانے والی بہت بڑی کمپنی کرایسلر، اور قرضوں اور سیونگ بینکوں کے گروپ جو اپنے اقتصادی اور مینجنگ مسائل کی وجہ سے دیوالیہ ہوگئے تھے، بیت المال کی بلاعوض امداد کی وجہ سے نجات حاصل کرپائے ہیں۔ دوسری طرف انٹرنیٹ جو ۱۹۶۰ء کے اوائل میں امریکی وزارت برائے قومی دفاع اور ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے تحقیقی مراکز کے درمیان عوام کے ٹیکس کی وجہ سے پھلا پھولا، گذشتہ عشرے میں مکمل طور پر پرائیویٹ ہو کر تجارتی کمپنیوں کے اختیار میں چلا گیا ہے۔ جس سے ادارے اور افراد استفادہ کر رہے ہیں۔ امریکہ کی نیم سرکاری کمپنی "کامسٹ" جو "بین الاقوامی سیٹلائٹ کمیونیکشن کمپنی" کو چلا رہی تھی اب پرائیویٹ ہو گئی ہے اور امریکی اسلحہ سازی کے ایک بہت بڑے کارٹل (Cartel) کے سپرد کردی گئی

ہے۔ کیمونیکیشن کی مصنوعات کو زیادہ سے زیادہ پرائیوٹائز کرنا اور پھر انہیں سرمایہ داروں اور بڑی بڑی کمپنیوں کے حوالے کر دینا، چار سال پہلے اپنے عروج پر پہنچ گیا، جب امریکی فیڈرل حکومت نے عمومی ملکیت والے ریڈیوں کو بولی (Auction) لگا کر پرائیویٹ سیکشن کو دینے کا ارادہ کر لیا۔ آج صرف اور صرف نیشنل پارک ہی ہیں جو پرائیویٹائزیشن اور تجارتی ہونے سے بچے ہوئے ہیں۔ ثقافتی اور ارتباطی مصنوعات کو تجارتی کر دینا، ایسی پالیسی ہے جس پر امریکی حکومت اپنی عالمگیر "اصلاح پسندی" کی اسٹریٹجی کے مطابق تمام ممالک میں عمل درآمد کر رہی ہے۔ آج میڈیا ایجنسیاں اور پبلک براڈکاسٹنگ سے معروف ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن جو پرائیویٹ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو تجارتی سرگرمیوں سے دور کہلاتے ہیں، سال میں ایک یا دو بار اپنے ناظرین یا سامعین کے سامنے کشکول اُٹھائے مالی تعاون کی اپیل کر رہے ہوتے ہیں۔ امریکہ کے تعلیمی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام مغربی ممالک میں سب سے گھٹیا شمار ہوتے ہیں۔ امریکی پریس اور میڈیا کے اس قسم کے ادراکی سینسر اور کنٹرول کا کچھ یوں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ایسے پروگرام جو سوداگری، سودجوئی، تجارتی کھپت اور عوام کی اپنی ضرورت سے بڑھ کر شئے خریدنے میں ترغیب دلانے میں ناکام ہو جائیں، وہ خود بخود میڈیا سے ختم اور سینسر ہو جاتے ہیں۔

۲۔ ریڈیو یا ٹیلی ویژن اگر پریس کنٹنٹس "Contents" کی طرح کسی تجارتی یا ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو مالی تعاون نہ کریں تو ایسے پروگرام میڈیا پر نہیں آسکتے اور نہ ہی عوام کے سامنے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

۳۔ خبریں، دستاویزی اور تاریخی پروگرام سب کے سب تجارتی کمپنیوں کے براہ راست مالی تعاون سے پیش ہوتے ہیں۔ امریکی ریڈیو یا ٹیلی ویژن اور پریس خبروں یا دوسرے پروگراموں کی ہدایت کاری یا پیش کش یا قومی اور بین الاقوامی تجزیوں کے حوالے سے مالی اعتبار سے آزاد نہیں۔ ان سب کا بجٹ کمپنیوں اور اشتہارات کی فروخت سے حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ ضروری ہے کہ میڈیا اور پریس کی خبریں، رپورٹس اور مقالات امریکہ کی داخلی و خارجی پالیسیوں و اقدار اور دو پارٹیوں کے سیاسی و اقتصادی نظام سے مطابقت رکھتے ہوں، ورنہ ناشرین اور ایڈیٹر حضرات کے سینسر کی زد میں آکر یا تو رد ہو جائیں گے یا حذف کر دئے جائیں گے۔

۵۔ میڈیا اور پریس کے پروگرامز، خبریں، دستاویزی رپورٹس اور مقالات "ملکی مفاد" اور "امن و امان کے خلاف اور "امریکہ دشمن" افکار اور عقائد کی ترویج نہ کرتے ہوں۔ پچھلی نصف صدی میں امریکہ کے

زمان و مکان کے اعتبار سے مختلف دشمن رہے ہیں جیسے کیمونسٹ، سوشلسٹ، اصول پسند مسلمان بلکہ کلی طور پر تمام وہ لوگ جو امریکی پالیسیوں اور تسلط کے خلاف کھڑے ہوئے ہیں۔

۶۔ سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور مذہبی با اثر افراد کی پالیسی ساز افراد اور حکمران طبقے کے ساتھ فکری ہم آہنگی۔

۷۔ بڑی بڑی کمپنیوں اور سرمایہ داروں بالخصوص یہودیوں اور صہیونیوں کا پریس اور میڈیا کی ملکیت کے ساتھ ساتھ نظام کے ساتھ وفادار اور اپنے پسندیدہ اور معتمد افراد کو "گیٹ کیپر" کے عنوان سے متعین کرنا۔

۸۔ میڈیا اور پریس کا کنٹرول اور سینسر، دباؤ ڈالنے والے گروپس، سیاسی و اقتصادی بروکرز، لابیوں، صاحب نفوذ، مصنوعات اور تجارتی انسٹی ٹیوٹ کو سپورٹ کرنے والے افراد، سیاسی پارٹیوں اور بانفوذ اقلیتوں کے ہاتھ میں ہے۔

برطانیہ میں ۲۰۰۱ء کے عام انتخابات میں سیاسی پارٹیوں کے مابین رقابت اس قدر کم تھی کہ لیبر پارٹی کی مکمل کامیابی، ملک کے سیاسی طبقے کے لیے شرم آور تھی ملک کی کنزرویٹو پارٹی کو مجبوراً کنارہ کشی کرنا پڑی۔ ۱۹۸۰ء کے بعد تقریباً دو دہائیوں کے اندر کنزرویٹو پارٹی کا پارلیمنٹ اور حکومت پر کنٹرول ختم ہو چکا ہے۔ فرانس میں یاک شیراگ کی کنزرویٹو اور معتدل حکومت انتخابات میں (جن میں سوشلسٹوں کی ایک طاقت بن کر سامنے آئی) کامیابی کے بعد اپنی داخلی اور خارجی پالیسیوں کے حوالے سے ملک کی اکثر عوام کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔

امریکہ سے لے کر روس اور فرانس سے لے کر انگلینڈ کے مغربی ممالک کے عام انتخابات اور سیاسی پارٹیوں کے کارناموں سے پتہ چلتا ہے کہ ان سسٹموں میں سیاسی دھڑے بندی کس قدر فرسودگی اور تزلزل کا شکار ہے اور کس طرح یورپ اور امریکہ کا "ڈیموکریسی" نظام، جواز legitimacy کے بحرانوں سے دوچار ہے۔(۱۰۷) اسی طرح ان سسٹموں کے دقیق مطالعے اور گذشتہ چند دھائیوں میں ان کی کارکردگی سے سمجھ میں آتا ہے کہ ایران جیسے ممالک جو کئی سال مغربی آئیڈیالوجی کے زیر اثر رہا ہے، اس میں اس قسم کے سیاسی دھڑوں کی تقلید، تکرار یا ایجاد کس حد تک مضر اور گمراہ کن اور بہت سی مشکلات کا باعث ہے۔ سب سے اہم یہ کہ ایک اسلامی نظام میں حاکمیت، باہمی شرکت، عوام، ڈیموکریسی، آزادی اور

سماج اور یورپ اور امریکہ کی غیر اسلامی سوسائٹیوں کے اہداف اور ساخت میں بہت واضح فرق موجود ہونا چاہئے۔

مغربی ڈیموکریسی کا دعویٰ ہے کہ ایک معاشرے میں رہنے والے افراد اپنے نمائندے منتخب کر سکتے ہوں، سیاسی معاملات میں شریک ہو کر اپنی من پسند حکومت کو تشکیل دے سکیں اور وہ حکومت اکثریت کی رائے کی مالک ہو۔ یورپ اور امریکہ میں ہونے والے حالیہ انتخابات سے واضح پتہ چلتا ہے کہ پیسہ، پروپیگنڈے اور بے ایمانی نے عوام سے ان کی سیاسی طاقت تو چھین ہی لی ہے، حکومت اور منتخب ہونے والے کابینے بھی عوام کی صرف اقلیت کی ہی حمایت حاصل کر پاتی ہیں۔ مغربی ممالک میں عام انتخابات میں شریک ہونے والے افراد میں کمی آرہی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے حوالے سے سماج کے مختلف طبقات میں موجود اتحاد میں کمی آرہی ہے اور منتخب کرنے اور ہونے والوں میں روز بروز فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ ۱۹۹۷ء میں برطانیہ میں لیبر پارٹی، کنزرویٹو پارٹی اور دوسرے سیاسی حریفوں کے خلاف کامیاب ہوئے اور اٹھارہ سال بعد انگلینڈ کے دائیں بازو والے حکومت بنا پائے۔ ٹونی بلیئر، لیبر پارٹی کا راہنما جو بڑی گھن گھرج کے ساتھ حکومت حاصل کر پایا، درحقیقت یہ حکومت بھی ایک مرتبہ پھر کم عوامی آراء کے ساتھ تشکیل پائی نہ کہ اکثریت کے ساتھ۔ تمام ووٹوں میں لیبر پارٹی کے ووٹ 44.5%، کنزرویٹو کے 31.4% اور باقی 24.1% رہے۔ پارلیمنٹ کے کل ۶۵۹ ارکان میں سے لیبر پارٹی کے ۴۱۸، کنزرویٹو پارٹی کے ۱۶۵ لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کے ۴۲، اولسٹر یونینوں کے ۱۰، نیشنل پارٹی آف سکاٹ لینڈ کے ۶ اور باقی ۱۳ نشستیں دوسری چھوٹی پارٹیوں نے حاصل کیں۔ دوسرے لفظوں میں پارلیمنٹ میں عوام کے نمائندوں کی اکثریت برطانوی عوام کی اقلیت کے ساتھ تعلق رکھتی تھی۔ برطانیہ کے قانون کے مطابق پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی کابینہ بناتی ہے اور اس پارٹی کا راہنما، وزیر اعظم بنتا ہے۔ ۱۹۹۷ء کے پارلیمانی انتخابات میں دلچسپ بات یہ ہے کہ سکاٹ لینڈ اور ویلز ریاست کے کنزرویٹو حضرات پارلیمنٹ میں اپنی تمام نشستوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، جبکہ شمالی آئرلینڈ جو انگریزوں کے ہاتھ میں ہے وہاں حریت پسند، شین فین پارٹی کے نمائندے الیکشن میں کامیاب ہوگئے۔ برطانیہ کی تاریخ میں پہلی بار ایک ایشین مسلمان محمد سرور جو لیبر پارٹی کے رکن ہیں، گلاسکو شہر سے پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہوئے۔ اسی طرح بی بی

سی کے ایک قدیمی رپورٹر نے بدعنوانی اور رشوت کے خلاف جنگ کی وجہ سے اپنے مدمقابل کو شکست دی اور قومی اسمبلی میں آیا۔ برطانیہ میں ایک ملین سے زائد انتخابات میں شرکت کے اہل مسلمان موجود ہیں۔

برطانیہ کے پارٹی اور الیکشن سسٹم میں تعجب اس بات کا ہے کہ ایک پارٹی کے حاصل کردہ ووٹوں اور اس پارٹی کے پارلیمنٹ میں ارکان کے درمیان کوئی تناسب موجود نہیں۔ مثلاً ۱۹۹۷ء میں لیبر پارٹی جس نے انتخابات میں 44.5% ووٹ حاصل کئے وہ پارلیمنٹ کی 65% کرسی کی مالک بن گئی جبکہ کنزرویٹو 31.4% ووٹوں کے ساتھ نہ صرف ۲۵ سیٹیں لے پائی بلکہ موجود اسمبلی میں کنزرویٹو پارٹی کا اسکاٹ لینڈ اور ویلز کا کوئی بھی نمائندہ نہیں۔ کنزرویٹو پارٹی بھی پچھلے اٹھارہ سالوں میں پارلیمنٹ کی اکثریت لے کر حکومت کرتی رہی ہے، لیکن وہ بھی برطانوی عوام کی اکثریت کے ووٹ حاصل نہیں کر سکی۔ برطانوی یونین جسے تقریباً متفقہ طور پر انگریزوں نے ہی تشکیل دیا ہے گذشتہ صدی میں صرف کنزرویٹو اور لیبر پارٹی جو ملک کے دائیں بازو اور معتدل شخصیتوں پر مشتمل ہیں انہیں کو چلا پائی ہے۔ ان کے گذشتہ انتخابات درحقیقت کنزرویٹو پارٹی کے پروگراموں کے خلاف رائے تھا نہ کہ لیبر پارٹی پر اعتماد کی مہر۔

جہاں لیبر پارٹی عوام کی اکثریتی رائے حاصل نہ کر پانے کے باوجود پچاس فیصد سے کم ووٹ لے پائی ہے اور جس کی اس صدی میں مثال نہیں ملتی لیکن اس ملک کو درپیش مشکلات کے بارے میں تفرقہ اور اختلاف پہلے سے زیادہ شدید ہوا ہے۔ لندن کا "اکانومسٹ" جریدہ جو دائیں بازو کی طرف تمائل رکھنے والا آزاد خیال اور معتدل جریدہ ہے، اس نے حالیہ انتخابات اور ان میں لیبر پارٹی کی فتح کو "عجیب و غریب" گردانا ہے۔ اور لیبر پارٹی کی ایک بڑی اکثریت کے لحاظ سے لندن میں حکومتی نظام میں مرکزیت حاصل کر لینے کو خطرناک جانا ہے۔ بائیں بازو اور لبرل طبقہ کے افراد لیبر پارٹی کے دائیں بازو اور میانہ رو دھڑے کی طرف رُخ کو خیانت سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ سکاٹ لینڈ کے لوگ اس انتظار میں ہیں کہ حالیہ انتخابات میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں سے ایک مرتبہ پھر اپنی مقامی خود مختاری حاصل کر کے سکاٹ لینڈ ریاست کی پارلیمنٹ کا احیا کر سکیں۔ لیبر پارٹی کا مزدور اور مزدور یونین سے کوئی سروکار نہیں۔ اور گذشتہ کچھ سالوں میں اس نے مزدور یونینوں کی حمایت سے دستبرداری اختیار کر لی ہے اور حالیہ انتخابات میں کنزرویٹو پارٹی کے ووٹ ہتھیانے کے لیے اس نے باقاعدہ بڑی بڑی کمپنیوں، شیئر ہولڈرز اور اقتصاد کی نجکاری کی حمایت کر دی ہے۔ کنزرویٹو پارٹی گذشتہ اٹھارہ سال سے ملازمت اور صنعت کی نجکاری کی پالیسی، سرمایہ داروں کی

حمایت اور ثقافت، تعلیم اور صفائی کے اجتماعی اور رفاہی اداروں کے بجٹ میں کمی کر کے ملک کے متوسط اور نچلے طبقے کے اکثر افراد کو اپنے سے دور کر چکی ہے۔ گذشتہ عشرے میں کنزرویٹو جماعت کی طرف سے ہائی کورٹ کے ججوں کی طاقت و اختیارات کو کم کرنے کی وجہ سے ملک کے وکلا اور قانون دان افراد کو پارٹی کی مخالفت پر مجبور کر دیا ہے۔

بہت سی وجوہات کی بنا پر حالیہ انتخابات کے نتیجے میں آئیڈیالوجی اور سیاسی اعتبار سے انگلینڈ، ایک ہی پارٹی رکھنے کے قریب ہے اور ہمیشہ سے یہ امکان موجود رہا ہے کہ انگلینڈ میں موجود شرائط کے تحت عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل کیے بغیر ایک پارٹی متفقہ طور پر لمبی مدت کے لیے پارلیمنٹ میں بیٹھ جائے۔ موجودہ صورتحال میں لیبر پارٹی نے دائیں بازو کی جانب رغبت اور یورپی یونین میں برطانوی مشکوک اور متردد کردار کے ساتھ ساتھ کنزرویٹو پارٹی کی بہت ساری پالیسیوں کو اپنے اندر مدغم کر کے عوام کی عدم حمایت میں ایک غیر رسمی پارٹی تشکیل دی ہے۔ حالیہ انتخابات کے نتیجے میں کنزرویٹو پارٹی برطانوی پارٹی سے تبدیل ہو کر ایک انگلش پارٹی بن چکی ہے۔ اور معلوم نہیں کہ اِس وقت کی مقتدرہ لیبر پارٹی اپنے آپ کو یورپی یونین جیسے فیڈرل سسٹم میں جگہ دلا پائے گی یا نہیں، اور وہ بھی برطانوی یونین کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر۔ اہل سکاٹ لینڈ اور ویلز، اسی طرح شمالی آئرلینڈ کے باشندے برسلز میں یورپی یونین کے تحت خود مختار قوموں کی طرح زندگی بسر کرنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں، نہ کہ لندن میں انگلینڈ کے سامراج کے ماتحت رہنا۔ یورپی یونین کے اقتصادی اور اجتماعی حالات کے شمارے یہ بتاتے ہیں کہ برطانیہ کا شمار یورپی یونین کے دولتمند ممالک کے عنوان سے ہوتا ہے۔

کنزرویٹو پارٹی کی آئیڈیالوجی کے معیاروں کے مطابق، لیبر پارٹی کی کامیابی سے انگلینڈ کی ایران جیسے ممالک کے ساتھ خارجہ پالیسی تبدیلی نہیں ہوگی۔ انگلینڈ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر اور نئے وزیر خارجہ رابن کوک اپنے آپ کو بل کلنٹن کی آئیڈیالوجی اور واشنگٹن کے جدید ڈیموکریٹس کے کیمپ میں پاتے ہیں۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ انگلینڈ، امریکہ کی آئیڈیلزم کو اپنائے بغیر ہمیشہ اپنے اقتصادی اور مالی مفادات کو اپنی خارجہ سیاست کا محور بناتا ہے۔ لیکن آئندہ آنے والی دہائی میں برطانوی ڈیموکریسی کی مشکلات صرف سیاسی نہیں ہوں گی۔ ملک میں ہونے والی جدید اجتماعی تبدیلیاں جیسے قومی، مذہبی اور مہاجر اقلیتوں کے ساتھ مقابلہ، رفاہ عامہ اور بالخصوص انسانی حقوق کے مسئلہ کے سامنے سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ ۳ مئی ۱۹۹۷ کو

ہیرلڈ، گلاسکو اخبار میں "ایک نئی قسم کے زندان کی طرف" کے عنوان سے تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی، جس میں اقلیتوں اور مہاجروں کے ساتھ برطانیہ کی امتیازی اور سخت پالیسیوں پر کڑی تنقید کی گئی۔ اس اخبار کا ماننا ہے کہ انگلینڈ کا معاشرہ ابھی بھی ایک امتیازی، طبقاتی اور غیر مساوی معاشرہ ہے۔

گذشتہ نصف صدی کے عرصے میں گریٹ برٹین "Great Britain" کے نام سے معروف ایمپائر اور اس کا سیاسی و اقتصادی سسٹم، آج مینر برٹین "Minor Britain" کے پست ترین درجے تک گر چکا ہے۔ انحطاط کی یہ قوس، انگلینڈ کے زیر تسلط آخری علاقے ہانگ کانگ کی چین کو سپردگی جو ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے انجام پائی ہے، سے واضح ہو رہی ہے، بلکہ سالوں سے مغربی ڈیموکریسی کا نمونہ رہنے والی سیاسی طاقت کے داخلی بحران، ملک کے عام انتخابات اور پارٹیوں کے تنزل سے آشکار ہو گئے۔ برطانیہ سلطنتوں کے اتحاد کا ایک ملک ہے جس میں انگلینڈ کی (۸۲ فیصد آبادی) کے علاوہ سکاٹ لینڈ کی (دس فیصد)، شمالی آئرلینڈ کی 2.5 فیصد) اور ویلز کی (۲ فیصد) آبادی بھی شامل ہے لیکن اس تمام دورانیہ میں انگلینڈ ان سب ریاستوں پر قابض رہا ہے۔ برطانیہ کی آبادی کا تین سے چار فیصد حصہ اس کی سابقہ مقبوضہ سرزمینوں (ہندوستان، پاکستان اور اولسٹر قوم) کے باشندوں سے تشکیل پاتا ہے، مغرب کے عمومی افکار کا اپنی سیاسی پارٹیوں اور نمونوں سے عدم اعتماد ہی ہے جو خاص طور پر پچھلے کچھ سالوں میں امریکہ اور یورپ میں پہلے سے زیادہ اُبھر کر سامنے آیا ہے اور جس نے بڑے واضح طور پر سیاست میں شرکت اور قومی فیصلوں کی روش کے سامنے سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس صدی میں اپنے آپ کو تمام اقسام کی ڈیموکریسی کا رہنما ظاہر کرنے کرنے والا مغربی سیاسی سسٹم جو مدتوں مشرقی ممالک کے آزاد خیال افراد کے لیے قابل ستایش و تقلید رہا ہے اس وقت اس قدر سستی، بد نظمی اور فساد کا شکار ہے کہ خود مغربی سیاسی ناظرین کی نظر میں اپنے جواز "Legitimacy" سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور ایک فکری اور حیاتی بند گلی میں پھنس گیا ہے۔

پچھلے چند سالوں میں انگلینڈ میں جس قدر سیاسی رقابتیں عوام کی نفرت اور سول سوسائٹی کے مورال میں کمی کا باعث بنی ہیں، اتنا گذشتہ صدی میں انتخابات اور پارٹی سرگرمیاں بھی نہیں بنیں۔ پورے انگلینڈ میں عمومی افکار کے گذشتہ ماہ کے موازنے نے ایک مرتبہ پھر ظاہر کیا ہے کہ انگلینڈ کی عوام ملک کے انتخابات میں ہونے والی تقریروں اور ان کے لہجوں، زیر بحث مسائل اور موجود سیاسی طور طریقوں سے

سخت نالاں ہیں اور اُن کی آرزو ہے کہ جتنا جلدی ہوسکے الیکشن کا دن آئے اور یہ سب پروپیگنڈہ اور مصلحتی جلسے جلوس ختم ہوں۔

برطانوی عوام کی انتخابات کے نظام اور سیاسی پارٹیوں سے حالیہ ناراضگیوں اور تنقید، امریکی عوام کی اپنی سیاسی پارٹیوں اور صدارتی انتخابات (جو ابھی کچھ ماہ پہلے ہی منعقد ہوئے تھے) پر ہونے والی شدید تنقید اور عدم اعتماد سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔

اکثر مغربی ممالک اور بالخصوص انگلینڈ میں حالیہ انتخابات کے حوالے سے عمومی افکار میں اس غم و غصہ کا ان چند موضوعات میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ فلسفی، سیاسی اور آئیڈیالوجیکل پہلو سے سیاسی پارٹیاں تقریباً ایک جیسی ہوچکی ہیں مثلاً انگلینڈ میں کنزرویٹو اور لیبر پارٹی (جو دونوں امور مملکت چلانا چاہتی ہیں) کوئی فرق نہیں رہا۔

۲۔ پارٹی قیادت، رفاہ عامہ اور عوام کی خدمت کے بجائے مقام، منصب اور طاقت کے حصول کے چکر میں ہے۔

۳۔ نامزد امیدواروں نے بڑی کمپنیوں اور دولت مند افراد کے مالی تعاون سے انتخاب کو ایک تجارتی منڈی بنا کر رکھ دیا ہے۔

۴۔ سیاسی پارٹیوں کے کردار اور عمل، ان کے نعروں اور بیان بازیوں سے بالکل مختلف ہیں اور یہ فرق روز بروز زیادہ اور گہرا ہوتا جارہا ہے۔

۵۔ پارٹیوں اور سیاسی قائدین میں بد عنوانی اور رشوت خوری بہت زیادہ پھیل چکی ہے۔

۶۔ پروپیگنڈہ، اشتہارات اور جھوٹے اندازے انتخابات کے اصل ہتھکنڈے بن چکے ہیں اور عوام اور لیڈروں کے درمیان رابطہ کم ہوگیا ہے۔

۷۔ ایسی سیاسی، قومی یا مذہبی شخصیات موجود نہیں جو لوگوں کو اپنی محبت سے ان کو تیار کرسکیں اور عمومی حمایت حاصل کرسکیں۔

گیارہ سال مارگریٹ تھیچر اور سات سال تک جان میجر کی قیادت میں حکومت کرنے والی کنزرویٹو پارٹی جس نے نجکاری کو اپنا بنیادی پروگرام بنایا، حالیہ دنوں صحت اور تعلیم کے پروگراموں کی فرسودگی اور خرابی کا شکار ہے اور وہ مسائل کہ جن کی وجہ سے آج برطانوی عوام سخت پریشان ہیں۔ انگلینڈ کے سرمایہ

دارانہ اقتصادی نظام نے اگرچہ گذشتہ دو عشروں سے بڑی ترقی کی ہے، لندن اور دوسرے بڑے شہر بڑی بڑی مارکیٹوں، لگژری اشیاء کی رونق اور مال و دولت کے دوسرے مراکز کی کشش کا باعث بنا ہوا ہے۔ اور فرانس اور جرمنی جیسے دوسرے یورپی ممالک کی نسبت انگلینڈ میں بیروزگاری بہت کم ہے، لیکن اس اقتصادی ترقی اور بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری سے صرف اوپر والے طبقے اور خاص کر بڑی بڑی کمپنیاں مستفید ہو رہی ہیں۔ جبکہ مانچسٹر، لیورپول اور برمنگھم جیسے دوسرے بڑے شہروں کے معمولی مزدور بڑی مشکل اور سختی میں اپنی زندگیاں بسر کر رہے ہیں اور ملک کی کشتی سازی اور معدنی ذخائر کی صنعت جام ہو چکی ہے۔ پچھلے عشرے میں بھی انگلینڈ کے مرفہ طبقے، جن میں دوسرے ممالک کے افراد بھی شامل ہیں ان کی تعداد میں 65% اضافہ ہوا ہے جبکہ درمیانے اور نچلے طبقے کے لوگوں کی تنخواہوں میں بالکل اضافہ نہیں ہوا۔

لیبر پارٹی جو کئی سالوں سے مزدور یونینوں اور قومی ورفاہی پالیسیوں کا دفاع کرتی رہی ہے، اور اپنے آپ کو براعظم یورپ کے سوشل ڈیموکریٹس کا علمبردار سمجھتی رہی ہے، حالیہ انتخابات میں صرف کنزرویٹو پارٹی کے حامیوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لیے صنعت اور نیشنل اکانومی کی نجکاری کا دعوی کرتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ وہ تمام پروگرام جن کو کنزرویٹو پارٹی عملی جامہ نہ پہنا سکی یہ ان کو مکمل کرے گی۔ لیبر پارٹی کے راہنما اور انگلینڈ کے آئندہ وزیر اعظم ٹونی بلیئر اپنے آپ کو برطانیہ کے بل کلنٹن کے طور پر دیکھتا ہے۔ دائیں بازو کی طرف اپنے آئیڈیالوجیکل اور سیاسی رجحان کی وجہ سے بل کلنٹن نے امریکہ کی ڈیموکریٹک اور ری پبلکن پارٹی میں موجود تھوڑے سے فرق کو بھی مٹا دیا اور عوام کی سیاسی صورت حال سے ناراضگی اور عدم اعتماد کے باوجود دوبارہ صدر بن گیا۔

انگلینڈ کے سوشل ڈیموکریٹس اور لندن یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسی اقتصاد کے فارغ التحصیل افراد جو دسیوں سال لیبر پارٹی کے ایک ترقی خواہ اور مزدور دوست پارٹی ہونے کا گن گاتے رہے، عالمی سرمایہ داروں کے کیمپ میں بیٹھے بہت سی مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ انگلینڈ کی پارلیمنٹ ۶۵۱ نشستوں پر مشتمل ہے اور روایتی اعتبار سے جو پارٹی پارلیمنٹ میں زیادہ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گی، وہ اپنی کابینہ بنانے پر بھی مامور ہو گی۔ انگلینڈ کے ہاؤس آف لارڈز کے بارہ سو ارکان ہیں جن میں سے ۵/۴ فیصد لارڈز اس مقام تک وراثتی طریقے سے پہنچے ہیں اور ان میں بقیہ انگلینڈ کے بااثر افراد، معروف لوگ اور مذہبی اور کلیسا کی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ انگلینڈ کی تیسری پارٹی لبرل ڈیموکریٹس ہے جو انگلینڈ کی دوسری چھوٹی پارٹیوں جیسے

نیشنل پارٹی آف سکاٹ لینڈ، نیشنل پارٹی آف ویلز اور شمالی آئرلینڈ کی متحدہ پارٹی کی طرح ہمیشہ معتدل رہی ہے اور قومی سطح پر اقتدار حاصل کرنے میں ناکام بھی۔

لیکن انگلینڈ کو درپیش آئندہ مشکلات اور موجودہ سیاسی پارٹیوں کا بحران آج کے انتخابات سے بہت زیادہ پیچیدہ اور گہرا ہوگا۔ انگلینڈ تنگنائے جبل الطارق اور اٹلینٹک اور بحر الکاہل میں چند چھوٹے چھوٹے جزیروں کے علاوہ اپنی تمام کالونیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، اس کے باوجود یورپی یونین کی مکمل رکنیت اور یورپی سوسائٹی کی ذمہ داریوں کو اپنے ذمہ لینے کے لیے بھی حاضر نہیں۔ دوسری طرف شاہی خاندان سے لیکر سیاسی پارٹیوں تک کے وہ روایتی ادارے جو گذشتہ دو صدیوں سے انگلینڈ کے اس نظام کے جواز اور دوام کو سنبھالے ہوئے تھے، سب تزلزل اور بحرانی کیفیت سے دوچار ہیں۔ انگلینڈ جو صنعتی انقلاب کی ماں بھی تھا اور محلِّ ولادت بھی، اس کی بیرونی سرمایہ کاری اور حکومات کی اقتصادی گلوبلائزیشن نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب کے جدید دور کی طرف موڑ دیا ہے۔ اس وقت انگلینڈ میں صرف ایک فیصد مزدور زراعت میں مشغول ہیں، جبکہ ۲۰ فیصد کارخانوں اور ۷۵ فیصد سرکاری نوکری اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے وابستہ ہیں۔

گذشتہ چند دہائیوں میں انگلینڈ میں قومی اور مذہبی اقلیتوں میں اضافے کے ساتھ ایک ملین سے زائد مسلمان اور تقریباً پانچ لاکھ ہندوستانی یہاں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

کیا انگلینڈ دو سو سال پہلے کے "صنعتی انقلاب" کی مہارت کے ساتھ عصر حاضر کے "انفارمیشن ٹیکنالوجی" کے انقلاب کو سنبھال سکے گا؟ ایک صدی قبل انگلینڈ کے دولت مند اور خوشحال افراد اس کے مقبوضہ ممالک میں بغیر کسی اجتماعی ذمہ داری اور پریشانی کے ایک خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ آج انہیں مقبوضہ ممالک کے دولت مند اور خوشحال طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد بغیر کسی ذمہ داری اور ملک کے نچلے درجے کے افراد کے حوالے سے پریشانی کے، لندن اور انگلینڈ کے دوسرے شہروں میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ حال اور مستقبل میں وہ چیز جس کی انگلینڈ کو سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ انگلینڈ کے پاس ایسے جدید سیاسی اور اجتماعی نمونے "Pattern" ہونے چاہئیں جن سے عوام کی ضرورتوں اور مشکلات کو حل کیا جاسکے اور فکری و نفسیاتی الجھنوں کو کم کرکے زنگ آلود سامراجی اداروں کو ختم کیا جاسکے۔

جنوری ۱۹۹۸ء میں سابق سوویت یونین کے زوال کے ٹھیک آٹھ سال بعد ماسکو کے ریڈ اسکوائر میں ایک دلچسپ منظر دیکھا گیا۔ سابق سوویت یونین کے صدر اور کمیونسٹ راہنما میخائل گورباچوف جو کئی سال اس جگہ ریڈ آرمی کی پریڈ دیکھا کرتے تھے، آج ایک امریکی اشتہاری کمپنی کے کیمرہ کے سامنے امریکہ کی مشہور برگر کمپنی کی ایڈورٹائزمنٹ میں مصروف تھے۔ ۱۹۸۰ء میں گورباچوف نے اپنی مخصوص پالیسیوں اور امریکہ کی رغبت کے ساتھ سابق سوویت یونین کے فرسودہ نظام کے زوال کے عمل کو تیز کیا، بلکہ ان کی امریکہ دوست اصلاحات نے روس کے جانشینوں کی مدد سے امریکی سرمایہ داری کے تمدن کے لیے دروازے بھی کھول دیے۔ اور یوں انہوں نے روس اور سابق سوویت یونین کو مغربی سول سوسائٹی کے قریب تر کر دیا جس کا ایک پہلو "بازار اور سرمایہ دارانہ اقتصاد" تھا۔ ۔ اب ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے سابق سوویت یونین میں لبرلزم اور اصلاح کا چیمپئن، امریکہ کے اقتصادی، اطلاعاتی اور پروپیگنڈہ جال میں ایسا پھنسا ہے کہ محض چند ملین ڈالر کی خاطر عالمی سطح پر ٹیلی ویژن پر پیتزا کے اشتہار کا سٹار بنا ہوا ہے۔

تمدن صرف علوم، فنون، لٹریچر، فلسفہ اور فنز کس وغیرہ کا نام نہیں ہے۔ ہم عام طور پر اس وقت تمدن کو زیر بحث لاتے ہیں جب اقدار بہت وسیع اور زیادہ کلی تناظر میں ہوں۔ اس بنا پر تمدن کا مفہوم، تمام اقدار من جملہ ایسی تمام اقتصادی اقدار کو بھی شامل ہے جو تمام انسانوں کے لیے قابل قبول اور قابل عمل ہوں۔ گورباچوف کا یہ نیا کارنامہ کہاں تک امریکہ کے سرمایہ دارانہ تمدن کی ماہیت کی نمائندگی کرتا ہے اور کہاں تک قومی وقار یا اس کی حقارت کی عکاسی کرتا ہے؟

وہ چیز جو آج بوڈاپسٹ، پراگ اور ماسکو جیسے روسی شہروں میں دیکھنے کو مل رہی ہے، وہ موجودہ امریکی تمدن کی اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی اقدار کی تسلط پسندی اور ایک قسم کا حملہ ہے اور گورباچوف اور اس قسم کے افراد کا ہر روز دنیا کے مختلف کونوں سے یوں ظاہر ہونا آج کل عالمگیریت یا گلوبلائزیشن کی ایک جھلک ہے۔ لیکن یہ ایسی چیز ہے جو اس صدی میں "امریکن لائف سٹائل" کے نام سے مشہور ہو چکی ہے۔ معاشرہ کی گلوبلائزیشن شاید ہمارے لیے پسندیدہ ہو لیکن وہ چیز جو اہمیت کی حامل ہے وہ اس گلوبلائزیشن کی جہت اور رُخ ہے۔

روس پچھلے تین سو سال یعنی "گریٹ پیٹر" کے دور سے چار مرتبہ کوشش کر چکا ہے کہ خود کو مغربی جدیدیت اور ماڈرنزم کے قریب کر سکے اور ہر مرتبہ شکست اور پہلے سے زیادہ پسپائی نصیب ہوئی ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں روس کا بحران اسی کا ایک نیا روپ ہے۔ ۱۹۹۰ء کے آغاز میں سابق سوویت یونین ایک سماجی بغاوت کے نتیجہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس بغاوت کے دوران روس قدرت وطاقت کا محوری نقطہ تھا اور پچھتّر سال کی سوشلسٹ جدیدیت کے حصول کی کوشش کے بعد مرکزی ایشیا کی تمام ریاستوں کے ساتھ روس نے بھی مارکسزم اور لیننزم کو خداحافظ کہہ دیا۔ لیکن ماسکو نے بجائے اس کے کہ اپنی تہذیب اور معاشرے کے لیے ایک مستقل اور جدید نمونہ پیش کرتا بلا چون و چرا امریکی رہبری اور مغربی سرمایہ دارانہ سسٹم کی آغوش میں چلا گیا۔ آج یہ وسیع و عریض ملک اپنے ہزاروں ایٹمی ہتھیاروں، لاکھوں دانشوروں، ڈاکٹروں اور انجنیئروں کی موجودگی کے باوجود سیاسی اور اقتصادی طور پر مکمل دیوالیہ "Bankrupt" ہونے جارہا ہے۔ ایک ایسا دیوالیہ پن "Bankruptcy" جس کی پہلے سے پیشین گوئی ہوچکی ہے۔ اور ممکن ہے یہ روس کے لیے ایک جدید انقلاب کا پیش خیمہ بنے۔ ٹھیک ایک سو سال پہلے کی بات ہے جب روس کی تزاری حکومت ایران جیسے ممالک کو متعدد قرض دے کر ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے اسٹریٹیجک خطوں میں اپنا نفوذ بڑھا رہا تھا۔ آج یہی روس ایک ہی صدی میں تزاری اور کیمونسٹ دو سلطنتوں کے سقوط کے بعد امریکہ اور آئی ایم ایف کے قرضوں تلے دبے جارہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ واشنگٹن کے پاس مکمل طور پر سیاسی اور اقتصادی کنٹرول نہیں۔ اپنی گذشتہ ایک صدی کی تاریخ پڑھنے والے روسیوں کو اپنی ان تاریخی تبدیلیوں سے غمگین ہونا چاہئے۔ روس کی آج کی اقتصادی اور اجتماعی حالت دوسری جنگ عظیم کے بعد ایران اور ترکی جیسے "تیسری دنیا" کے ممالک کی حالت سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ کئی ملین مزدوروں، کارکنوں اور استادوں کی کئی ماہ کی تنخواہیں لٹکی ہوئی ہیں۔ ضرورت کی عام اشیاء کی قیمتیں بڑی تیزی سے اوپر گئی ہیں بنیادی صحت اور ہسپتالوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور سب سے بدتر یہ کہ مقامی کرنسی "روبل" کی بازار میں قیمت کے گر جانے کی وجہ سے گذشتہ سالوں میں عوام فارن کرنسی خریدنے کی ہمت کھو بیٹھے ہیں بلکہ بینکوں نے اپنے صارفین کو رقم دینا بھی وقتی طور پر بند کردیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ملک میں "Open Market" نامی اقتصاد گذشتہ چند سالوں میں کچھ افراد کو ملینئر اور اکثر کو فقیر بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

ایک طرف جہاں روس کا دارالخلافہ ماسکو، نیویارک اور لندن کا ظاہری نمونہ ہے وہاں دوسری طرف ملک کے دوسرے شہر اور دیہات اس صدی کے سب سے برے اجتماعی اور اقتصادی حالات سے گزر رہے

ہیں۔ ملک میں امن و امان تباہ ہو چکا ہے اور ملک کے اندر بڑی بڑی نیشنل اور انٹر نیشنل کمپنیوں کے مالک اور دولتمند افراد پرائیوٹ گارڈز کی خدمات لینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ روس میں آنے والا ہر سیاح یہ ماننے کو تیار نہیں کہ یہ ملک کبھی دنیا کی دو عظیم طاقتوں میں سے ایک تھا۔ مختصر یہ کہ اس بار ملک کے مفکرین اور آزاد خیال افراد کی جانب سے کسی آلٹرنیٹیو پیٹرن "Alternative pattern" یا "متبادل نمونے" کے بغیر ہی روس کیپٹلزم یا سرمایہ داری نظام کے خلاف بغاوت کے دھانے پر ہے۔

روس کا موجودہ بحران کوئی اقتصادی یا مالی بحران نہیں، کمیونزم کے سقوط کے بعد ملک کے سیاسی نظام نے مغرب میں ڈیموکریسی کے مرسوم نمونوں کی تقلید کرنے کی تھوڑی بہت کوشش کی۔ "سول سوسائٹی" "پلورلزم"، "ڈیموکریسی اور آزادی" روس کے آزاد خیال اور انٹیلیجنٹ طبقے کی روزانہ کی بحثیں ہیں۔ وہ موضوعات جو "Bolshevik Revolution" "بلشوک انقلاب" سے پہلے روس میں اور یورپ میں بھی مناظروں کی وجہ بنے رہے جو بالاخرہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم، فاشزم، سوشلزم، امریکی کیپٹلزم اور لبرلزم کے ظہور پر ہی منتہی ہوئے۔

پچھلے کئی سالوں میں روس میں سول سوسائٹی اور ڈیموکریسی کے امکان اور ترقی کو دو جدید مسائل نے بہت سے نقصانات پہنچائے ہیں۔ ایک، روسی سوسائٹی کے موقع پرست جاہ طلب طبقے اور سیاسی دلالوں کے ہاتھوں بہت سی پارٹیوں کی تاسیس اور تشکیل۔ اور دوسرا، ملکی پریس اور میڈیا کے موجودہ سسٹم کے چند سرمایہ داروں اور اقتدار پسند افراد کے ہاتھوں میں محصور ہو جانا۔ کل کی مہیب اور کمیونسٹ حکومت، اور اس کے فرسودہ پریس نے اپنی جگہ ان چند سیاسی پارٹیوں کو دے دی ہے جنہیں زیادہ تر، آج کے جدیدیت پسند سرمایہ دار افراد چلاتے ہیں، اور کنٹرول کرتے ہیں۔ اسی طرح سوشلزم اور کمیونزم کے حامی بھی اپنا حلیہ بدل کر موجودہ نظام میں اپنے سیاسی اور مالی حقوق کے تحفظ خاص طور پر ملکی پارلیمنٹ "دوما" میں باقی رہنے کے لیے سیاسی کھلاڑیوں کے ساتھ جا ملے ہیں اور موجودہ نظام کے مصلحتی اور دوستانہ مخالفت کا کردار ادار کر رہے ہیں۔ روسی صدارتی نظام کہ جس کے ہاتھ میں نسبتاً زیادہ طاقت اور اختیارات ہیں یورپ اور امریکہ میں موجود صدارتی نظاموں کے ساتھ ذرہ بھر شباہت نہیں رکھتا اور جیسا کہ پوٹین اور یلٹسن کا دور حکومت اس بات کا گواہ ہے کہ یہ نظام درحقیقت ایک ایسے بادشاہی نظام میں تبدیل ہو گیا ہے جو انتخابات

کے نتیجہ میں اُوپر آئے۔ ایسے انتخابات جن میں واشنگٹن، ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا ہمیشہ سے اہم کردار رہا ہے۔

الیگزنڈر سولجنٹیسن، روس کا معروف مصنف جو کیمیونسٹ حکومت کے دور میں بھاگ کر امریکہ میں پناہ گزین ہو گیا تھا، کچھ عرصہ پہلے دوبارہ روس واپس چلا گیا۔ وہ اس سال کے اپنے ایک مقالے میں روس کے موجودہ کیپٹلسٹ نظام کو روسی سماج کے جذبات اور امنگوں کو کچلنے کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ سرد جنگ کے دوران سوویت یونین کا اسٹریٹجی سپیشلسٹ ایلیکسی آریاٹوف جو سقوط سوویت یونین میں "Open market" کے حامی مغربی دھڑے سے جا ملا تھا اور اس وقت ممبر آف پارلیمنٹ ہے، اس کا ماننا ہے کہ

ملک اور ملکی اقتصاد کے "دیوالیہ ہونے" "Bankruptcy" کو روکنا چاہئے۔

لیکن اس کام کے لیے کوئی چارہ بتائے بغیر کہتا ہے کہ:

"ماسکو میں روس کے لیے ضروری ہے کہ اقتصاد کی نجکاری کی طرف واپس لوٹے۔"

انسٹی ٹیوٹ آف امریکہ اینڈ کینیڈا اسٹڈیز کے پرنسپل سرگئی روگوف روسی نظام کی سب سے بڑی مشکل اس کی اقتصادی شکست کو قرار دیتے ہیں ان کے ہموطن ٹیلی ویژن کمنٹیٹر ایلیکسی یوشکوف اس پر اصرار کرتے ہیں کہ:

"مغربی لبرلزم کا نمونہ "Pattern" روس میں ایک انحصاری طرز حکومت "Regime" میں تبدیل ہو گیا ہے کہ جس میں پالیسی کو اوپن مارکیٹ اور ڈیموکریسی کے اداروں کی بجائے حکومت معین کرتی ہے۔"

گذشتہ چند سالوں میں روس کس طرح اس بحران اور بھنور میں پھنس گیا ہے؟ میکسیکو میں تین سال قبل کا اقتصادی اور مالی بحران، ایک سال پہلے تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور جنوبی کوریا کے بحران جن میں مغربی سرمایہ داروں بالخصوص امریکہ کا براہ راست کردار رہا ہے، غیر ضروری ترقیاتی خرچ اور افراط زر روس کے اقتصادی نظام کے لیے خطرے کا الارم ہو سکتے تھے، لیکن ماسکو کے پالیسی میکر حضرات نے ان تبدیلیوں سے غفلت برتتے ہوئے مغرب اور ورلڈ بینک سے بڑے بڑے قرضے لینے اور ماسکو شیئر مارکیٹ میں سرمایہ کاری کرنے والی کمپنیوں کے حصص کی قیمتوں میں ظاہری اضافہ کرنے کی اقتصادی پالیسی کو جاری رکھا۔

مرکزی اور مشرقی یورپی ممالک میں سوشلسٹ اور کیمونسٹ نظام کی تبدیلی کو ایک عشرہ ہونے والا ہے لیکن ابھی تک سول سوسائٹی کا وعدہ (جس کے تحت انہوں نے اپنی اصلاحی تحریکوں کا آغاز کیا تھا) پورا نہیں ہوا۔(۱۰۸) ایک سرمایہ دارانہ اور مصرفی سوسائٹی میں منتقل ہونے میں ان ممالک کو بہت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔(۱۰۹) ۱۹۸۹ء میں کیمونزم دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے پہلے اور سوویت یونین اور اس سے جڑے نظاموں کے زوال جو یورپ میں ختم ہوئے، مرکزی اور مشرقی یورپ کے معاشرے "سوشلسٹ معاشرے"، کیمیونسٹ معاشرے" "اقتدار پسند معاشرے" اور "حکومتی سرمایہ داری کے معاشرے" تھے۔ مغربی سیاسی اور عمرانیاتی قوانین مرکزی اور مشرقی یورپ کے معاشروں کو "تبدیل ہوتے معاشرے" "سامراج کے بعد کے معاشرے" "آزمائشی ڈیموکریسی کے معاشرے" اور "شخصیت پسند معاشرے" دیکھتے ہیں۔ مرکزی اور مشرقی یورپ کے اصلاحی آثار میں جو ایک کلی و نظریاتی اتفاق پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان ممالک کی "نرم انقلاب" سے مشہور بغاوتیں ایک تسلط پسند سرمایہ دارانہ معاشرے میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ایسا معاشرہ جہاں سیاسی و اقتصادی شخصیات، شدت پسند محبین وطن اور مختلف اداروں کے مجرم اہم کردار ادا کرتے ہیں۔(۱۱۰)

مرکزی اور مشرقی یورپ میں گذشتہ عشرے میں پریس اور میڈیا کی آزادی یا کلی طور پر کمیونیکشن انفراسٹرکچر جیسے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی ڈیموکریسی گرافیک تصویر کے عنوان سے ہونے والے مطالعات اور تحقیقات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگرچہ یہ ممالک سوشلسٹ اور کمیونسٹ دور کی ایک پارٹی اقتدار کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن کمیونسٹ اور سرمایہ دارانہ سسٹم سے جدا اور اپنے معاشرے سے ہم آہنگ نظام کی تاسیس و تشکیل میں ناکام رہے ہیں۔ میڈیا پر کنٹرول اب حکومت کی بجائے تجارتی کمپنیوں کے ہاتھوں چلا گیا ہے۔ میڈیا پر سے سینسر کا ختم ہو جانا مرکزی اور مشرقی یورپ کے معاشروں کی ایک بہت بڑی فتح تھی لیکن اس طرح کے اقدام کے لیے پبلک میڈیا کے مخاطبین کے اطلاعاتی اور ارتباطی حقوق کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکے۔ ان ممالک میں سول سوسائٹی کی ترویج اور توسیع کے لیے پریس اور میڈیا کے انفراسٹرکچر میں ہونے والی تخلیقی تبدیلیاں بہت آہستہ، خاموش اور نامحسوس رہی ہیں۔ (۱۱۱)

۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۹ء کے درمیان بلغاریہ اور جمہوریہ چک کی سول سوسائٹی اور براڈکاسٹنگ کے بارے میں ایک سماجی تحقیقاتی پراجیکٹ عمل میں آیا اور جس کا محقق ایک بلغاری باشندہ تھا۔ اس تحقیق سے پتہ چلا

کہ گذشتہ عشرے میں اس ملک میں سول سوسائٹی کی بنیاد محسوب ہونے والا میڈیا، اور کمیونیکشن میں اصلاح طلبی کا معاملہ، نئی صدی کے شروع ہونے پر ایک بند گلی پر کھڑا ہے۔ (۱۱۲) ان دونوں ممالک میں پائی جانے والی کشمکش اور لڑائی در حقیقت ان کے حکام اور تاجروں کے درمیان ہے اور عوام اور جمہوری ادارے اس میں اپنا کوئی خاص کردار ادا نہیں کر سکتے۔ کمیونسٹ نظام کے سقوط کے بعد مختلف پارٹیوں سے تشکیل پانے والے حکومتیں دائیں بازو اور بائیں بازو کی طرف رجحانات سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کوشش میں ہیں۔ وہ چاہے مالکانہ اعتبار سے یا پلاننگ کے ذریعے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اپنا اثر و رسوخ باقی رکھیں۔ اس کے مقابلے میں بڑی بڑی قومی اور بین الاقوامی میڈیا کمپنیوں کی یہ کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس موجودہ نامعلوم حالت سے فائدہ اٹھائیں اور ان ممالک کے لیے ایک مکمل امریکی تجارتی نمونے کو عملی جامہ پہنائیں۔ "عمومی فضا" کا تنگ راستہ کہ جس کے ذریعے بلغاریہ اور جمہوریہ چک کی سول سوسائٹی ایک ذمہ دار اور عوامی نمائندہ میڈیا سسٹم وجود میں لا سکتی ہے۔ براعظم یورپ کی بنیادی اور اساسی مشکل بنا ہوا ہے۔ مغربی یورپ میں تہذیبی صنعت کی نجکاری، تجارتی اہداف کے حصول کے لیے گذشتہ چند سالوں میں یورپی یونین کی پالیسیاں اور بلغاریہ اور جمہوریہ چک جیسے مشرقی یورپی ممالک کی برسلز بیوروکریسی کے ساتھ قریبی تعلقات کی کوششوں کی وجہ سے میڈیا کی اصلاح طلبی کا مستقبل مالکان کے اس خطے میں بدگمانی کا شکار ہو چکا ہے۔ (۱۱۳) سیاسی پارٹیوں اور دھڑوں نے تجارتی سوداگری کے یورپ میں سول سوسائٹی کے لیے ایک نیا ماحول تشکیل دے دیا ہے۔ کلی طور پر گذشتہ دہائیوں میں سیاسی پارٹیوں پر لوگوں کے اعتماد اور اطمینان نے ایک نزولی قوس طے کی ہے۔ بعض ممالک میں حالیہ انتخابات میں لوگوں کا نئی پارٹیوں اور نئی تنظیموں کی طرف جھکاؤ در حقیقت اُن کا سیاسی پارٹیوں کے دل افتادہ ہو جانے پر دلالت کرتا ہے اور اُن کی ساری کوشش و جستجو ایک جدید نمونے اور سیاسی امور میں شرکت کے لیے اور نئی تنظیموں کے لیے ہے۔ (۱۱۴)

کیا وجہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں خاص طور پر عوام اور رائے عامہ کی نظروں میں متزلزل اور بحرانی کیفیت میں ہیں؟ اگرچہ مختلف سیاسی اور قومی نظاموں کے حوالے سے متعدد دلائل دیے جا سکتے ہیں لیکن اس تزلزل کے مشترک اور اصل عوامل کو تمام جوانب سے مندرجہ ذیل طریقے سے خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ رائے عامہ کی نظر میں سیاسی پارٹیاں نفاق اور تجزیہ کی عکاسی تو کرتی ہیں لیکن قومی اتحاد Unity، Motivation کا وسیلہ نہیں ہیں۔

۲۔ سیاسی پارٹیاں سیاسی طاقت اور اختیارات کے حصول میں تمام شرعی، عرفی اور اخلاقی اصولوں کو پاؤں تلے روند دیتی ہیں۔

۳۔ سیاسی پارٹیوں کے پاس ایسے معین پروگرام اور راہ حل موجود نہیں جو عوام اور معاشرے کی تہذیبی، اجتماعی اور اقتصادی مشکلات کو دور کر سکیں۔

۴۔ سیاسی جماعتوں کے اندر انفرادی اور اجتماعی پیمانے پر لوٹ کھسوٹ جاری ہے اور سیاسی پارٹی لیڈروں کے درمیان مالی بدعنوانیوں اور بدقماریوں کی وجہ سے عوام کا ان سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔

۵۔ عوام کے نزدیک رہنے اور براہ راست رابطے میں رہنے کے حوالے سے سیاسی پارٹیاں اپنا اعتبار کھو بیٹھی ہیں اور مالی و اقتصادی ایجنسیوں اور دوسرے عناصر اور اسی طرح مارکیٹیں حاصل کرنے کی روش اختیار کر کے انسانی و گروہی تعلقات کو ایک قسم کے معاملے "Transaction" اور اشتہار کی صورت میں تبدیل کر رہی ہیں۔

۶۔ مدتوں سیاسی پارٹیوں پر انحصار کرنے والے افراد اور گروہوں کی آمادگی کو کمپیوٹر، ٹیلی ویژن اور سیٹلائٹ جیسے الیکٹرانک انفارمیشنل نیٹ ورک نے الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہے اور اب بہت سے گروپ ان نیٹ ورکس اور روایتی اداروں پر بھروسہ کرکے قدیم اور باقاعدہ سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں۔ سیاسی قیادت اپنی معنوی اور قائدانہ ساکھ کھو بیٹھی ہے اور طاقت و اختیارات کو اجتماعی مفادات پر ترجیح کی وجہ سے لوگوں میں اب ان کی محبت باقی نہیں رہی۔

سیاسی پارٹیوں کی موجودہ صورت (کہ جس میں وہ سیاسی امور میں شرکت کریں) ایک مغربی معاملہ ہے اور جس کی پیدائش اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں امریکہ میں ہوا (۱۱۵)۔ یورپ میں ایک عرصے تک پارٹی سرگرمیوں اور کوششوں کو سیاسی حیثیت حاصل نہ تھی۔ مثال کے طور پر برطانوی مفکر ہینری سینٹ جان ولسکنٹ بولن بروک سیاسی پارٹیوں کو ڈیموکریسی کے لیے "شرارت اور سیاسی زیاں" سمجھتا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ سیاسی پارٹیاں اپنے ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دیتی ہیں۔ انیسویں صدی سے قبل صرف ایڈمنڈ بورک نامی ایک سیاسی دانشور، سیاسی پارٹیوں کا دفاع کرتا تھا۔ اس کی نظر میں سیاسی پارٹیاں، متحد ارکان کا ایک ایسا ادارہ ہیں جو متفقہ اصولوں اور قوانین کے تحت قومی مفادات کو مشترکہ طور پر ترجیح دیتے ہیں۔

سیاسی پارٹیوں کے بارے میں ایڈمنڈ بورک کا نظریہ سالوں مغربی لیڈروں من جملہ جمہوریہ امریکہ کے معماروں اور ابتدائی صدور کے نزدیک مشکوک رہا۔ ۱۷۹۶ء میں امریکہ کے سب سے پہلے صدر جارج واشنگٹن نے اپنی صدارت کی الوداعی تقریب میں سیاسی پارٹیوں کے نقصانات کے بارے میں گفتگو کی۔ جارج واشنگٹن کی طرح ایک اور امریکی صدر جیمز میڈیسن نے عوام اور مختلف گروہوں کے سیاسی امور، انتخابات اور فیصلہ سازی میں شرکت پر بہت توجہ دی لیکن ملکی آئین میں سیاسی پارٹیوں کے لیے جگہ بنانے میں ناکام رہا، امریکہ کے ابتدائی سیاسی مفکرین اور پیشواؤں میں تھامس جیفرسن جو امریکی صدر بننے کے علاوہ خود ایک سیاسی پارٹی کا بانی بھی تھا، سیاسی پارٹیوں کے حوالے سے بدگمان تھا اور اپنے ایک دوست کو لکھتا ہے:

اس ملک (امریکہ) میں پارٹی تقسیم ہمارے شائستہ گرافوں میں موجود نہیں۔

جارج واشنگٹن کے زمانے میں اقتدار اور آئین کے بارے میں تھامس جیفرسن اور ہیملٹن کے درمیان معروف بحث پہلی بار ان دو سیاسی لیڈروں کو دو دھڑوں یعنی فیڈلسٹ اور ری پبلکن میں امریکی کانگریس کے ارکان کو سیاسی بلوغ Matiration کی طرف لے آئی۔ مقامی انتخابات میں چاہیں امریکہ میں ہوں یا یورپ میں ان میں پارٹیوں کے نفوذ کو کئی سال لگ گئے اور کئی عشروں بعد اُبھر کر سامنے آئیں (۱۱۶)۔

آج امریکہ، یورپ اور جاپان جیسے صنعتی ممالک جو سرمایہ دارانہ نظام پر اعتماد کئے ہوئے ہیں ان میں مقنّنہ کے نمائندہ ارکان کے انتخاب اور حکومت کی تشکیل کے طریقے سیاسی پارٹیوں کے معیاروں کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ بہت سے دوسرے ممالک جیسے ایشیا، جنوبی امریکہ اور افریقہ جو صنعتی ہونے کی حالت میں ہیں اور وہاں سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ نظام مخلوط ہو کر حکومت کر رہے ہیں وہاں بھی ایک پارٹی اور متعدد پارٹیوں کا فارمولا چل رہا ہے۔ مثال کے طور پر جہاں چین اور کیوبا سوشلسٹ واحد پارٹی یا حزب رکھنے والے ممالک کا نمونہ ہیں، وہاں صنعتی ہونے کی حالت میں بھارت، برازیل اور جنوبی افریقہ جیسے ممالک متعدد پارٹیوں کا ایسا نمونہ ہیں، جہاں سرمایہ دارانہ نظام کی طرف دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پر چلنے والے ممالک چاہے صنعتی ہوں یا ترقی پذیر ان کے مشخص سیاسی نظاموں کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے، جو متعدد دوسری پارٹیوں کی موجودگی کے باوجود پچھلی نصف صدی سے ایک ہی پارٹی کے ہاتھ میں ہے اس لیے یہ ممالک درحقیقت ایک پارٹی حکومت کے تحت رہے ہیں۔ اٹلی، میکسیکو،

انڈیا اور جاپان کی حکومتیں یہاں کچھ عرصہ پہلے تک (اور میکسیکو تقریباً ایک سو سال تک) ایک ہی پارٹی کے ہاتھ میں رہے ہیں۔ جبکہ دوسری پارٹیاں ان نظاموں کی حکومت اور کابینہ میں نفوذ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ تیسری دنیا اور خاص طور پر اسلامی ممالک میں سول سوسائٹی کے اثرات زیادہ تر مغربی نظریات پر مبنی ہونے کی وجہ سے بہت ناقص ہیں۔ (۱۱۷)

تمام نظاموں میں چاہے صنعتی ہوں یا نیم صنعتی، سوشلسٹ ہوں یا سرمایہ دارانہ سیاسی پارٹیوں کی اگرچہ یہ کوشش رہی ہے کہ اختیارات کے حصول پر اپنی گرفت مضبوط کریں اور بعض مقامات پر انہیں کامیابی بھی ملی ہے، لیکن ایسے اراکین کے بطور جو عوامی امنگوں کو عملی جامہ پہنا سکیں اور سیاسی نظام میں موثر کردار ادار کر سکیں ان کی حیثیت اور ساکھ میں مسلسل کمی آ رہی ہے۔ یہ خود ہمارے زمانے میں سیاسی بحران کا ایک سرچشمہ ہے۔ جب تک پارٹی سازی کے حوالے سے بنیادی اصطلاحات اور تجدید نظر نہیں ہوتی، پارٹیاں اور سیاسی نظام ان اتہامات اور مشکلات سے دُوچار ہوتے رہیں گے۔ (۱۱۸) ہر نظام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خلاقیت کی مدد سے موثر سیاسی پارٹی کا نمونہ پیش کرے۔

روس سے لے کر فرانس اور امریکہ تک ہر قسم کی سیاسی پارٹیاں (چاہے لبرل، چاہے کنزرویٹو، چاہے کمیونسٹ یا سوشل ڈیموکریٹ) جو پچھلی نصف صدی میں یورپ اور امریکہ میں طاقت کا مظہر اور یہاں کے سیاسی نظاموں کو مضبوط کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں، اب بتدریج اپنی حکمرانی کی توانائی کھو چکی ہیں۔ بیسویں صدی کے آخری دہائی کے اختتام اور نئے ہزاری کی ابتدا میں ایک بہت سنجیدہ اور اہم مسئلہ پیش آیا ہے کہ کلی طور پر سیاسی پارٹیاں جس طرح معاصر دور میں پھلی پھولی ہیں اور ایک طاقت بن کر سامنے آئی ہیں، کیا ڈیموکریسی اور سیاسی نظاموں کو مضبوط کرنے اور ان کے لیے مفید ثابت ہوئی ہیں یا ان کا روایتی قومی حکومتی اور موجود سول سوسائٹی کے معیاروں میں دوام غیر مفید یا حتی سیاسی خسارت کا باعث ہے؟ اگر سیاسی پارٹیاں مغرب میں اپنی قوس نزول کو طے کر رہی ہیں تو سیاسی طاقتوں کی اس اتھل پتھل میں کون سے دوسرے ادارے اور جماعتیں ان کی جگہ لیں گے؟ کون سے دوسرے طریقے اور سیاسی اصول ان سیاسی پارٹیوں کی جگہ پر آئیں گے اور کن شرائط پر؟ کیا ہم مغرب میں ایک جبری اور ناقابل اجتناب سیاسی تبدیلی کے بالکل قریب ہیں؟ وہ غیر یورپی، امریکی یا مشرقی ممالک جو کئی سالوں سے مغربی سیاسی پارٹیوں کے اصول کو اپنی وجہ ہمت قرار دیتے رہے ہیں اور آزمائشی طور پر اور اکثر ناکام صورت میں اسی سیاسی روش اور اصول

کی پیروی کرتے رہے ہیں، مغرب کے ان تلخ تجربات سے کیا درس حاصل کریں گے؟ اسلامی تہذیب و تمدن اور وہ اسلامی ممالک اور معاشرے جہاں امریکی اور یورپی نظاموں کی جگہ اسلامی نظام رائج ہوگا وہ کون سی تھیوری، فکر اور ادارے جو سیاسی اصالت کے حامل ہوں گے اور آج کے فرسودہ سیاسی پارٹیوں کے پیرامیٹر کی جگہ لیں گے یا لے سکتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں دوسروں کی دوبارہ تقلید کی بجائے سیاسی حیثیت اور اصالت کو کون سے نمونے اور فارمولے ہونے چاہئیں۔

آج ایک سالم معاشرے کی سب سے پہلی خصوصیت خود "سوسائٹی" کے معنی اور مفہوم کو درک کرنا اور اس کا "انسانی معاشرہ" کی ذات اور فطرت کے خلاف نہ ہونا ہے کہ جس کے ہم سب ایک رکن ہیں۔ با الفاظ دیگر ایک واحد سماج کی سلامتی کا خود معاشرے کے افراد کے نزدیک اس کی شکل، ادراک اور علم کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ سالم معاشرے کی دوسری خصوصیت مادیات اور معنویات کے درمیان توازن ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں مادیات کی چکا چوند روشنی میں معنویات مدہم پڑ جائیں، ایک سالم معاشرہ نہیں ہو سکتا اور ایسا معاشرہ آج کے انسان اور معاشروں کی بیچارگی، اداسی، افسردگی، روحانی اور نفسیاتی بے چینی اور افتراق کا مظہر ہوتا ہے۔ صحت مند اور سالم معاشرے کی تیسری خصوصیت صحت مند آرزوؤں کے لیے افراد کے درمیان مضبوط باہمی تعلقات، تعاون، ایثار اور درگذر اور مضر انسانی خواہشات، عادات اور طور طریقوں کے خلاف صحت مند اور سالم معاشرے کی تیسری خصوصیت صحت مند آرزوؤں کے حصول اور مضر انسانی خواہشات، کردار اور اطوار کے خلاف افراد کے درمیان مضبوط باہمی تعلقات، تعاون، ایثار اور درگزر پایا جائے۔ باہمی تعاون اور تعلقات کے اس احساس کو صدیوں پہلے ابن خلدون جیسے مفکروں نے "عصبیت" کے مفہوم میں پیش کیا اور اس کو ایک خاندان، معاشرے اور حکومت کی تشکیل کا لازمی شرط جانا ہے۔ صحت مند معاشرے کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ افراد اپنے معاشرے کے ماضی، حال اور مستقبل کی منظر کشی کر سکتے ہوں۔ معاشروں کے لیے مستقبل، ماضی اور حال کی تصویر بہت اہم ہے۔ جو معاشرے یہ نہیں جانتے کہ کدھر جا رہے ہیں وہ معاشرے دوسروں کے بنائے ہوئے نقشوں اور تصاویر کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ ایک معاشرے کے افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آئندہ سے باخبر ہوں اور اس پر یقین رکھیں اور اس تک پہنچنے کے لیے حرکت کریں۔ معاشرے کی تبدیلی زمان و مکان میں ایک مسلسل تحریک کا

نام ہے۔ معاشروں کا تغیر و تبدل کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ تغیر و تبدل ایک بیرونی عامل نہیں بلکہ انسانوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پنہاں ہے۔

کتابیات

1. Tocqueville, Alex: Democracy in America, NY, Vintage Books, 1954.
2. Mowlana, Hamid: "Civil Society, Information Society, and Islamic Society", in Information Society and Civil Society, edited by Slavko Splichal, Andrew Calabrese, and Colin Sparks, West Lafayatte, Purdue University Press, 1994, pp .208-232.
3. Mowlana, Hamid: "The New Global Order and Cultural Ecology" , in Philip Schlesinger and Hamid Mowlana, eds., "Islam and Communication" , Media, Culture and Society, Vol, 15, No,1. 1993, pp .9-27.
4. Smith, Adam: The Wealth of Nations ,New York, Modern Library, Random House, 1937.
5. Tocqueville, Alex: Old Regime and the French Revolution, Gloucester, MA, Peter Smith, 1978.
6. Madison, James: Notes of Debates in the Federal Connection of 1787, Athens, Ohio, Ohio University Press, 1976.
7. Machiavelli, Niccolo: Discourses on The First Ten Books of Titus Livius in Machiavelli: The Chief Works and Actors, Trans. Allan M. Gilbert, 3 Vols, Durham, Duke University Press, 1964.
8. Hobbes, Thomas: Leviathan, Oxford, Clarendon Press 1909.
9. Locke, John: Two Treatises of Government, London, Orion Publishing Group, 1993.

10. Hegel, George Wilhelm Friedrich: Elements of the Philosophy of Right, Cambridge, Cambridge University Press, 1991.
11. Marx, Karl: Critique of Hegel's "Philosophy of Right", Cambridge, Cambridge University Press, 1970.
12. Seligman, Adam B.: The Idea of Civil Society, NJ, Princeton Universtiy press, 1992.
13. Gramsci, Antonio: Prison Notebooks, NY, Columbia University Press, 1992.
14. Hobbes, Thomason: Leviathan, Oxford, Clarendon Press, 1909.
15. The works of Jhon Adams, ed. C.F. Adams, Boston, 1956.
16. Cohen, Jean L. and Arato, Andrew: Civil Society and Political Theory, Cambridge, MA, MIT Press 1994.
17. Polanyi, Karl: The Great Transformation: The Political and Economic Origin of Our Times, Boston, Beacon Press, 1944.
18. Locke, John: Two Treatises of Government, London, Orion Publishing Grouep, 1993; Gramsci, Antonio: Selections from Political Writings (1921. 1926), London, Lawrence and Wishart, 1957.
19. Henry, Clement M.: "Promoting Democracy: USAID, at Sea or off to Cyberspace", Middle East Policy, 1997, vol.5, No. 1, PP. 178-189.
20. Gardens, N: "Threats to Civil Society", Harper's Magazine, 1990, Vol. 281, No. 1682, PP. 25-27.
21. Howard, John A.: "American Society Has Lost Its Sense of Direction", Vital Speeches of the Day, December 1, 1992, Vol. 59, No. 4.
22. Ramet, Sabrina: Social Currents in Eastern Europe: The Sources and Consequences of the Great

Transformation, Durham, Duke University Press, 1995.
23. The Rule of Saint Benedict, in Latin & English, ed. Abbot Jystin McCann, Westminster, MD, Newman Press, 1952.
24. The utopia of sir thomas more, ed. William Dallam Armes, New York, Macmillan co., 1912.
25. Proudhon, P.J. : General Idea of the Revolution in The Nineteenth Century, trans. John Beverley Robinson, London, Freedom Press, 1923.
26. Marx, Karl: Capita!: A Critique of Political Economy, Chicago, C.H. Kerr and co., 1906.
27. Tocqueville, Alex: ,American Institutions and Their Influence, London, A.S. Barnes. 1851.
28. Augustine: The City of God, trans. Marcus Doob, New York. Random House, Modern library, 1905.
29. Newman, John Henry Cardinal: ,An Essay on the Development of Christian Dodrine, London, James Torey. 1845.
30. Reformation Writing of Martin Luther, trans. and ed. By Bertram Lee Woolf,
2 VoIs., London, Luttcrworth Prees, 1952.
31. Calvin, John: Tracts and Treatises on The Reformation of the Church, trans. Henry Bevcridge, 3 Vols., Grand Rapid, Michigan, Wm B. Ferdmans Publishing Co., 1958.
32. Kiekergaard, Soren: C'hristian Discourses, trans. Waliter Lowrie, New York, Oxford University Press, 1961.
33. Clausewitz. Karl Von: On War, trans. J.J. Graham. 3 Vol., London, Routledge and Kegan Paul, 1949.

34. Machiavelli. Niccolo: Discourses on The First Ten Books of Titus Livius in Machiavelli: The Chief Works and Actors, trans. Allan M. Gilbert, 3 Vols., Durham. Duke University Precs, 1964.
35. Marx, Karl: Civil War in France, NY, International Publishers, 1933.
36. Lenin. V.1. : What is to Be Done in Selected Works. 12 Vols., New York, International Publishers, 1929-43; Arcnd, Hannah: On Revolution, NY. Viking Press, 1963.
37. The Sociology of George Simmel, trans. Kurt Wolff. New York, Free Press,
1950.
38. Plato: Epistel 7, in Thirteen Epistles of Plato. trans. L.A. Post, Oxford. Clarendon Press, 1925.
39. Nisbet, Robert: The Quest for Community, New York. Oxford University Press. 1953.
40. Grotius, Hugo: The Rights of War and Peace, trane. A.G. Campbell, London, M. Walter Dunne. Universal Classics Library, 1901.
41. Clausewitz, Karl von: On War, trans. J.J. Graham. 3 Vol.. London. Routledge and Kegan Paul, 1949.
42. Clausewitz, Karl von: On War, trans. J.J. Graham, 3 Vol., London,Routledge and Kegan Paul, 1949; Fanon, Frants: The Wretched of the Earth,trans. ConstanCe Farrington, New York, Grove Press, 1968; Fanon. Frantz:Black Skin, White Masks, trans. Charles Lau Markmann, New York, Grove Press, 1967. Marx, Karl: Eighteenth Brumaire of Louis Bonaparte, NY. International Publishers, 1963.

43. Aristotle: Nichomachean Ethics, Mineola, NY, Dover Publishing, 1998 Marx, Karl: Civil War in the United States, NY, International Publishers, 1963.
44, Plato: Epistle 7, in Thirteen Epistles of Plato, trans. L.A. Post, Oxford. Clarendon Press, 1925.
45. Aristotle: Nichomachean Ethics Mineola, NY, Dover Publishing, 1998.
46. Jean Jacques, Rosseau: The Social Contract and Discourses, trans. G.D.H. Cole, Everyman'S Library Edition, E.P. Dutton, 1947.
47. The confessions of St. Augustine, trans. J.G. Pilkington, New York, Heritage Press, 1963.
48. Jenks, Edward: Law and Politics in the Middle Ages, New York, Henry Holt & Company, 1898; Pegis, Anton C.: Basic Writings of St. Thomas Aquinas, 2 VoIs., NY, 1945; Whitfield, John H.: Machiavelli, NY, Oxford University, 1947; Whitlield, John H.: The Prince, NY, Oxford, 1947.
49. Tawney. R.H.: Religion and the Rise of capitalism, NY, Harcourt Brace. 1926.
50. De Chateabriand, F.R: The Genius of Christianity, New York, 1922.
51. Newman, John Henry: Cardinal: An Essay on the Development of Christian, Doctrine, London, James Tory, 1845.
52. Kiekergaard, Soren: Christian Discourses, trans. Waliter Lowrie, NY, Oxford University Press, 1961; Schopenhaur, Arthur: The World as Will and Idea, Dover Publications Inc., 1819.
53. Conte, Auguste: Positive Philosophy, New York, 1855.

54. Weber, Max: The Protestant Ethics and the Spirit of Capitalism, trans. Alcott Parsons, NY, Charles Scribner's Sons, 1958.
55. Durkheim, Emile: The Elementary Forms of Religious Life, trans. Joseph Ward Swain, London, Allan & Unwin, 1915; Brinton, Crane: The Jacolins, New York, Russell and Russell, 1961.
56. Brinton, Crane: The Jacolins, NY, Russell and Russell, 1961.
57. Sorl, Georges: Reflections on Violence, trans. T.E. Hulme and J. Roth, London, Collier - Macmillan, 1961.
58. Proudhorn, P.J.: General Idea of the Revolution in Nineteenth Century, trans. John Beverly Robinson, London, Freedom Press, 1923.
59. Kropotkin, Peter: Preface to Mutual Aid: A Factor of Evolution, London, William Heineman, 1908.
60. Kropotkin, Peter: Fields, Factories, and Workshops: Or, Industry Combined with Agriculture and Brainwork with Manual Work, London, Thomas Nelson and Sons, 1898.
61. Mowlana, Hamid: Global Information and World Communication: New Frontiers in International Realations, Sage Publications, London, 1997; Aristotle: The Politics, Chicago, The University of Chicago Press, 1998.
62. Mowlana, Hamid: Global Communication in Transition: The End of Diversity?, Sage Publications, Thousand Oaks, California and London, 1996.
63. Aristotle: The Politics, Chicago, The University of Chicago Press, 1998.

64. Hobbes, Thomas: Leviathan, Oxford, Clarendon Press. 1909.
65. Locke, John: Second Treatise of Government, Indianapolis, Indiana, Hackett Publishing Co., 1980.
66. Colas, Dominique: Civil Society and Social Reconstruction, Washington, D.C., Council for Research on Values and Responsibility, 1997; Colas, Dominique: Civil Society and Fanaticism: Conjoined Histories, Stanford, CA, Stanford University Press, 1997.
67. Kant, Immanuel: Perpetual Peace: A Philosophical Essay, trans. M. Campbell Smith, London, Gerald Publishing, 1972.
68. Smith, Adam: The Wealth of Nations, NY, Modern Library, Random House, 1937.
69. Hegel, George Wilhelm Friedrich: The Philosophy of History, NY, Dover Publications, 1956.
70. Burke, Edmund: Reflections on the Revolution in France, NY, Holt, Reinhart, & Winston, 1965.
71. Johnson, David: The Idea of a Liberal Theory, Princeton, Princeton University Press, 1994.
72. Kumar, Kirishan: "Civil Society: An Inquiry in to the Usefulness of Historical Term", British Journal of Sociology, 1993, Vol. 44, No. 3, PP. 375-395; Bohman, J,: "Civil society and politial theory", American Political Science Review, 1993, Vol. 87, No. 1, PP. 198-199; Rosenblum, Narny L.: "Civil Societies: Liberalism and the Moral Uses of Pluralism, Social Research, 1994, Vol. 61, No. 3, PP. 539-562; Theorizing Citizenship, ed. Ronald Beiner, Albany, State University of New York Press, 1995;

Popper, Karl: The Open Society and its Enemies, 2 Vols., London, Roulledge and Kegan Paul, 1945.
73. Gramsci, Antonio: The Modern Prince, and Other Writings, London, Lawrence & Wishart, 1957.
74. Hegel. George Wilhelm Friedrich: Hegel's Political Writings, Oxford, Clarendon Press, 1964.
75. Hegel, George Wilhelm Friedrich: The Philosophy of Hegel, NY, Modern Library, 1954.
76. Mowlana, Hamid: "Roots of War", in Hamid Mowlana, George Gerbner and Herbert I. Schiller: Triumph of the Image: The Media's War in the Persian Gulf War - A Global Perspective, Boulder, Colorado, Westview Press, 1992, PP. 30-50.
77. Robinson, William: Promoting Polyarchy, NY, Cambridge, Cambridge University Press, 1996.
78. DahI, Robert: Polyarchy: Participation and Opposition. New Haven, Connecticut, Yale University Press, 1971.
79. DahI, Robert: Who Governs?, New Haven, Connecticut, Yale University Press, 1971,
80. Holmes, Stephen: Passions and Constraint: On the Theory of Liberal Democracy, Chicago, The University of Chicago Press, 1995.
81. Schumpeter, Joseph: Imperialism and Social Classes, Oxford University Press, 1951.

۸۲۔ مولانا حمید: مارا لجامی برند، اصلاحات کے بارے میں پروفیسر مولانا کے مقالات کا مجموعہ، تہران، ناشر کیہان، ۱۳۷۹۔

۸۳۔ ایضاً

۸۴۔ مولانا حمید: "بررسی ماہیت و عملکرد شورای روابط خارجی امریکا"، صبح، اردیبہشت ۱۳۷۷، نمبر ۱، ص ۱۴۔۱۸۔

۸۵۔ مولانا حمید: مارا کجا می برند، اصلاحات کے بارے میں پروفیسر مولانا کے مقالات کا مجموعہ، تہران، ناشر کیہان، ۱۳۷۹۔

86. Giddens, Anthony: The Consequences of Modernity, Cambridge UK, Polity Press, 1990.
87. Splichal, Slavko, Calabrese, Andrew and Sparks, colin: Information Society and Civil Society: Contemporary Perspectives on the Changing World Order, West Lafayette, IN, Purdue University Press, 1994.
88. Civil Society: Theory, History, Comparison, ed. John A. Hall, Cambridge UK, Polity Press, 1995.
89. Sorkinm, Pitirim A: Social and Cultural Dynamics, 4 Vols., NY. The Bedminster Press, 1962.
90, Salmon, Lester M.: "The Rise of the Nonprofit Sector", Foreign Affairs, 1996, Vol. 73, No. 4, PP. 109-122.
91. Gellner, E.: Conditions of Liberty: Civil Society and Its Rivals, NY, Penguin Press, 1994.

۹۲۔ رک؛ مولانا حمید، "چشم انداز"، کیہان، ۱۳۸۰۔۱۳۷۱۔

93. Aristotle: Nichomachean Ethics, Mineola, NY, Dover Publishing, 1998; De Lue, S.M.: Political Thinking, Political Theory, and Civil Socity, Boston, Allyn & Unwin, 1997.
94. Hunter, James: Before the Shooting Begins: Searching for Democracy in America's Culture War, NY, Basic Books, 1990; Neoclus, Mark: 'From Civil Society to the Social", British Journal of Sociology, 1995, Vol. 46, No. 3, PP. 394-408.
95. Civil Society: Democratic Perpeclives, eds. Robert Fine and Shirin Rai, Portland, OR, F. Cass, 1997.
96. Hahermas, Jurgen: Between Facts and Norms: Contributions to a Discourse Theory of Law and

Democracy, trans. T.Burger, Cambridge, MA, MIT Press, 1996.
97. Chandhoke. N.: State and Civil Society: Explorations in Political Theory, Thousand Oaks. Sage Publications, CA, 1995.
98. Lipset, Seymour Martin:American Exceptionalism: A Double-Edged Sword, NY, W.W. Norton and Company, 1996.
99. Putnam, Robert: Bowling Alone: Aincricas Declining Social Capital", Current, 1995, Vol. 373, PP. 3-9.
100. Howard, J.A. : "American Society Has Lost Its Sense of Direction", Vital Speeches of the Day, December 1, 1992, Vol. 59, No. 4, PP. 105-109.
101. Clark, Charles C.: "The New Volunteerism", Civil Organizations Researcher, December 13, 1996, Vol. 6, No. 46, PP. 1083-1099.
102. Lipset, Seymour Martin: American Exceptionalism: A Double-Edged Sword, NY, W.W. Norton and Company, 1996.
103. Janoski, Thomas William: Citizenship and Civil Society: A Framework of Rights and Obligations in Liberal, Traditional, and Social Democratic Regimes, Cambridge: Cambridge University Press, 1998.
104. Lerner, Max J.: America as a Civilization: Life and Thought in the United States Today, NY, Simon & Schuster, 1957.
105. Burke, Edmund: Reflections on the Revolution in Frace, NY, Holt, Rinehart, and Winston, 1965.
106. Culture in crisis and Renewal of civil Life, eds. T. William Boxx and Gary M. Quinlivan, Lanham, Rowman and Littlefield Publishers, 1996; Lerner. Max: America as a Civilization: Life and Thought in

the United States Today, NY, Simon and Schuster, 1957.

107. Karlson, N.: State of State: An Inquiry Concerning the Role of Invisible Hands in Politics and Civil Society, Stockholm, Almquist & Wiksell, 1993.

108. eds.: Nations in Transit 1997: Civil Society, Democracy, and Markets in East Central and the Newly Independent States, eds. Adraian Karatanycky, Alexander Motyl and Boris Star, New Brunswick, NJ, Transition, 1997; Ethnicity and Democratization in the New Europe, ed. Karl cordell, London, Routledge, 1999.

109. Citizenship and Democratic Control in Contemporary Europe, eds. Barbara Einhorn, Mary Kaldor, and Zdenek Kavan, Sussex European Institute, University of Sussex, Edgar Elgar Publishing Co., 1996.

110. Ramet, Sabrina: Eastern Europe and the Natural Law Tradition, The Donald W. Treadgold Paper, The Henry Jackson School of International Studies, The University of Washington, 2000; Ramet, Sabrina: Whose Democracy? Nationalism, Religion, and the Doctrine of Collective Rights in Post-1989 Eastern Europe, New York, Rowman and Littlefield Publishers, Inc., 1997.

111. Janoski, Thomas: citizenship and civil Society: A Framework of Rights and Obligations in Liberal, Traditional, and Social Democratic Regimes, Cambridge, Cambridge University Press, 1998; The Developments of Civil Society in communist Systems, ed. Rodert F. Miller, North Sydney, Australia, Allen and Unwin, 1992.

112.Ivantcheva, Assia: "Democratizing the Post-Socialist Media: A Comparative Study of Television Broadcasting Policy in Bulgaria and the Czech Republic - 1989-1999", Ph.D Dissertation, School of International Service, American University, Washington, D.C., 2001.

113. Timothy, Ash: The Yaer of Truth: The Revolution of 1989, ed. By Vladimir Tismaneanu, London, Routledge, 1999, PP. 108-125; Havel, Vaclav: The Power of the Powerless, ed. By John Keane, NY, M.E. Sharpe, Inc., 1985; Havel, Vaclav: The Art of the Impossible: Politics as Morality of Practice Speeches and Writing, 1990 - 1996, trans Paul Wilson et al, NY, Alfred Knoff, Inc., 1997; Agh, Attial: "From Nomen Clature to Clientura: The Emergence of New Political Elites in East Central Europ", in G.Pridham and P. Lewis, eds. Stabilizing Fragile Democracies in Southern and Eastern Europe, London, Routledge, 1996.

114. Margalit, A.: Idea of Civil Society, NY, Free Press, 1995; Roepke, W.: The Moral Foundations of Civil Socitety, New Brunswick, Trunawick, Transaction Publishers, 1996.

115. Laski, Harold J.: The American Democracy: A Commentary and an Interpretation, NY, Viking Press, 1948.

116. Habermas, Jurgen: The Tran.sformation of the Public Sphere; An Inquity in to a Category of Bourgeois Society, trans. T. Burger, Cambridge, MA, MIT Press, 1989; Neocleous, M.: Administering Civil Socity: Toward a Theory of State Power, New York, St. Marlin's Press, 1996; Citizens: Strengthening

Civil Society, eds. Miguel Darcy de Olivers and Rajesh Tandon. Washington, D.C. CIVCUS, 1994; Civil Society and Social Recontruction, ed. George F. Mc Lean, Washington. D.C., Council for Research on Values and Resposihility, 1997; Mizstal. B.A.: Trust in Modem Societies: The Search for the Bases of Social Order, Cembridge UK, Polity Press, 1996; Lippman. Walter: An Inquiry in to the Principles of Good Society, Boston, Littie Browm and Co, 1937; Deegan, Heather: The Middle East and Problems of Democracy, Colorado, Lynne Rienner Publishers, 1993, Economic and Political Liberalization in the Middle East, eds. Tim Niblock and Emma Murphy, London. British Academic Press, 1993; Civil Society in the Middli East, ed. Augustus Richard Norton, New York, E.J. Brill, 1995, Vol. 1; Islamisin and Secularism in North Africa, ed. John Reudy, NY, St. Martins Press. 1994; Toward Civil Society in the Middel East? A Primer ed. Jillian Schwedierm, Boulder, Colorado, Lynne Rienner Publishers, 1995; Civil Society: Challenging Western Models, eds. Chris Hann and Elizabeth Dunn. London, Routledge, 1996; Foley, Michael W. and Edwards, B.: 'The Paradox of Cicvil Society", Journal of Democracy, 1996, Vol. 7, No. 3, PP. 38-52; Lewis: Bernard, "State and Society under Islam', Wilson Quarterly, 1989, Vol. 13, No. 4, PP. 39-51; Ismael Tareq, and S.,Ismael Jacqueline "Civil Society in the Arab World: Historical traces, Contemporary vestinges", Arab Studies Quarterly, 1997, Vol. 19, No. 1, PP. 77-87; Monishpouri: M., 'Review article, Islamism, civil society, and the Democratic Conundrum', Muslim

World, 1997, Vol. 87, No. 1, PP. 54-66; Gyimah-Boadi, E.: "Civil Society in Africa", Journal of Democracy, 1996. Vol. 7, No. 2, PP. 118-132; Lucas, John: "The State, Civil Society, and Regional Elites: A Study of Three Associations in Kano, Nigeria", African Affairs, 1994, Vol. 93, PP. 21-38; Tetreault, Mary A.: "Civil Society in Kuwait: Protected Spaces and Women's Rights", Middle East Journal, 1993. Vol. 47, No. 2, PP. 275-291; Muslin. Muhammad: "Palestinian Civil Society". Middle East Journal, 1993, Vol. 47, No. 2, PP. 258-274; Hinnebusch, Raymond A.: "State and Civil Society in Syria", Middle East journal, 1993, Vol. 47, No. 2, PP. 243-257; Al-Sayyid, Mustapha K.: "A Civil Society in Egypt?', Middle East Journal, 1993, Vol. 47, No. 2, PP. 228-242; Norton, Augustus R.: "The Future of Civil Society in the Middle East", Middle East Journal, 1993, Vol. 47, No. 2, PP. 205-216; Bernhard, Michael: "Civil Society and Democratic Transition in East Central Europe", Political Science Quarterly 1993, Vol. 108, No. 2, Pp. 307-326.

117. Minkoff, Debra C.: 'Producing Social Capital: National Social Movements and Civil Society", American Behavioral Scientist, 1997, Vol. 40, No. 5, PP. 606-619; Berman, Sheri: "Civil Society and Political Institutionalization", American Behavioral Scientist, 1997, Vol. 40, No. 5, PP. 562-574; Staff: "Why Civil Society", Social Policy, 1996, Vol. 26, No. 4, PP. 2-7; Nelson, Daniel N.: "Civil Society Endangered", Social Research, 1996, Vol. 63, No. 2, PP. 345-368; Miller, S.M.: "Building a Progressive Civil Society", Social Policy, 1996, Vol. 27, No. 1, PP. 22-31; Colas,

D: "Civil Society: From Utopia to Management, from Marxism to Anti-Marxism", South Atlantic Quarterly, 1995, Vol. 94, No. 4, PP. 1009-1023.

118. O 'Connell, Brian: "A Major Transformation of Government Responsibility to Voluntary Organization? Proceed with Caution", Public Administration Review, 1996, Vol. 56, No. 3, PP. 222-225; Clark, John: "The State, Popular Participation, and The Voluntary Sector", World Development, 1995, Vol. 23, No. 4, PP. 593-601; Salmon, Lester M.: "The Rise of the Nonprofit Sector", Foreign Affairs, 1996, Vol. 73, No. 4. PP. 109-122; Baker, Gideon: "The Changing Idea of Civil Society: Models from the Polish Democratic Opposition", Journal of Political Ideologies, Vol. 3, No. 2, June 1998, PP. 125-145; Hall, John A.: "The Nature of Civil Society", Society, Vol. 35, No. 4, May/June 1998, PP. 32-41; Edward, Boh and Foley, Michael W.: "Civil Society and Social Capital Beyond Putnam", The American Behavioral Scientist, Vol. 42, No. 1, September, 1998, PP. 124-139; Bradley, Bill: "America s Challenge: Revitalizing "Our National Community", National Civic Reviw, 1995, Vol. 84, No. 2, PP. 94-100; Salmon, Lester M.: "The Crisis of the Nonprofit Sector and the Challenge of Renewal", National Civic Review, 1996, Vol. 85, No. 4, PP. 3-16; Agh, Attila: "From Nomen Clature to Clientura: The Emergence of New Political Elites in East Central Europe", in Stabilizing Fragile Democracies in Southern and Eastern Europe, eds. Pridham and P. Lewis, London, Routledge, 1996; Schambra, W.A.: "By the People, The Old Values of

New Citizenship", National civic Review, 1995, Vol. 84, No. 2, PP. 101-113.

ہماری مطبوعات

تحریک ترجمہ کے احیاء ، اسلامی مفاہیم و نظریات کے تعارف اور اسلامی تعلیمات کے مختلف گوشوں سے عالمی معاشرے کو آگاہ کرنے اور اسلامی فکر و ثقافت ریسرچ یونیورسٹی کے آٹھ سو سے زائد علمی آثار کا دنیا کی گیارہ زندہ زبانوں میں ترجمہ کرنے کے ذریعہ ہیومنزم اور اس کے دامن میں پرورش پانے والے اکانومک اینڈ کلچرل لبرلزم اور پولیٹیکل سیکولرزم جیسے مکاتب فکر کی جانب سے اٹھائے جانے والے اعتراضات کے جوابات دینے کے لیے ۲۰۰۸ء میں "بین الاقوامی ادارہ برائے ترجمہ و طباعت" کا قیام عمل میں آیا۔

اس سلسلہ میں ملکی سطح پر انگریزی، عربی ، فرنچ ، جرمن، ملائشیائی، اردو، تاجک، آذری، روسی، ترکی اور ہسپانوی زبانوں کی مختلف علمی انجمنیں تشکیل دی گئیں۔ہر انجمن سربراہ ، علمی ایڈیٹر ، ادبی ایڈیٹر ، مترجم اور ثقافتی ماہر پر مشتمل ہے۔ مذکورہ علمی انجمنیں علاقائی اور ثقافتی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ترجمہ، تصحیح اور اشاعت کے فرائض انجام دیتی ہیں۔

قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ادارے کی مندرجہ ذیل کتب ترجمہ ہو چکی ہیں اور عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا چاہتی ہیں:

اسلامی فکر و ثقافت ریسرچ یونیورسٹی کا بین الاقوامی ادارہ برائے ترجمہ و طباعت کے انچارج

ڈاکٹر نادری فارسانی

ردیف	۲۰۱۰ء میں زیر طبع مطبوعات	مؤلف	مترجم
۱۔	قرآن اور نفسیاتی دباؤ	سید اسحاق حسین کوہساری	غلام جابر محمدی
۲۔	قرآن و پلورلزم	محمد حسن قدردان ملکی	سید سجاد حسین کاظمی
۳۔	اخلاق الٰہی جلد ۴	مجتبیٰ تہرانی	ادریس احمد علوی
۴۔	فقہ و عقل	ابوالقاسم علی دوست	ذاکر حسین طاہری
۵۔	اسلامی معیشت میں بچت اور سرمایہ کاری	سید عباس موسویان	سید سجاد حسین کاظمی
۶۔	شناخت معجزہ	محمد باقر سعیدی روشن	ادریس احمد علوی
۷۔	فقہ و عرف	ابوالقاسم علی دوست	سید سجاد حسین کاظمی
۸۔	حجاب	مہدی مہرتری	شیخ عبدالستار
۹۔	مترقی سماج، دینی سماج	احمد واعظی	عون علی جاڑوی
۱۰۔	قرآن و سیکولرزم	محمد حسن قدردان ملکی	سید سجاد حسین کاظمی